حدیث
کے
اصلاحی مضامین

جلد نہم

افادات

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

شیخ الحدیث وصدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل

ناشر

مکتبۂ محمودیہ، محمودنگر، ڈابھیل

تفصیلات

کتاب کا نام:.................... حدیث کے اصلاحی مضامین (جلد نہم)

افادات:.................... حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

بہ اہتمام:....................خدّام حضرت اقدس دامت برکاتہم

صفحات:....................................۴۹۶

ناشر:.................... مکتبۂ محمودیہ، محمودنگر، ڈابھیل، گجرات

ملنے کے پتے

- شعبۂ فیض محمود، سورت 99988,31838
- ادارۃ الصدیق ڈابھیل، 9913319190
- مفتی سلیمان شاہوی (دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر) 88666,21229
- مکتبۂ انور (مفتی عبدالقیوم راجکوٹی) جامعہ ڈابھیل 99246,93470
- کتب خانہ نعیمیہ دیوبند 97562,02118
- مکتبۃ الاتحاد دیوبند 9897296985
- حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب مدظلہ (دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کشمیر)
- مدینہ ایجنسی جھانپا بازار سورت
- قاضی، نزد مرکز مسجد رانی تالاب سورت
- اسلامی کتب خانہ چوک بازار سورت

اجمالی فہرست مضامین ...... جلد نہم

تفصیلی فہرست مضامین ...... جلد نہم

الوالی العادل

انصاف سے پیش آنے والا حکمران

وُجوبُ طَاعَةِ وُلَاةِ الْأُمُوْرِ فِيْ غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيْمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ

حاکموں کی اطاعت کے احکام (۱)

وُجوبُ طَاعَةِ وُلَاةِ الأُمُورِ فِيْ غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيْمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ

حاکموں کی اطاعت کے احکام (۲)

وُجوبُ طَاعَةِ وُلَاةِ الْأُمُوْرِ فِيْ غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيْمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ

حاکموں کی اطاعت کے احکام (۳)

اَلنَّهْيُ عَنْ سُؤَالِ الْإِمَارَةِ وَإِخْتِيَارُ تَرْكِ الْوِلَايَاتِ إِذَا لَمْ يَتَعَيَّنْ عَلَيْهِ

عہدہ طلب کرنے کی ممانعت اور اختیاری صورت میں عہدہ قبول نہ کرنا

حَثُّ السُّلْطَانِ وَالْقَاضِيْ وَغَيْرِهِمَا مِنْ وُلَاةِ الْأُمُوْرِ عَلىٰ إِتِّخَاذِ وَزِيْرٍ صَالِحٍ وَتَحْذِيْرِهِمْ مِنْ قُرَنَاءِ السُّوْءِ

بادشاہ اور قاضی وغیرہ حکمرانوں کو اپنے لئے صالح مشیر رکھنے کی ترغیب اور برے ساتھیوں سے بچنے کی تاکید

النهي عن تولية الامارة والقضاء وغيرهما من الولايات لمن سألها أو حرص عليها فعرّض بها

امارت وقضاء وغیرہ عہدے، ان کا مطالبہ کرنے والوں یا لالچ رکھنے والوں کو دینے کی ممانعت

كتاب الادب

باب الحياء وفضله والحث علىٰ التخلق به

شرم کا بیان اور اس کی فضیلت اور شرم اختیار کرنے کی ترغیب

باب حفظ السر

کسی کے بھید کی حفاظت کرنا، راز داری سے کام لینا

الوفاء بالعهد وإنجاز الوعد

عہد و پیمان اور وعدہ پورا کرنا

الامر فی المحافظة علیٰ ما اعتاده من الخير نیک کاموں کی عادت کو باقی رکھنا

استحباب طيب الكلام وطلاقة الوجه عند اللقاء

خوش کلامی اور ملاقات کے وقت چہرے کو مسکراتا ہوا رکھنے کا پسندیدہ ہونا

استحباب بیان الکلام وإیضاحہ للمخاطب وتکریرہ لیفهم إذا لم یفهم إلا بذلك

بات کو مخاطب کے سامنے صاف اور واضح انداز میں کرنا اور اگر بغیر تکرار کے نہ سمجھتا ہو، تو مکرر کرنا

باب إصغاء الجلیس لحدیث جلیسہ الذی لیس بحرام وإستنصات العالم والواعظ حاضری مجلسہ

اپنے ہم نشین کی بات کی طرف دھیان دینا اور عالم وواعظ کا حاضرین کو اپنی بات سنانے کے لئے خاموش کرنا

باب الوعظ والاقتصاد فیه

وعظ ونصیحت میں میانہ روی

باب الوقار والسکینة

سنجیدگی اور اطمینان کی عادت

الندب الیٰ اتیان الصلاة والعلم ونحوهما من العبادات بالسکینة والوقار

نماز اور علمی مجالس میں سکون ووقار سے آنا

باب إكرام الضيف

مہمان کا اعزاز واکرام کرنا

إستحباب التبشير والتهنئة بالخير

کسی کو مبارک باد دینے کا پسندیدہ ہونا

باب وداع الصاحب ووصیته عند فراقه للسفر وغیره والدعاء لهٗ وطلب الدعاء مِنْهُ

اپنے کسی ساتھی اور دوست کو رخصت کرتے وقت نصیحت کرنا اس کے لیے دعا کرنا اور اس سے دعا کی درخواست کرنا

الاستِخارۃ والمشاورۃ

استخارہ اور مشورہ کرنا

استحباب الذهاب الی العید الخ

عید کی نماز کے لیے مختلف راستوں سے آنا جانا

استحباب تقديم اليمين في كل ما هو من باب التكريم

ہر اچھے کام میں دائیں طرف سے شروع کرنا مستحب ہے

کتاب آداب الطعام

کھانے کے آداب

باب التسمیة فی أوله والحمد فی آخره

کھانے سے پہلے بسم اللہ اور کھانے کے بعد الحمد للہ پڑھنا

باب لا یعیب الطعام واستحباب مدحه

کھانے میں عیب نہ نکالے اور اس کی خوبی بیان کرنے کا پسندیدہ ہونا

باب مَا يقوله من حضر الطعام وهو صائم إِذَا لَمْ يفطر

وباب مَا يقوله من دُعِيَ إِلَى طَعَامٍ فَتَبِعَهُ غيره

کسی کو کھانے کی دعوت دی گئی، اور کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ ہو گیا، تو وہ کیا کہے؟

دعوت میں حاضر ہونے والا اگر روزہ دار ہے تو کیا کہے؟

باب الأكل مِمَّا يليه ووعظه وتأديبه من يسيء أكله

اپنے سامنے سے کھانا اور خلافِ ادب کھانے والے کو نصیحت کرنا اور ادب سکھانا

النّهي عن القِرَانِ بين تمرتين ونحوهما إذا أكل جماعة إلاّ بإذن رفقته

مجمع کے ساتھ کھاتے وقت کھجور وغیرہ دو، دو نہ لے

باب مَا يقوله ويفعله من يأكل وَلاَ يشبع

کھانے سے سیری نہیں ہوتی، کیا کرے؟

الأمر بالأكل من جانب القصعة والنهي عن الأكل من وسطها

برتن کے ایک طرف سے کھانے کا حکم

كراهية الأكل متكئاً

ٹیک لگا کر کھانے کا ناپسندیدہ ہونا

باب استحباب الأكل بثلاث أصابع واستحباب لعق الأصابع، وكراهة مسحها قبل لعقها واستحباب لعق القصعة وأخذ اللقمة الّتي تسقط منه وأكلها وجواز المسح بعد اللعق بالساعد والقدم وغيرها

تکثیر الأیدی علَی الطعام

باب أدب الشرب

پینے کے آداب

واستحباب التنفس ثلاثاً خارج الإناء وكراهة التَّنَفُّس فى الإناء

واستحباب إدارة الإناء عَلَى الأيمن فالأيمن بعد المبتدء

كراهة الشرب من فم القربة ونحوها وبيان أنه كراهة تنزيه لا تحريم

باب كراهة النفخ فى الشرب

باب بيان جواز الشرب قائماً وبيان أنَّ الأكمل والأفضل الشرب قاعداً

استحباب کون ساقی القوم آخرھم شرباً

باب جواز الشرب من جمیع الأوانی الطاھرۃ غیر الذھب والفضۃ وجواز الکرع -وَھُوَ الشرب بالفم من النھر وغیرہ بغیر إناء ولا ید- وتحریم استعمال إناء الذھب والفضۃ فی الشرب والأکل والطھارۃ وسائر وجوہ الاستعمال

تقریظ

مولانا نور عالم صاحب خلیل امینی دامت برکاتہم

(استاذ ادب عربی دارالعلوم دیوبند ورئیس تحریر رسالہ ''الداعی'')

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری گجراتی قاسمی زید مجدہ- دست گرفتہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء۔ ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء) وخلیفہ ومجاز حضرت مفتیٔ اعظم مفتی محمود حسن گنگوہیؒ (۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء۔ ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء) وشیخ الحدیث وصدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل ورکنِ مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند- کے افادات کا مجموعہ ''حدیث کے اصلاحی مضامین''جس کا نام پہلے ''حدیث کے اسباق'' تھا، کی آٹھ جلدوں- جو اب تک چھپ چکی ہیں- کے جستہ جستہ مطالعے کا موقع ملا۔

مفتی صاحب مدظلہ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ مطابق ستمبر ۱۹۹۶ء سے سورت شہر کی ''مسجد ابرار'' اور مجمع کی کثرت کے بعد ''مسجد انوار'' میں شنبہ ویک شنبہ کی درمیانی شب میں بعد نماز عشا امام نوویؒ (یحییٰ بن شرف نووی دمشقی ۶۳۱ھ/ ۱۲۳۴ء۔ ۶۷۶ھ/ ۱۲۷۷ء) کی مشہور ومقبول تالیف ''ریاض الصالحین''- جو حدیث پاک کا بہترین مجموعہ وانتخاب ہے- کا درس پابندی سے دیتے رہے ہیں۔ اُنھی درسوں سے، سی ڈی سے نقل کرکے بہترین کاغذ پر خوب صورت طباعت کے ذریعے عام قارئین کے لیے استفادے کو آسان کردیا گیا ہے۔ جمع کنندوں نے بھی اپنے بہترین ذوق اور نفاستِ طبع کا ثبوت دیا ہے؛ اس لیے یہ کتاب اپنی ممتاز طباعت میں سیکڑوں دینی کتابوں سے ممتاز ہے؛ اِس لیے راقم کا اندازہ ہے کہ ہر باذوق قاری اس کو حاصل کرنے اور پڑھنے کے لیے ضرور لپکتا ہوگا۔

مفتی صاحب زادہ اللہ توفیقاً صحیح معنیٰ میں عالم باعمل ہیں؛ اِس لیے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اُن کے علم واتقان میں برکت دی ہے؛ بلکہ اُنھیں بڑی مقبولیت ومحبوبیت عطا فرمائی ہے، علما وعوام دونوں میں انھیں بڑا وقار واعتبار حاصل ہے، اللہ نے درس وتدریس اور وعظ ونصیحت میں بھی ان کی زبان کو بڑا امتیاز عطا کیا ہے، ساتھ ہی ذہن بھی زرخیز ہے؛ اس لیے ان کے دروس ومواعظ بھی بہت مقبول ہیں۔ وہ طلبہ اور عوام دونوں کے لیے آسان اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں، اور زندگی کے مسائل کو چھوتے ہوئے تازہ دلائل وامثال سے اپنی بات کو واضح اور سہل بنادیتے ہیں۔ امام نوویؒ صاحبِ قلب ونظر عالم تھے، وہ مادرزاد ولی تھے، انھوں نے لوگوں کے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سانچے میں ڈھلنے کو آسان بنانے کے لیے حدیث کا یہ مجموعہ تیار کیا تھا، جو اُن کے اخلاص وللّٰہیت کی وجہ سے خوب خوب مقبول ہوا، اور عربی کے علاوہ بہت سی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے اور شرحیں لکھی گئیں؛ لیکن مفتی صاحب مدظلہ کی عمومی مجلسِ درس کے ذریعے جو آسان مفصّل ومکمل شرح تیار ہوگئی ہے، وہ ''ریاض الصالحین'' کی شرحوں میں بے مثال اور لاجواب ہے، جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو چھپی ہوئی شکل میں پڑھنا شروع کیجیے تو چھوڑنے کو آپ کا جی نہ چاہے گا، جس کی وجہ جہاں زبان کی چاشنی، اُس کی سلاست وسہولت اور غذائے دل کے سامان کی بے پناہی ہے، وہیں وہ خلوص ہے جس سے اللہ نے مفتی صاحب کے دل کو مالا مال کیا ہے۔ خلوص کے بغیر کسی شے میں محبوبیت کا رنگ پیدا نہیں ہوتا، خشت وسنگ میں بھی اگر خونِ جگر اور سوزِ دروں شامل ہوجائے تو چمک اٹھتے ہیں، اِس کے بغیر ہر انسانی عمل بے رنگ وبے نور رہتا ہے:

رنگ ہو یا خشت وسنگ، چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے، خونِ جگر سے نمود

(علامہ اقبالؒ)

اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب میں کسی چیز کے پایدار اور کسی نقشِ عمل کے لازوال ہونے کے لیے یہ معیار بتایا ہے کہ وہ خلق خدا کے لیے نافع ہو، ﴿وأما ماينفع الناس فيمكث في الأرض﴾ [الرعد:۱۷]؛ لہٰذا جو چیز جتنی مفید ہوگی اُتنی ہی پایدار و جاوید ہوگی، چوں کہ یہ اصلاحی مضامین و اسباق بہت مفید ہیں؛ اِس لیے اپنے اندر خود ہی مقبولیت کی طاقت رکھتے ہیں۔ کسی چیز کی اُس اندرونی طاقت کے بعد کسی سفارش، تعریف اور التفات طلبی کے عمل کی کوئی ضرورت نہیں رہتی، اور کسی چیز میں اگر یہ اندرونی جوہر نہ ہو تو پھر ثنا خوانی، ترغیب وتشویق اور اہمیت بیانی کا کوئی عمل کارگر نہیں ہوتا۔ اپنی بے پناہ اندرونی طاقت اور مقناطیسی محاسن کی وجہ سے یقین ہے، کہ مواعظ حسنہ پر مشتمل یہ مضامین جتنے مقبول ہوئے ہیں، آیندہ اس سے بھی بہت زیادہ مقبول ومحبوب ہوں گے، اور نہ صرف مفتی صاحب مدظلہ کا دامنِ عمل بے حد وحساب اجر وثواب سے مالا مال ہوگا؛ بلکہ وہ سارے محبین و متعلقین بھی اجر وثواب کا بھرپور حصہ پائیں گے جنھوں نے اِس کی تیاری واشاعت میں کسی طرح بھی حصہ لیا ہے۔

نور عالم خلیل امینی

رئیس تحریر رسالہ ''الداعی''

واستاذ ادب عربی دارالعلوم دیوبند

۱۱½ بجے دن: شنبہ ۲۸/ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ

۵/اکتوبر ۲۰۱۳ء

تقریظ

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری دامت برکاتہم

(شارح بخاری واستاذ حدیث دارالعلوم دیوبند)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ أجمعین

أما بعد! عزیز محترم مولانا محمد علی صاحب بجنوری زید مجدہم مدرس دارالعلوم دیوبند نے ''حدیث کے اصلاحی مضامین'' کی مطبوعہ آٹھ جلدیں پیش کیں، اور فرمایا کہ: یہ جلدیں مخدوم محترم حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم نے ہدیۃً ارسال کی ہیں، اور اِن پر اظہارِ رائے کی خواہش ظاہر کی ہے۔

حکم کی تعمیل میں عرض ہے کہ: یہ جلدیں دراصل علامہ نووی (المتوفیٰ ۶۷۶ھ) کی ''ریاض الصالحین'' کے ابواب کے مطابق نہایت مؤثر اور دل پذیر خطابات ہیں، جنھیں حضرت مفتی صاحب زید مجدہم کے متوسلین نے ٹیپ ریکارڈ سے نقل کر کے افادۂ عام کے لیے طبع کرادیا ہے، اور جن سے علما، طلبہ اور تمام باذوق مسلمان استفادہ کررہے ہیں۔ فجزاھم اللہ خیر الجزاء

علامہ نوویؒ نے ''ریاض الصالحین'' کے مقدمے میں تحریر کیا ہے کہ: انسان کا مقصدِ تخلیق عبادت ہے: وما خلقت الجن والإنس إلا لیعبدون اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ، دنیا میں ہر انسان کا قیام عارضی ہے، دائمی نہیں؛ اس لیے کامیاب وہ لوگ ہیں جو اس ناپایدار زندگی کو مقصدِ زندگی کی تکمیل میں صَرف کرتے ہیں، اور جو لوگ اِس مقصد سے غافل ہیں وہ یقیناً ناکام ہیں۔ پھر امام نوویؒ نے امام شافعیؒ کے تین اشعار ذکر کیے ہیں:

إن للہ عبــــادا فطنـــــا		طلقوا الدنیا وخـافوا الفتنـا
نظـروا فیهـا فلمـا علمـوا		إنهـا لیسـت لحـي وطنـا
جعلوهـا لجـة واتخـذوا		صالح الأعمال فیهـا سـفنا

کہ بے شک اللہ کے دانش مند بندے وہ ہیں جنھوں نے دنیا کو ترک کردیا اور فتنوں سے ڈرتے رہے، انھوں نے دنیا کو غور سے دیکھا، اور جب انھیں یہ یقین حاصل ہوگیا کہ یہ دنیا کسی صاحبِ حیات کا وطن بننے کے لائق نہیں ہے، تو انھوں نے دنیا کو ایک گہرا سمندر سمجھا اور اس کے لیے اعمالِ صالحہ کو سفینہ بنالیا۔ پھر علامہ نوویؒ نے لکھا کہ: مَیں اس کتاب میں مقصدِ زندگی یعنی عرفان وعبادت کو اپنا نصب العین بنانے والوں کے لیے اعمالِ صالحہ کے وہ کلیدی مضامین بیان کرنا چاہتا ہوں کہ، اُن لوگوں کو کیا کام کرنے ہیں اور کن چیزوں سے دامن بچانا ہے؟ پھر انھوں نے اپنی کتاب کو تقریباً تین سوستر سے زائد ابواب پر تقسیم کیا ہے، اور ہر باب کے آغاز میں قرآن کریم کی آیات اور معتبر احادیث درج کیں، چناں چہ یہ کتاب عہدِ تدوین سے آج تک مقصدزندگی کو سامنے رکھنے والوں کی رہنمائی کرتی رہی ہے۔

ماضی قریب میں مخدوم ومحترم حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم نے اپنے اکابر کی ہدایت کے مطابق اصلاحی خطبات کا آغاز کیا، تو ''ریاض الصالحین'' کو سامنے رکھا، اور اب یہ خطبات- جو ''ریاض الصالحین'' کی نہایت مبسوط اور معتبر شرح ہیں- چارسو سے زائد ایسے اصلاحی مضامین پر مشتمل ہیں، جو مقصدزندگی کو نصب العین بنانے والوں کے لیے بہترین رہنمائی کا کام کریں گے۔ حضرت مفتی صاحب دام مجدہم دارالعلوم کے نامور فضلاء میں سے ہیں، حضرات اکابر کے تربیت یافتہ ہیں؛ اس لیے ان خطبات میں اہلِ دیوبند کے فکر ونظر کی ترجمانی اور زہد وقناعت کی تلقین کے ساتھ دعوت وارشاد اور علم وعمل کی روح جلوہ گر ہے۔

راقم الحروف دعا گو ہے کہ: اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ان کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرمائے، اور ہم تمام مسلمانوں کے درمیان اسے حسنِ قبول کی دولت سے نوازے۔ آمین

والحمدلله أولا وآخرا

ریاست علی بجنوری غفرلہ

خادم تدریس دارالعلوم دیوبند

۲۳ محرم ۱۴۳۵ھ

اداریہ

الحمدللہ پھر ایک مرتبہ آپ حضرات کی خدمت میں ''**حدیث کے اصلاحی مضامین جلد:۹**'' کا گلدستہ لے کر حاضر ہیں۔ وہی روحانی نورانی مضامین جو نبوت کی مبارک زبان کے شایانِ شان ہیں۔

عہدہ، حکومت اور اقتدار کو آج ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں، جھوٹے وعدے، خیانت، غبن، الزام تراشی وغیرہ ہر گناہ انگیز کر لیا جاتا ہے، پھر جب کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو اس کا جو ناجائز استعمال کیا جاتا ہے وہ نہ محتاجِ بیان ہے اور نہ قابلِ بیان۔ جمہوری ملکوں میں اقتدار کے 'misuse' کی اگر تاریخ رقم کی جائے تو دفتروں کے انبار لگ جائیں۔ آج ان ممالک میں بسنے والا ہر شخص پریشان ہے کیوں کہ تختِ حکومت پر انسانیت کا خون چوسنے والے درندے اڈہ جمائے ہوئے ہیں یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اس سلسلہ کی خالق انسانیت کی طرف سے دی گئی تعلیمات سے واقفیت نہیں، یا پھر اللہ تعالیٰ کا ڈر نہیں۔ اگر اس سلسلہ کی تعلیمات کو پڑھا جائے تو معلوم ہو کہ یہ حکومت و عہدہ مانگنے کی نہیں، بھاگنے کی چیز ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے متعلق ایسا نایاب انتخاب پیش فرمایا ہے کہ قابلِ داد ہے، عنوان ہے: ☑ ''اصحابِ اقتدار کو نرمی کا حکم'':

ہمارے زمانہ میں اربابِ اقتدار تو درکنار؛ اُن کے ادنیٰ در ادنیٰ ماتحتوں میں سے اگر کوئی ہمارے ساتھ نرم کلامی کر لے، دل جوئی کا معاملہ کر لے؛ تو ہمیں حیرت ہوتی ہے، گویا اس نے کوئی انہونی کر لی ہو۔ ترش روئی و بدکلامی کو ایک حصۂ فرض سمجھا جاتا ہے۔ خیانت، بدعہدی اور رشوت کا بازار الگ گرم ہے؛ جس سے ہر شہری پریشان

ہے۔واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیوی زندگی کے مختلف الانواع شعبوں کے لیے جتنی ہدایات دی گئی ہیں ان کی مخالفت اور پریشانی لازم ملزوم ہے۔

اسلام عالم گیر مذہب ہے، پوری انسانیت کے لیے ہے، خود اسلامی تعلیمات پر صد فیصد عمل کر کے دارین کی فلاح و بہبود حاصل کرنا ہماری سعادت ہے، پھر اس کا تعارف اپنوں اور دوسروں سے کرانا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔پوری انسانیت کے ہر دکھ درد کا واحد علاج اسلام اور اسلامی تعلیمات میں ہے۔

جامعیت کی بات تو یہ ہے کہ ایک طرف حکام وسلاطین کو اگر رعایا سے حسنِ سلوک اور ہمدردی کا درس دیا، تو دوسری جانب رعایا کے گلے میں ''اطاعتِ حکام'' کا ایسا زبردست طوق ڈالا کہ انتشار وخلفشار اور انارکی انسانی معاشرہ کے قریب بھی نہ پھٹک سکے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عنوان کے ماتحت مندرجہ ذیل ضمنی عناوین قائم کئے ہیں:

☑ انصاف سے پیش آنے والا حکمران:

☑ حاکموں کی اطاعت کے احکام:

☑ عہدہ طلب کرنے کی ممانعت:

☑ بادشاہ اور قاضی وغیرہ حکمرانوں کو اپنے لئے صالح مشیر رکھنے کی ترغیب اور برے ساتھیوں سے بچنے کی تاکید:

☑ امارت وقضاء وغیرہ عہدے مطالبہ کرنے والوں کو دینے کی ممانعت

اس سے فراغت کے بعد صاحبِ کتاب نے آداب کا وہ سلسلہ شروع فرمایا جن کے اختیار کرنے سے انسان حقیقی انسان بنتا ہے اور چھوڑنے سے سرحدِ انسانیت سے نکل جاتا ہے، مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف عناوین قائم فرما کر آیات وروایات کا حسین گلدستہ حسبِ عادتِ شریفہ پیش فرمایا ہے۔

☑ شرم وحیاء کیا ہے؟ اوراس کی فضیلت۔اس کا اسلام میں کیا مقام ہے؟

☑ رازداری کی اہمیت، کسی کے بھید کی حفاظت کرنا:

☑ عہد و پیمان اور وعدہ پورا کرنا:

☑ نیک کاموں کی عادت کو باقی رکھنا:

☑ بوقتِ ملاقات خوش کلامی وبشاشت:

☑ بات چیت واضح اور صاف ستھری کرے۔اگر ایک بار سے مخاطب نہ سمجھے تو دو تین بار دہرائے:

☑ اپنے ہم نشین کی بات کی طرف دھیان دینا:

اسی طرح آدمی کے اندر وقار یعنی سنجیدگی اور طبیعت کے اندر جماؤ اور ٹھیراؤ ہونا چاہیے، یہ زندگی کا ایک اہم حصہ ہے جس کی وجہ سے آدمی کا سماج وسوسائٹی میں اثر و رسوخ قائم ہوتا ہے، اس سے متعلق معتدل تعلیم شریعتِ مطہرہ کے اندر موجود ہے جس کا مواد اس عنوان کے ماتحت قاری کو یکجا مل جائے گا۔

☑ سنجیدگی اور اطمینان کی عادت: ☑ نماز اور علمی مجالس میں سکون ووقار سے آنا:

☑ مہمان کا اعزاز واکرام کرنا:

☑ کسی کو اس کی خوشی کے وقت مبارک بادی دینا

☑ اپنے کسی ساتھی اور دوست کو رخصت کرتے وقت نصیحت کرنا، اس کے لیے دعا کرنا اور اس سے دعا کی درخواست کرنا:

☑ استخارہ کرنا اور مشورہ کرنا:

یہ عنوان انتہائی توجہ سے پڑھنے کا ہے۔ایسی نایاب باتیں اس عنوان کے تحت آئی ہیں جو کہیں اور بہت مشکل سے ملے گی، حضرت دامت برکاتہم نے بہت وضاحت

سے سمجھایا ہے کہ استخارہ کا حکم کس پس منظر اور ماحول میں نازل ہوا، عربوں نے اپنی طرف سے کسی اہم معاملہ میں اپنا تذبذب دور کرنے کے لیے کیا طریقے گھڑ رکھے تھے، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ استخارہ ایک سرسری عمل ہے، لیکن حضرت کے مضمون کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتنا گہرا اور نایاب عمل ہے جو اللہ رب العزت کی طرف سے بندوں کو دیا گیا ہے، اسی ضمن میں دعائے استخارہ کا نہ صرف ترجمہ؛ بلکہ دل نشین تشریح بھی پڑھنے کی چیز ہے۔

☑ عید کی نماز کے لیے مختلف راستوں سے آنا جانا:

☑ ہر اچھے کام میں دائیں طرف سے شروع کرنا مستحب ہے:

پھر ان سب کے ضمن میں دیگر علمی فوائد، ارشاداتِ اکابر مختلف مثالوں کے ذریعہ مضمون کی تشریح وغیرہ امور ہیں۔

اس کے بعد کھانے اور پینے کے آداب کا سلسلہ شروع فرمایا جو تقریباً سوا سو صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔ ضرور پڑھیے اور دوسروں کو سنائیے، اگر بیوی بچوں کو ساتھ بٹھا کر اس کی تعلیم کی جائے گی تو ان شاء اللہ زندگیوں میں سلیقہ وتمیز پیدا ہوگی، اور ایسی ایسی باتیں سامنے آئیں گی کہ ایمان میں تازگی محسوس ہوگی۔

☑ کھانے کے آداب/ کھانے سے پہلے بسم اللہ اور کھانے کے بعد الحمد للہ پڑھنا:

☑ کھانے میں عیب نہ نکالے۔ اس کی خوبی بیان کرنے کا پسندیدہ ہونا:

☑ دعوت میں حاضر ہونے والا اگر روزہ دار ہے؛ تو کیا کہے؟:

☑ کسی کو کھانے کی دعوت دی گئی، اور کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ ہوگیا، تو وہ کیا کہے؟:

☑ اپنے سامنے سے کھانا اور خلافِ ادب کھانے والے کو نصیحت کرنا:

☑ مجمع کے ساتھ کھاتے وقت کھجور وغیرہ دو، دو نہ لے:

☑ کھانے سے سیری نہیں ہوتی؛ وہ کیا کرے؟:

☑ برتن کے ایک طرف سے کھانے کا حکم:

☑ ٹیک لگا کر کھانے کا ناپسندیدہ ہونا:

☑ پینے کے آداب:

☑ مشکیزہ اور بڑے برتن سے منھ لگا کر پینے کی ممانعت اور اس کی وجہ:

☑ پینے کی چیز میں پھونک نہ مارے:

☑ کھڑے ہو کر پینے کی تفصیل:

☑ پلانے والا خود اخیر میں پیئے:

☑ کن برتنوں میں پینا جائز ہے اور کن میں نہیں:

حق تو یہ ہے کہ جوں جوں ہم یہ مضامین پڑھتے جائیں گے توں توں ہمارے سامنے دینِ اسلام کے محاسن منکشف ہوں گے، تعلیمات کی قدر ہوگی، اور عمل کریں گے تو زندگی سنورے گی، ایک ایمان والے کے لیے تعلیماتِ نبوی انمول سرمایہ ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

اس جلد کے مواد کی فراہمی میں ہمیں مفتی محمد امین صاحب راجستھانی اور مولانا محمد ایوب صاحب مالیگانوی زید مجدہما اور ان کے احباب کا تعاون حاصل رہا، ادارہ ان سب کا ممنون و مشکور ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کے علم و عمل، صلاح و تقویٰ میں برکت دے اور ان سب کو خدمات کا دارین میں بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

ابوزاہر

۱۸/ جمادیٰ الثانیہ ۱۴۳۴ھ ۳۰/ اپریل ۲۰۱۳ء

بَابُ أَمْرِ وُلَاةِ الْأُمُوْرِ بِالرِّفْقِ بِرِعَايَاهُمْ وَنَصِيْحَتِهِمْ، وَالشَّفْقَةِ عَلَيْهِمْ وَالنَّهْيِ عَنْ غَشِّهِمْ، وَالتَّشْدِيْدِ عَلَيْهِمْ وَإِهْمَالِ مَصَالِحِهِمْ وَالْغَفْلَةِ عَنْهُمْ وَعَنْ حَوَائِجِهِمْ

اصحابِ اقتدار اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرمی اختیار کریں، ان کی خیرخواہی اور ان کے ساتھ شفقت ومحبت کا معاملہ کریں، ان کو دھوکہ نہ دیں، بے جا سختی نہ کریں، ان کی مصالح سے پہلو تہی نہ کریں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أما بعد:-

اسلام نام ہی حقوق کی ادائیگی کا ہے

اللہ تعالیٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام لوگوں کے حقوق کو واضح کر کے امت کے سامنے پیش کر دیا ہے، اور اسلام کی تعلیمات کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ ان تمام حقوق کو ادا کیا جائے، گویا اسلام نام ہی حقوق کی ادائیگی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر کیا حق ہے وہ بھی بتلا دیا، اور خود بندوں کے آپس کے حقوق بتلائے کہ ماں باپ کا اولاد کے اوپر کیا حق ہے، اولاد کا ماں باپ کے اوپر کیا حق ہے۔ بیوی کا شوہر کے اوپر اور شوہر کا بیوی کے اوپر کیا حق ہے۔ بھائی کا بھائی پر، بہن کا بہن پر، بھائی بہنوں کے آپس میں ایک دوسرے پر کیا حقوق ہیں، ایک پڑوسی کا دوسرے پڑوسی کے اوپر کیا حق ہے، آقا کا اپنے غلام کے اوپر کیا حق ہے، اور غلام کا آقا پر کیا حق ہے؛ یہ سب حقوق تفصیلی طور پر اسلام نے بتلائے ہیں۔

حکمرانوں کا پورا سلسلہ

چناں چہ اسی سلسلہ میں ایک چیز آج پیش کی جارہی ہے کہ جب اسلامی حکومت ہوتی ہے تو ان میں ایک حکمران طبقہ ہوتا ہے اور ان میں بھی درجات ہوتے

ہیں۔ایک تو حاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے جس کو بادشاہ اور سلطان کہا جاتا ہے، پھر اس کی ماتحت درجات ہوتے ہیں، جیسے: ہمارے ملک میں پورا ایک نظام ہے کہ صدر یا وزیرِ اعظم ہوتے ہیں، پھر ان کے ماتحت گورنروں اور وزرائے اعلیٰ کا سلسلہ ہے، پھر وزرائے اعلیٰ کے ماتحت ضلعوں کے کلکٹر وغیرہ ہیں، پھر تحصیل کے پیمانوں پر حاکم ہیں، پھر دیہات اور بستیوں کے پیمانوں پر حاکم ہیں۔اور ہر سطح پر کچھ نہ کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں، یہ ساری ذمہ داریاں جن کے حوالہ کی جاتی ہیں ان کو ایک قسم کی حکمرانی حاصل ہوتی ہے، چاہے چھوٹے پیمانے پر ہو، یا بڑے پیمانے پر ہو۔اگر وہ حاکمِ اعلیٰ ہے جس کے ہاتھ میں حکومت دی گئی ہے، تو پورا ملک اور تمام رعیت اس کے ماتحت ہے، اس کے اوپر اپنے ماتحتوں کی، رعایا اور پبلک کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ ان کے ساتھ کیسا معاملہ کرنا چاہیے؟ اور پھر پبلک و رعایا کے اوپر اس حکمران کے کیا حقوق ہیں؟

حکومت نہ ہونے کی صورت میں بھی ہر ایک پر کچھ ایسی ذمہ داریاں ہیں جن کی وجہ سے کچھ لوگ اس کے ماتحت ہوتے ہیں، جیسے: گھر یا خاندان کا بڑا ذمہ دار ہوتا ہے تو اس کی ماتحتی میں کچھ لوگ ہیں۔گھر کے ذمہ دار کے ماتحتی میں اس کے بیوی بچے اور دوسرے لوگ جو گھر کے اندر سکونت اور رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں جن کا یہ بڑا سمجھا جاتا ہے؛ اس پر ماتحتوں کے حقوق ہوتے ہیں۔

جہاں خاندان مشترکہ طور پر زندگی گزارتے ہیں، تو خاندان کا جو سربراہ اور بڑا ہوتا ہے، وہ سب کا ذمہ دار ہوتا ہے، اس کے اوپر اپنے ماتحتوں کے حقوق ہوتے ہیں، علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ دونوں باب بالترتیب لائیں گے، اس کی تفصیل بیان کریں گے اور اس سلسلہ میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو ذمہ داریاں بتلائی ہیں ان سے متعلق روایتیں پیش کریں گے۔

جیتے جی جنت کا نمونہ بنانے کا نسخہ

اس سلسلہ میں ایک چیز ذہن نشین رہے کہ جہاں کہیں معاملہ دو پارٹیوں یا دو فریق کا ہوتا ہے، تو ہر فریق کے اوپر دوسرے فریق کی نسبت سے کچھ حقوق اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ایسی بے شمار مثالیں ہیں، مثلاً: میاں بیوی کا تعلق ہے، اور ہر ہر گھر کے اندر یہ تعلق ہوتا ہے، بلکہ ایک ہی گھر کے اندر کئی میاں بیوی رہتے ہیں؛ تو شوہروں کا ایک گروہ اور جماعت ہے، ان کے مقابلہ میں بیویوں کی ایک جماعت اور پارٹی ہے۔ اسی طریقہ سے سیٹھ اور نوکر کا تعلق ہے، تو سیٹھوں کی پوری ایک جماعت اور طبقہ ہے اور ان کے ماتحت کام کرنے والوں کا پورا ایک گروہ ہے۔ تو جو مالک، آقا اور سیٹھ ہیں؛ ان کو کیا حقوق حاصل ہیں؟ اور ان کی اپنے ماتحتوں اور نوکروں کی نسبت سے کیا کیا ذمہ داریاں ہیں۔ اسی طرح نوکروں کا جو گروہ ہے ان کے اوپر اپنے آقا کی نسبت سے کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ اس سلسلہ میں حکومتوں کے بھی قانون ہوتے ہیں۔ اور شریعتِ اسلامیہ میں اللہ تعالیٰ نے بھی یہ سارے حقوق واضح کردیئے ہیں اور اس سلسلہ میں ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ اگر دونوں فریق اپنی اپنی ذمہ داریوں کو پوری دیانت اور امانت داری کے ساتھ ذرّہ برابر بھی کمی کیے بغیر ادا کریں؛ پھر تو یہ دنیا جیتے جی جنت کا نمونہ ہی بن جائے، اور اگر ایک فریق تو ان حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے جو اس کے اوپر دوسرے فریق کے واجب ہوئے ہیں، لیکن دوسرا فریق اپنی ذمہ داریاں ادا کرتا ہے، تب بھی کوئی جھگڑا اور نزاع کی نوبت پیش نہیں آئے گی۔

اسلام اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ تمہارے اوپر دوسروں کے جو حقوق ہیں اس کو ادا کرو، اور اپنے حقوق کا مطالبہ مت کرو۔ چناں چہ آپ قرآن وحدیث کے اندازِ

تخاطب کو دیکھیں گے تو اس میں خاص طور پر جس کا حق ہے اس کو خطاب نہیں کیا ہے، بلکہ جس پر حق ہے اس کو خطاب کیا ہے۔ جیسے: بیوی کا حق ہے تو بیوی کو یہ نہیں کہا کہ شوہر کے اوپر تیرا حق ہے، بلکہ شوہر کو یوں کہا گیا کہ تمہارے اوپر بیوی کا یہ حق ہے۔ یا بیوی کے اوپر شوہر کا حق ہے تو شوہر کو خطاب کر کے یوں نہیں کہا گیا کہ اے شوہروں کی جماعت! تمہاری بیویوں پر تمہارے یہ حقوق ہیں، بلکہ عورتوں کو براہِ راست خطاب کیا گیا ہے کہ تمہارے اوپر شوہروں کے یہ یہ حقوق ہیں، تم ان کو ادا کرو۔ ایسے ہی یہاں پر بھی ہے۔

عنوان کا خلاصہ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلا باب قائم کیا، جس کا عنوان ہے: ذمہ داروں کو اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرمی اختیار کرنے کا حکم۔ جیسا کہ میں نے بتلایا کہ حکمرانی کے بھی مراتب اور درجات ہیں، ایک تو حاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے، پھر اس کے ماتحت ہوتے ہیں، پھر اس کے ماتحت؛ اسی طرح ایک بہت لمبا چوڑا سلسلہ چلتا ہے۔ اس لیے یہ حکم صرف بادشاہِ وقت کے لیے خاص نہیں ہے، بلکہ جو گھر کا ذمہ دار، بڑا اور رئیس ہوتا ہے اس کو بھی یہ سارے احکام لاگو پڑتے ہیں۔ ”وَنَصِيحَتِهِمْ وَالشَّفْقَةِ عَلَيْهِمْ“ ان کی خیر خواہی اور پوری پوری بھلائی چاہنے، اور ان کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کرنے کا حکم۔ ”وَالنَّهْيِ عَنْ غِشِّهِمْ“ اور ان کی بدخواہی سے منع کرنے کا حکم۔ بحیثیت حاکم کے تمہاری طرف سے کوئی ایک حرکت بھی ایسی نہیں ہونی چاہیے جس سے تمہارے ماتحتوں کے متعلق بدخواہی معلوم ہوتی ہو۔ ”وَالتَّشْدِيدِ عَلَيْهِمْ“ جہاں حکمران کو حکم دیا گیا کہ نرمی کرو، وہیں ان کے ساتھ سختی کرنے سے منع کیا گیا۔ یعنی دونوں باتیں ہونی چاہئیں، صرف نرمی کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ سختی سے بھی منع کیا گیا، جیسے: خیر خواہی کا حکم دیا اور

ساتھ ہی بدخواہی سے منع کیا۔

بے توجہی اور غفلت سے منع کیا گیا

"وَإِهْمَالِ مَصَالِحِهِمْ وَالْغَفْلَةِ عَنْهُمْ" ان کی جو جو مصلحتیں ہوں ان کی طرف سے بے خبری، بے توجہی اور ان کے معاملہ میں غفلت برتنے سے بھی منع کیا گیا۔ اور ان کی بھلائی کی جتنی بھی شکلیں ہوسکتی ہیں وہ سوچی جائیں۔ مثلاً: ایک آدمی پورے گھر کا سربراہ اور رئیس ہے، اب گھر میں کیا ہورہا ہے اس کو اس بات کی کوئی پڑی ہی نہیں ہے، گھر والے کہاں سے کھا رہے ہیں، کیا کررہے ہیں، ان کی ضرورتیں کیسے پوری ہورہی ہیں، اس کو اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی، وہ اپنے میں مست ہے، اور ان کی طرف سے بالکل غفلت برت رہا ہے۔

یا اگر اچھا کھلا پلا تو رہا ہے لیکن ان کی تعلیم وتربیت کی طرف سے غفلت برت رہا ہے کہ ان کے اعمال کیا شکل اختیار کررہے ہیں۔ یا اس کو اس بات کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہے کہ میرا بیٹا کس کی صحبت میں پھر رہا ہے، میری بیوی کہاں جارہی ہے، میری بیٹیاں کیا کررہی ہیں۔ یا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ گھر والے غلط لیٹریچر کا مطالعہ کررہے ہیں جس سے ان کی ذہنیت خراب ہوتی ہے، لیکن ان کی طرف سے بے توجہی اور غفلت برتتا ہے؛ تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اوپر سے لے کر نیچے تک ہر ایک کے لیے یہ حکم یکساں ہے۔

مصلحت اور حاجت کا فرق

"وَعَنْ حَوَائِجِهِمْ" ان کی ضرورتوں سے غفلت برتنے سے منع کیا گیا ہے۔ مصالح اور حوائج دو چیزیں الگ الگ ہیں، مصالح کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس سے

اس کی زندگی میں خوبی اور نکھار آتا ہے، زندگی بنتی اور سنورتی ہے، اور اس میں تعلیم و تربیت، اخلاق، اعمال، اٹھنا بیٹھنا، بول چال؛ یہ ساری چیزیں آتی ہیں۔ اور حوائج کا مطلب ہے ضرورتیں؛ جس میں کھانا، پینا، کپڑا مکان؛ یہ ساری چیزیں آتی ہیں۔ اب ایک آدمی اگر اپنے ماتحتوں کے کھانے پینے، رہنے سہنے، اور ان کے کپڑوں کا بہترین انتظام کرتا ہے، اس پر برابر پیسے خرچ کرتا ہے، ذرّہ برابر اس کی طرف سے غفلت نہیں برتتا، لیکن ان کی تعلیم و تربیت کی طرف سے غفلت کا معاملہ کرتا ہے، ان کی عادتوں کی طرف سے غفلت و بے پرواہی برتتا ہے تو پھر یہ گڑ بڑ والی بات ہو جائے گی۔ اس لیے کہ وہ ان کی حاجتیں پوری کر رہا ہے، لیکن ان کی مصلحتوں اور بھلائیوں کی طرف توجہ نہیں کر رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں بحیثیت ایک ذمہ دار کے ہر طرف سے چوکنّا رہنا ہے اور ہر ہر چیز کا خیال کرنا ہے۔ گھر کے لیڈر اور ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے صرف کھلانا پلانا ہی کافی نہیں ہے۔

آج کل ہم لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ اگر ہم گھر کے ذمہ دار ہیں تو گھر کے لوگوں کے رہنے سہنے، کھانے پینے، کپڑوں وغیرہ دوسری ضرورتوں کا انتظام کر دیں گے؛ تو گویا ہم نے اپنی ذمہ داری پوری کر لی۔ حالاں کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "وَإِهْمَالِ مَصَالِحِهِمْ وَالْغَفْلَةِ عَنْهُمْ وَعَنْ حَوَائِجِهِمْ" ان کی ذات سے بھی غفلت نہ برتے اور ان ضرورتوں سے بھی غفلت نہ برتے، ان کی ہر چیز کا خیال رکھے؛ یہ سب ذمہ داریاں ہیں۔

ایک مثال

بھائی! آپ گاڑی میں پٹرول تو دیتے ہیں، لیکن اس کے شیشے کی صفائی نہیں کرتے، سروس نہیں کراتے؛ تو کیا کام چل جائے گا؟ نہیں چلے گا! بلکہ ہر ہر چیز کرنی

پڑے گی، تب ہی آپ کی گاڑی چلے گی۔ اسی طریقہ سے کھلانے پلانے، رہنے سہنے کا انتظام تو کرتے ہیں؛ لیکن ان کے اخلاق، اعمال، اقوال کے سدھار اور تعلیم و تربیت کی طرف دھیان نہیں دیتے، ان کی عادتیں کیسی ہیں، کہاں اٹھتے بیٹھتے ہیں، گھر میں کیا کرتے ہیں، اس طرف سے غفلت برتتے ہیں اور کوئی توجہ نہیں کرتے؛ تو کام نہیں چلے گا۔ اور جتنے بھی ذمہ دار ہیں ہر ایک کے لیے یہی حکم ہے، بادشاہِ وقت اور حاکمِ اعلیٰ جو پوری سلطنت کا ذمہ دار ہے، اس کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی رعیت کی ان ساری چیزوں کا خیال رکھے۔

موت کی گھڑی میں رعایا کی اصلاح کی فکر

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو پتہ چلے گا کہ وہ صرف اتنا ہی نہیں سوچتے تھے کہ نظامِ سلطنت برابر چلے، بلکہ رعیت کی ہر ہر چیز کا پورا خیال رکھتے تھے، لوگوں کا کیا حال ہے، ان کے اخلاق کیسے ہیں، ان کے اعمال کیسے ہیں، وہ کس قسم کا لباس پہنتے ہیں؛ وہ ان سب چیزوں کا خیال رکھتے تھے۔ اس بات کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر حملہ ہوا، ابولؤلؤ نے خنجر مارا جس سے آپ زخمی ہوئے اور آپ کے جاں بر ہونے کی امید نہیں تھی، سب کا گمان تھا کہ اسی بیماری میں انتقال ہو جائے گا اور اسی بیماری میں آپ کی وفات بھی ہوئی۔ اسی بیماری کے دوران ایک نوجوان آپ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آیا، جب وہ واپس لوٹ رہا تھا تو آپ کی نظر اس کی لنگی یا پائجامہ پر پڑی جو ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا تھا، آپ نے اس کو بلایا اور کہا: اے بھائی! "اِرْفَعْ ثَوْبَكَ"، اپنا پائجامہ اونچا رکھو "فَإِنَّهُ أَنْقَى لِثَوْبِكَ"، یہ تمہارے کپڑے کی صفائی کا ذریعہ ہے "وَأَتْقَى لِرَبِّكَ"، اور اپنے رب کے یہاں تقویٰ کا ذریعہ بھی ہے۔ (صحیح بخاری، باب

قصۃ البیعۃ والاتفاق علی عثمان بن عفانؓ، حدیث نمبر: ۳۴۹۷) **غور کرو کہ عین موت کی گھڑی میں وہ اس ذمہ داری سے بے خبر اور بے پرواہ نہیں تھے۔**

ایک مرتبہ جب آپ شام کے علاقہ میں تشریف لے گئے، تو وہاں اسلامی لشکر کے مختلف حصوں کے سپہ سالار ملے، ان کے حالات کو دیکھا تو ان کے لباس پر ان کوٹو کا۔

جامع آیت

پہلی آیت لائے ہیں: ﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى﴾ اللہ تعالیٰ عدل کا حکم دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی جامع آیت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک کی ساری تعلیمات پیش کرنے کے لئے یہ ایک آیت ہی کافی ہے۔ اسی لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جمعہ اور عیدین کے دوسرے خطبہ میں اس کو شریک کرلیا، خطیب اپنے خطبہ کو اسی آیت پر ختم کرتا ہے۔ یہ ایسی جامع آیت ہے کہ قرآنِ کریم کی تمام تعلیمات کی پوری عکاسی کرتی ہے۔ بعض حضرات تو اسی آیت کی وجہ سے ایمان لائے ہیں۔

آیت کا اثر پوری قوم پر

حضرت اکثم بن صیفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک صحابی ہیں۔ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اپنے قبیلے کے سردار تھے، ان کو معلوم ہوا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور ہوا ہے اور آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، لوگوں کو اسلام و ایمان کی دعوت دیتے ہیں، تو انہوں نے اپنی قوم سے کہا: میں جا کر ان کے حالات کی تحقیق کر کے آتا ہوں۔ قوم نے کہا: آپ ہمارے قبیلے کے سردار ہیں، آپ خود نہ جائیے، بلکہ ان کے حالات کی تحقیق کے لیے دو آدمیوں کو بھیج دیجیے۔ چناں چہ دو آدمی گئے جنہوں جا کر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے

پوچھا: "مَنْ أَنْتَ وَمَا أَنْتَ؟" آپ کون ہیں اور کیا ہیں؟ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: "أَنَا مُحَمَّدُ بْنِ عَبْدِ اللهِ" میں محمد بن عبد اللہ ہوں "وَأَنَا عَبْدُ اللهِ وَرَسُوْلُهُ" اور میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ ان کے سوال ''کون ہو؟'' کے جواب میں اپنا نام بتادیا، پورا نسب بھی تفصیل سے نہیں بتایا۔ اور ''کیا ہو؟'' کے جواب میں بتادیا کہ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں پھر تعلیم کے طور پر آپ نے قرآنِ پاک کی یہی آیت پڑھ کر سنائی۔ انہوں نے عرض کیا: اس کو لوٹایئے یہاں تک کہ ان کو یہ آیت یاد ہوگئی۔ آپ نے ایسا نہیں بتلایا کہ میں بڑے خاندان کا ایک فرد ہوں، بلکہ ان لوگوں نے اپنے طور پر نبیٔ کریم ﷺ کے نسب شریف سے متعلق لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ آپ تو بڑے اونچے خاندان قبیلۂ مضر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب وہ دونوں واپس آئے اور رپورٹ پیش کی کہ ہم نے ان سے پوچھا تو انہوں نے تو مختصر سا جواب دیا، اپنے خاندان کی تفصیل بھی ذکر نہیں کی، لیکن جب ہم نے لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ تو بڑے اونچے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان پر جو وحی آتی ہے اس میں سے یہ آیت پڑھ کر سنائی ہے، جب حضرت اکثم بن صیفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ آیت سنی تو کہا: وہ تو بڑے اچھے اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور برے اخلاق سے روکتے ہیں اور فوراً اسلام قبول کرلیا، پھر اپنی قوم سے کہا: جلدی سے تم لوگ بھی اسلام میں داخل ہوجاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری دنیا اسلام میں داخل ہوجائے، اس کے بعد تم ضمنی طور پر داخل ہوؤ، پھر تمہاری کوئی حیثیت نہ رہے، ابھی اسلام لانے میں سبقت کرنے کا موقع ہے۔ اس طرح یہ خود بھی مسلمان ہوئے اور پورے قبیلے کو بھی مسلمان بنالیا۔ (تفسیر ابن کثیر، سورۂ نحل)

......میرا ایمان پختہ ہوگیا

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ شروع میں جب میں ایمان

لایا تو میرے دل میں ایمان مضبوط نہیں تھا، بس ایمان لے آیا تھا لیکن اس بارے میں ابھی ''ڈانواں ڈول'' اور مذبذب تھا۔ ایک مرتبہ نبیٔ کریم ﷺ کے اوپر وحی کے نزول کے آثار ظاہر ہوئے، جب وحی نازل ہو چکی، تھوڑی دیر بعد حضورِ اکرم ﷺ نے یہی آیت پیش کی، جب مَیں نے یہ آیت سنی تو اس کے مضمون کے نتیجہ میں میرا ایمان پختہ ہو گیا۔ (تفسیر قرطبی، سورۂ نحل)

عدل

خلاصہ یہ ہے کہ یہ عجیب وغریب آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ''عدل'' کا حکم دیتا ہے۔ عدل یعنی انصاف وبرابری۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ہر ذی حق کا حق ادا کرنا ''عدل'' ہے۔ اور عدل سے اعتدال مراد لیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اعتدال ومیانہ روی کا حکم کرتا ہے کہ اپنے عقائد، اعمال، اخلاق، معاشرت اور معاملات کو درست کرو اور ہر چیز میں اعتدال مطلوب ہے۔

احسان

''وَالْإِحْسَانِ'' اور اللہ تعالیٰ بھلائی کا حکم دیتا ہے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ عدل تو واجب ہے کہ ہر ذی حق کا حق پورا پورا ادا کیا جائے، اور پھر حق سے زائد بھی کچھ دیا جائے؛ اسی کو احسان اور بھلائی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں: احسان کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کو خوبی کے ساتھ اچھی طرح انجام دینا، جیسے: اہلِ عرب بولتے ہیں: ''طَبَخْتُ، فَأَحْسَنْتُ الطَّبْخَةَ'' میں نے پکایا اور بڑا اچھا پکایا۔ کوئی عمل اچھے اور عمدہ انداز وطریقہ سے پختگی کے ساتھ کیا گیا ہو، تو اس کو احسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام اعمال، اخلاق، عبادات، معاملات، معاشرت؛ ہر ہر چیز

میں آدمی خوبی پیدا کرنے کا اہتمام کرے۔

إِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى

"وَإِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى" اور اللہ تعالیٰ رشتہ داروں کو دینے کا حکم کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ احسان کے عام حکم میں رشتہ دار بھی آ گئے تھے، اور واجب حق تو ہر ایک کا ادا کرنا ہی ہے، لیکن جہاں احسان یعنی واجب سے زیادہ دینے کی بات آتی ہے تو اس میں پھر درجات ہوتے ہیں، خاص کر رشتہ داروں کے ساتھ آدمی زیادہ بھلائی کا معاملہ کرے، رشتہ داری کی وجہ سے ان کا حق زیادہ ہے۔

فحش، منکر، سرکشی

"وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ" اور اللہ تعالیٰ بے حیائی اور ظاہری و باطنی ہر طرح کی برائی سے منع کرتا ہے "وَالْمُنْكَرِ" اور نامعقول حرکتوں اور باتوں سے بھی منع کرتا ہے "وَالْبَغْيِ" اور ظلم و سرکشی سے منع کرتا ہے "يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ" اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے، شاید تم نصیحت حاصل کرو۔

ہر ایک ذمہ دار ہے

۶۵۳:- وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قَالَ سَمِعْتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يقول: كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ: الإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِي أَهْلِهِ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْؤُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا، وَالْخَادِمُ رَاعٍ فِي مَالِ سَيِّدِهِ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے (یہاں تک کہ جس کے ماتحت کوئی نہ ہو، وہ بھی اپنی ذات کا ذمہ دار ہے۔ اپنی جان اور جسم پر اس کی ذمہ داری ہے کہ اپنے جسم کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چلائے) اور ہر ایک کو اپنے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا (جیسی جیسی ذمہ داری اس کو سونپی گئی ہے اسی کے مناسب اللہ تعالیٰ کے یہاں پوچھ ہوگی اور مطالبہ ہوگا کہ تم نے اپنی اس ذمہ داری کو کتنا پورا کیا۔ جیسے: کوئی) اگر پورے ملک کا سربراہِ اعلیٰ اور حکمران ہے تو پورے ملک کا پوچھا جائے گا (اور اگر کسی علاقہ کا نگران ہے تو اس علاقہ کے متعلق، اور کسی بستی کا نگران ہے تو بستی کے متعلق، اور کسی محلہ کا نگران ہے تو محلہ کے متعلق، اور کسی خاندان کا نگران ہے تو خاندان کے متعلق، اور مکان کا نگران ہے تو مکان کے متعلق سوال کیا جائے گا) اور مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، ان کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اور عورت اپنے گھر اور مکان کی ذمہ دار ہے، اس کے متعلق اس سے پوچھا جائے گا۔ نوکر اور غلام اپنے آقا اور سیٹھ کے مال میں ذمہ دار ہے، اس سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے، اور ہر ایک کو اپنے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

افادات:- "اَلْإِمَامُ رَاعٍ" امام سے مراد حاکمِ اعلیٰ، بادشاہِ وقت ہے، اس کو اپنی ماتحت پوری رعیت، پبلک اور پورے ملک کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال کیا جائے گا۔

"والرجُلُ رَاعٍ" مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، وہ اپنے گھر کا سربراہ ہوتا ہے، اس کے ماتحت بیوی بچے ہوتے ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال کیا جائے گا کہ تم نے اپنی ذمہ داری کو ادا کیا یا نہیں۔ اگر اس میں کوتاہی کی ہے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پکڑ ہوگی۔

"وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِيْ بَيْتِ زَوْجِهَا" عورت اپنے گھر اور مکان کی ذمہ دار ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اولاد کی نگرانی کے سلسلہ میں اور شوہر کے مکان میں جتنی بھی چیزیں ہیں ان سب کی ذمہ دار ہے۔ شوہر تو کاروبار اور کمانے اور دوسری ضرورتوں کے واسطے باہر رہتا ہے، اب گھر میں شوہر کا جو کچھ بھی ہے ان ساری چیزوں کی رکھوالی اور نگرانی کی ذمہ داری بیوی کی ہے۔ اولاد کی نگرانی بھی بیوی کے اوپر ہے۔ اور گھر کے سارے نظام کی ذمہ داری بھی عورت کے اوپر ہے۔ شوہر کی غیر حاضری میں عورت اپنی ذات کی عفت و پاک دامنی کی بھی حفاظت کرے، ساتھ ہی ساتھ بال بچوں کی نگرانی بھی کرے، اگر اس نے اس میں کوتاہی برتی، اور خیانت سے کام لیا، جیسے: بعض عورتیں اپنی ذات کے معاملہ میں بھی بے خبر اور اپنی اولاد کے معاملہ میں بھی غافل رہتی ہیں، حالاں کہ ان کو ہر چیز کو نبھانا اور سنبھالنا ہے، ان کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ اس لیے کہ شوہر صبح جب گھر سے نکلتا ہے تو اپنے گھر میں جو کچھ ہے وہ سب بیوی کے حوالہ کر کے جاتا ہے، اگر اس میں کوئی کوتاہی یا خیانت ہوئی تو بیوی سے اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہوگا۔

"وَالْخَادِمُ رَاعٍ فِيْ مَالِ سَيِّدِهٖ" نوکر اور غلام اپنے آقا اور سیٹھ کے مال میں ذمہ دار ہے جو اس کے حوالہ کیا گیا ہو۔ کوئی آدمی اگر کسی جگہ ملازم ہے، تو سیٹھ نے جو کام اس کے حوالہ کیا ہے، مثلاً: کوئی مشین حوالہ کی جاتی ہے، تو یہ اس کے آقا کا مال ہے، اس کو صحیح طریقہ سے چلانا، اس کو نقصان سے بچانے کی کوشش کرنا، اس کو چلانے میں پوری امانت و دیانت سے کام لینا؛ یہ نوکر کا کام ہے۔ یا سیٹھ نے دوکان حوالہ کی، تجارت کے مال کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی اور اسی کی تنخواہ دی جاتی ہے، تو اس کے متعلق قیامت کے روز پوچھا جائے گا۔

"كُلُّكُمْ راعٍ ومسئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ" تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جس کے سر جتنی ذمہ داری حوالہ کی گئی ہے، اس کے متعلق اس سے پوچھا جائے گا۔ جیسی جیسی جس کی حیثیت اور جیسا جیسا جس کا مقام ہوگا اتنی ہی ذمہ داری اس کی زیادہ اور بڑی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق اس سے سوال ہوگا۔

آج کل تو یہ ہوگیا ہے کہ کوئی اونچا عہدہ یا منصب مل جائے تو ہم خوش ہوتے ہیں، حالاں کہ یہ تو ڈرنے کی چیز ہے۔ جس کا منصب جتنا اونچا ہوگا، اتنے ہی زیادہ لوگ اس کے ماتحت آئیں گے اور ان سب کی ذمہ داری اس کے اوپر عائد ہوگی، اس میں سے کسی ایک کے حق کی ادائیگی میں بھی کوتاہی ہوئی تو قیامت کے روز اس کا جواب دینا پڑے گا۔

ماتحتوں کے بدخواہ کی سزا

۶۵۴:-وعن أبي يعلى مَعْقِل بن يَسارٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يقول: مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللهُ رَعِيَّةً، يَمُوتُ يَوْمَ يَمُوتُ وَهُوَ غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهِ، إِلَّا حَرَّمَ اللهُ عَلَيْهِ الجَنَّةَ. (متفقٌ عليه)

وفي رواية: ((فَلَمْ يَحُطْهَا بِنُصْحِهِ لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الجَنَّةِ))

وفي رواية لمسلم: ((مَا مِنْ أميرٍ يلي أمور المُسْلِمِينَ، ثُمَّ لا يَجْهَدُ لَهُمْ وَيَنْصَحُ لَهُمْ إِلَّا لَمْ يَدْخُلْ مَعَهُمُ الجَنَّةَ))

ترجمہ:- حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: جس بندہ کو اللہ تعالیٰ اپنی رعیت کا نگران مقرر کرے (جیسا کہ اوپر بتلایا کہ

جس کے ماتحت جتنے بھی لوگ ہوتے ہیں، اگر کوئی ایک گھر کا سربراہ ہے، کوئی پورے خاندان کا سربراہ ہے، کوئی پوری بستی کا سربراہ ہے، کوئی پورے علاقہ کا سربراہ ہے)اور جس روز وہ مر رہا ہے تو اس کی موت ایسی حالت میں آرہی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کی بدخواہی کیے ہوئے ہے، یا ان کی بھلائی چاہنے کے بجائے ان کی برائی چاہ رہا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے اوپر جنت کو حرام کردے گا۔

افادات:- اسلام نے رعایا کے اوپر حکمرانوں کے بڑے حقوق بتائے ہیں، جیسا کہ آئندہ باب آنے والا ہے جس میں آئے گا کہ ان کی پوری فرمانبرداری کرو، اور جب کہ رعیت تو پوری فرمانبرداری کر رہی ہے، لیکن حکمران رعیت کی خیرخواہی کرنے کے بجائے بدخواہی کرتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ چیز ان کے لیے مضر ہے، اس کے باوجود اپنے کسی مفاد کے پیشِ نظر ان کے لیے وہی چیز اختیار کرتا ہے؛ تو ایسے آدمی پر اللہ تعالیٰ جنت کو حرام کردیں گے۔

دوسری روایت میں ہے: "فَلَمْ يَحُطْهَا بِنُصْحِهِ" پوری پوری خیرخواہی نہیں کی، یعنی جو بھلائی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں چاہی، اس میں کمی کی۔ مثلاً: کھانا تو کھلایا، کپڑے تو پہنائے، لیکن اچھے آداب نہیں سکھلائے، اچھے اخلاق سے آراستہ نہیں کیا، دینی تعلیم نہیں دی، اس کو دنیا حاصل ہوجائے اس کی ڈگریاں تو دلوادیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو، ایسی چیز ان کو نہیں سکھلائی، نماز نہیں سکھلائی، تو ظاہر ہے کہ خیرخواہی میں کمی رہ گئی؛ ایسا آدمی جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔

جن کے رتبے ہیں سوا......

ایک روایت میں ہے کہ جو حکمران مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار ہوتا ہے،

پھر وہ ان کے لیے پوری پوری خیر خواہی نہیں کرتا بلکہ اس میں کمی رکھتا ہے، تو وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے اوّلِ وہلہ میں جنت میں نہیں جا سکے گا، بلکہ خیانت اور کوتاہی کی سزا بھگتنے کے بعد جائے گا۔ ہاں! اگر اپنی مقدور بھر طاقت کے مطابق پوری خیر خواہی کر ڈالی، جتنا اس کے بس میں تھا اس میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی، تو اس کا ذمہ بری ہو جائے گا، اس لیے منصب وعہدہ اور اونچا مقام کوئی آسان چیز نہیں ہے: ؎

جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی مشکل بھی سوا ہوتی ہے

جس کا جتنا اونچا مقام ہوتا ہے اس کی ذمہ داری بھی اسی مناسبت سے بڑی ہوا کرتی ہے اگر اس میں اس نے کوتاہی سے کام لیا تو دنیا میں بھی لوگ تھو تھو کریں گے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی جواب دینا ہے۔

جیسا برتاؤ؛ ویسی دعا

۶۵۵:- وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: سَمِعْتُ رسولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يقول في بيتي هَذَا: اللّٰهُمَّ مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِي شَيْئاً، فَشَقَّ عَلَيْهِمْ؛ فَاشْقُقْ عَلَيْهِ. وَمَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِي شَيْئاً، فَرَفَقَ بِهِمْ؛ فَارْفُقْ بِهِ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میرے اس مکان اور حجرہ میں فرماتے ہوئے سنا: اے اللہ! جو آدمی میری امت کی کسی کام کا ذمہ دار ہوا (یعنی کوئی حکمرانی اور ذمہ داری اس کے سر آئی) اور اس نے (بجائے راحت اور نرمی کرنے کے) ان کے اوپر بلا وجہ سختی کی اور ان کو مشقت میں ڈالا؛ تو اے اللہ! تو بھی اس کو مشقت میں ڈال۔ اور جو میری امت کے کسی کام کا ذمہ دار ہوا اور اس کو حکمرانی کا منصب ملا پھر اس نے ان کے ساتھ نرمی برتی؛ تو اے اللہ! تو بھی اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کر۔

افادات:- نرمی کا مطلب یہ ہے کہ جہاں شریعت نے نرمی کا حکم دیا ہے وہاں نرمی اختیار کی جائے۔ ورنہ جہاں شریعت کے قانون کو نافذ کرنے کے معاملہ میں سختی اختیار کرنی پڑے؛ تو وہاں تو سختی سے کام لینا ہی ضروری ہے۔ یہاں سختی کا مطلب یہ ہے کہ بلاوجہ لوگوں کو مشقت میں ڈالنا، جیسا کہ بعضوں کو عادت ہوتی ہے کہ اس کو مارا اس کو پھٹکارا، اس کو کچھ کر دیا؛ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ایک تو قانون کو نافذ کرنا ہوتا ہے، وہاں تو شریعت کا قانون نافذ کیا جائے گا؛ اور اس کا نام سختی نہیں ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا......

آج لوگوں نے سختی اور نرمی کی تعریف اور اصطلاحات بھی بدل ڈالی ہیں، اور سختی و نرمی کے لیے پیمانے بھی بدل دیئے ہیں۔ اگر کوئی باپ اپنی اولاد کی صحیح تربیت کے معاملہ میں ذرا سختی کرتا ہے، جیسے: صبح جلدی اٹھتا ہے، بچہ کو اپنے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے مسجد لے جاتا ہے، تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ بڑا سخت ہے، بچہ تو ابھی بیچارہ دس بارہ سال کا ہے، اس کو سونے نہیں دیتا، صبح جلدی اٹھا کر ظلم کرتا ہے۔ حالاں کہ سات سال کی عمر میں تو شریعت نے بھی نماز کے لیے کہنے کا حکم دیا ہے، اور یہ بچہ تو بارہ سال کا ہوا، اس کو بھی باپ تاکید کرے تو لوگ ایسا کہتے ہیں کہ باپ بڑا سخت ہے، حالاں کہ اس کا نام سختی نہیں ہے، بلکہ باپ اگر اس کو نہیں کہے گا تو گنہگار ہوگا۔ اسی طریقہ سے بیٹا اگر ٹی وی دیکھ رہا ہے اور باپ روک رہا ہے، تو لوگ کہتے ہیں کہ باپ بڑا سخت ہے، اگر نہ روکے تو اس کا نام نرمی ہے، حالاں کہ یہ نرمی نہیں ہے، بلکہ بدخواہی ہے۔

حاکموں سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرو

۶۵۶:- وعن أَبِي هُرَيرةَ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: كَانَتْ

بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الأَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لاَ نَبِيَّ بَعْدِي، وَسَيَكُونُ بَعْدِي خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُونَ. قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ، فَمَا تَأْمُرُنَا؟ قَالَ: أَوْفُوا بِبَيْعَةِ الأَوَّلِ فَالأَوَّلِ، ثُمَّ أَعْطُوهُمْ حَقَّهُمْ، وَاسْأَلُوا اللهَ الَّذِي لَكُمْ، فَإِنَّ اللهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ. (متفقٌ علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: بنواسرائیل کی سرداری ان کے انبیاء کرتے تھے **(یعنی ان کے ہاتھ میں حکومت ہوتی تھی)** جب ایک نبی کا انتقال ہوتا تھا تو اس کی جگہ پر دوسرا نبی اس کا جانشین بنتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اس لیے میرے بعد خلفاء ہوں گے اور وہ زیادہ ہوں گے **(اس لیے کہ جب تک دنیا قائم ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا)** صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ ان کے سلسلہ میں ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ **(یعنی بعد میں جو لوگ آئیں گے اور جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہوگی، ان کے ساتھ ہم کیا معاملہ کریں؟)** حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: پہلے جس کے ہاتھ پر بیعت لی گئی اس کے عہد و پیمان کو پورا کرو اور اس کا حق ادا کرو، اور تمہارا جو حق ان کے اوپر ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو، اس لئے کہ اگر وہ کچھ کمی کوتاہی کر رہے ہیں، اور حق نہیں دیتے تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا۔

افادات:- بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے ہاتھ پر حکمرانی کی بیعت لی گئی اور اس کو حاکم مقرر کیا گیا، پھر دوسرا آدمی اس کے اوپر زبردستی بزورِ قوت چڑھ بیٹھتا ہے اور اس کے پاس سے حکومت چھین کر لوگوں سے بیعت لینا شروع کر دیتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ جس کے ہاتھ پر پہلے بیعت کی گئی تھی اور اس کے ساتھ تم نے جو عہد و پیمان کیا تھا؛ اس کو پورا کرو، اس لیے کہ اسلام دوسروں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ پہلے حکمران کو ہٹا کر اس کی جگہ پر آ جائیں، اس لیے تم نے پہلے کے ہاتھ پر بیعت کے

وقت جو عہد و پیمان کیا تھا اور وفاداری کا وعدہ کیا تھا؛ اس کو پورا کرو اور اس کا حق ادا کرو۔

جہاں کہیں فتنے رونما ہوتے ہیں

اور اگر وہ تمہارے حقوق کی ادائیگی میں کچھ کوتاہی کرتے ہیں، تو اس کو لینے کے لیے تلوار مت نکالو اور لڑنے کے لیے میدان میں مت آجاؤ، اس لیے کہ سارے فتنوں کی جڑ یہی ہے، بلکہ تمہارا جو حق ان کے اوپر ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو۔

کتاب الفتن میں بھی محدثین ان روایتوں کو خاص طور پر لاتے ہیں، اس لیے کہ جب بھی کہیں فتنے ہوتے ہیں اسی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ ذمہ دار کی طرف سے بلاوجہ سختی ہوئی جس کی وجہ سے رعیت میں اشتعال پیدا ہوا۔ یا ذمہ دار نے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی، تو رعیت کی طرف سے مطالبہ ہوا۔ یا رعیت نے ذمہ دار کے حقوق کی ادائیگی اور اطاعت وفرمانبرداری میں کوتاہی کی جس کے نتیجہ میں اس نے سخت نوٹس لیا اور ٹکراؤ پیدا ہوا۔ جہاں کہیں بھی فتنے رونما ہوتے ہیں، چاہے وہ گھر کا فتنہ ہو، میاں بیوی کا مسئلہ ہو، فیکٹری کا فتنہ ہو، سیٹھ نوکر کا مسئلہ ہو، یا علاقہ کا ہو، حکمران اور پبلک کا مسئلہ ہو، جہاں کہیں کوئی بھی جھگڑا ہوتا ہے اگر آپ اس کی بنیاد دیکھیں گے تو یہی ہوگی کہ یا تو اس کے اوپر جو ذمہ داری ہے وہ ادا نہیں کرتا ہے، یا دوسرا مطالبہ کرتا ہے، حالاں کہ شریعت یہ کہتی ہے کہ اگر وہ تمہارے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو تم اس سے مت مانگو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ اس لئے کہ اگر وہ کچھ کمی کوتاہی کر رہے ہیں، اور حق نہیں دیتے تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا۔

آج کل کی سب سے بڑی گڑبڑ

آج کل تو معاملہ یہ ہو گیا ہے کہ ہم لوگوں کے سارے حساب و کتاب دنیا ہی

میں کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی رشتہ دار نے کچھ اچھا سلوک نہیں کیا، تو ہم اس سے یہیں نمٹ لینا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں کے لئے باقی چھوڑنا ہی نہیں چاہتے، یوں سمجھتے ہیں گویا میدانِ حشر میں کچھ ہونے والا ہی نہیں ہے، یہاں ہم ہی سب نمٹا دیں۔ کسی نے گالی دی تو صبر سے کام نہیں لیتے اور کہتے ہیں کہ اب میں تجھے بتاتا ہوں۔ حالاں کہ ہونا یہ چاہیے کہ ہم اپنے کام میں لگے رہیں۔ اگر ہم یوں سوچیں کہ اس نے یہ کیا، فلاں نے وہ کیا، اس سے بدلہ لینا ہے، فلاں سے انتقام لینا ہے، فلاں نے ایسا کیا تو اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے؛ اگر ہم یہی سب کرتے رہیں تو پھر اپنی ذمہ داریاں کہاں ادا کریں گے۔ آج کل ہر جگہ جو گڑبڑیاں ہو رہی ہیں اس کی وجہ یہی ہے۔ ہر ایک کا یہ حال ہو گیا ہے، سب ہی یہ سوچتے ہیں کہ جو ذمہ دارِ اعلیٰ ہے وہ ایسا کرے، استاذ کو یوں کرنا چاہیے، اس نے ایسا کیوں کیا، فلاں نے ایسا کیوں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ سب کی پڑی ہوئی ہے، اگر نہیں پڑی ہے تو اپنی نہیں پڑی ہے۔ اپنے اوپر جو ذمہ داریاں ہیں اس کی ادائیگی کا اہتمام نہیں ہے، پھر اگر کسی نے ذرا سا کوئی معاملہ کیا تو فوراً ٹکراؤ کی شکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

وہاں دیر تو ہے، اندھیر نہیں

بیوی کا حق اگر شوہر نے ادا نہیں کیا تو بیوی کو چاہیے کہ وہ اس کا حق ادا کرتی رہے، اور اپنے حق کے متعلق اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی رہے کہ: اے اللہ! میرے شوہر کو توفیق دے کہ وہ میرا حق ادا کرے۔ اگر وہ کوتاہی کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہونے والا ہے، وہاں دیر تو ہے، اندھیر نہیں۔ اس کے عدل وانصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ ہر ایک سے پوچھا جائے اور اس کا ظہور قیامت کے روز اس طرح ہوگا کہ اگر سینگ

والی بکری نے بغیر سینگ والی بکری کو مارا ہے، تو اللہ تعالیٰ سینگ والی کا سینگ چھین کر بغیر سینگ والی بکری کو سینگ دیں گے اور کہیں گے کہ اس کو مارلو، حالاں کہ بکری جانور ہے اور جانوروں کے لیے شریعت نہیں آئی ہے، شریعت کے احکام تو ہم انسانوں کے لیے ہیں، لیکن پھر بھی وہاں عدل وانصاف اس طرح ہوگا۔ اسی لیے ہمیں خاص طور پر یہ تعلیم دی گئی ہے۔

آج کل عام طور پر جو فتنے ہورہے ہیں اس کی بڑی وجہ یہی ہے، لہٰذا اس بات کا اہتمام ہو کہ ہم پر جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان کو ادا کریں، اور ہمارے حقوق کی ادائیگی میں سامنے والے کی طرف سے اگر کوتاہی ہورہی ہے تو اگر عافیت کے ساتھ بغیر لڑائی جھگڑے کے مل جاتے ہیں؛ تب تو ٹھیک ہے؛ ورنہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔

بدترین ذمہ دار کی نشانی

۶۵۷:-وعن عائذ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّهُ دَخَلَ عَلَى عُبَيْدِ اللهِ بن زيادٍ، فَقَالَ لَهُ: أَيْ بُنَيَّ! إِنِّي سَمِعْتُ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يقول: إِنَّ شَرَّ الرِّعَاءِ الحُطَمَةُ. فإِيَّاكَ أن تَكُونَ مِنْهُمْ. (متفقٌ عَلَيْهِ.)

ترجمہ:- حضرت عائذ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ عبید اللہ بن زیاد کے یہاں تشریف لے گئے اور (عبید اللہ بن زیاد؛ خلافتِ بنو امیہ کے زمانہ میں کوفہ کا گورنر تھا) اس سے کہا: اے میرے بیٹے! میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بدترین ذمہ دار وہ ہے جو سخت دل اور سخت مزاج ہو، اس لئے تو ایسا بدترین حکمران مت بنیو۔

ایسے حاکم کی طرف اللہ تعالیٰ توجہ نہیں فرمائیں گے

۶۵۸:-وعن أَبِي مريم الأزديِّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ أنّه قَالَ لِمعاوية رضی اللہ تعالیٰ عنہ: سَمِعْتُ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول: مَنْ وَلاَّهُ اللهُ شَيْئاً مِنْ أُمُورِ الْمُسْلِمِينَ، فَاحْتَجَبَ دُونَ حَاجَتِهِمْ وَخَلَّتِهِمْ وَفَقْرِهِمْ، احْتَجَبَ اللهُ دُونَ حَاجَتِهِ وَخَلَّتِهِ وَفَقْرِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. فجعل معاوية رجلاً عَلَى حوائج النَّاسِ. (رواہ أبو داود والترمذی)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو مریم أزدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا- چوں کہ وہ امیر المؤمنین تھے- کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار بنایا (یعنی کسی بھی طرح کی حکمرانی عطا فرمائی) پھر اس نے رکاوٹ اختیار کی اور لوگوں کی حاجت سے اپنے آپ کو چھپائے رکھا، ان کی حاجتیں پوری کرنے کے لیے باہر نہیں آیا، اور نہ کسی کو اپنے تک آنے دیا (یعنی باہر پہرے دار بٹھار کھے، لوگ تو چاہتے ہیں کہ اپنی حاجتیں لے کر اس کے پاس جائیں لیکن وہاں اجازت ہی نہیں ملتی، اور وہ ان کی ضرورتوں اور ان کے فقر کی طرف توجہ نہیں کرتا) تو قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی حاجت کے درمیان رکاوٹ بنیں گے اور اس کی طرف توجہ نہیں فرمائیں گے (جیسا گناہ کیا تھا قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ویسی ہی سزا دی جائے گی) چناں چہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب یہ حدیث سنی تو اس بات کا اہتمام کیا کہ لوگوں کی حاجتوں کے لیے باقاعدہ ایک آدمی مقرر کیا (جو لوگوں کی حاجتوں کی تحقیق کرتا رہے اور ان تک پہنچائے۔ یعنی لوگوں کو خود بھی آنے کی ضرورت نہیں، ان کا آدمی خود ہی جاکر تحقیق کرے اور آکر بتلائے، تاکہ وہ ان کی ضرورتیں پوری کرسکیں)۔

الوالی العادل
انصاف سے پیش آنے والا حکمران

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَأَقۡسِطُوۡا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ

باب کا عنوان

پچھلی مجلس میں بتلایا تھا کہ جو لوگ حکمران اور صاحبِ اختیار ہیں، جن کے پاس پاور س ہیں، وہ اپنی رعایا کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کریں، اس کی تفصیل آچکی تھی۔ آج باب قائم کیا ہے: "اَلْوَالِي الْعَادِلُ" وہ حکمران جو اپنی رعایا کے ساتھ انصاف سے پیش آتا ہو، اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کیسا اجر وثواب ملے گا، اور اس کا اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا مقام ہے۔

میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ہر وہ معاملہ جس کا تعلق دو گروہ اور دو جماعتوں سے ہوتا ہے تو شریعت کی طرف سے دونوں میں سے ہر ایک جماعت کو اس کے مناسب ہدایتیں دی جاتی ہیں، اگر دونوں جماعتیں شریعت کی طرف سے دی گئی ہدایتوں پر عمل کا اہتمام کرتی ہیں؛ تب تو پھر چین ہی چین اور اطمینان ہی اطمینان رہتا ہے۔ اور اگر کوئی ایک جماعت بھی شریعت کی طرف سے بتلائی گئی ان ہدایتوں پر عمل کرتی ہے، تب بھی کوئی فتنہ اور فساد نہیں ہوتا۔ ہاں! اگر دونوں ہی اللہ تعالیٰ کے احکام توڑنے پر تل جائیں اور دونوں میں سے کوئی بھی کسی کا حق ادا کرنے کے لیے تیار نہ ہو؛ تو پھر لڑائی ہوتی ہے۔

یہاں ایسے حکمران کا بیان کیا جا رہا ہے جو عدل وانصاف سے پیش آتا ہو۔ پہلی آیت پیش کی ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡإِحۡسَانِ﴾ اللہ تعالیٰ انصاف اور بھلائی کرنے کا حکم دیتا ہے کہ ہر ایک کا حق پورا پورا ادا کیا جائے۔ اس آیت کی

تفصیل گزشتہ مجلس میں عرض کرچکا ہوں۔

دشمنوں کے معاملہ میں بھی انصاف

﴿وَأَقْسِطُوْا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ انصاف کرو؛ بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ بلکہ قرآنِ کریم میں تو یہاں تک تاکید کی گئی ہے: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى أَلَّا تَعْدِلُوْا، إِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ کسی جماعت کی شناعت اور برائی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کے تقاضوں کو چھوڑ دو۔ یعنی اگر کوئی آدمی آپ کے ساتھ ناانصافی سے پیش آتا ہے تب بھی شریعت آپ کو یہ حکم دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ انصاف کا معاملہ کریں؛ یہی چیز تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ دشمنوں کے معاملہ میں بھی شریعت نے انصاف کے تقاضوں کو پکڑے رہنے کا حکم دیا ہے۔

سایہ دار سات گروہ...... پہلا گروہ

۶۵۹:- وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبي صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قال: سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ: إِمَامٌ عَادِلٌ. وَشَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ اللّٰهِ تَعَالَى. وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ. وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ؛ اجْتَمَعَا عَلَيْهِ، وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ. وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ، فَقَالَ: إِنِّي أَخَافُ اللّٰهَ. وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِيْنُهُ. وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے روز میدانِ حشر میں اپنے سائے میں جگہ

دیں گے جبکہ اللہ کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا:-

[۱]: انصاف کرنے والا حاکم۔

[۲]: وہ نوجوان جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں پرورش پائی۔

[۳]: وہ آدمی جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو۔

[۴]: ایسے دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے اور اللہ کی نسبت پر محبت کی ہو۔ اللہ کی نسبت پر ہی آپس میں ملے، اور اسی نسبت پر جدا ہوئے۔

[۵]: وہ آدمی جسے اونچے منصب وخاندان والی خوبصورت عورت زنا کاری وبدکاری کے لیے دعوت دے، لیکن وہ جواب میں کہے: میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔

[۶]: وہ آدمی جس نے کوئی صدقہ ایسا چھپا کر کیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔

[۷]: وہ آدمی جو تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

افادات:- سات آدمیوں سے مراد مخصوص شخصیتیں نہیں ہیں، بلکہ پوری جنس مراد ہے، جیسے: ''إِمَامٌ عَادِلٌ'' انصاف کرنے والے حاکم کا تذکرہ ہے، تو یہ کسی ایک شخصیت کا نام نہیں ہے، بلکہ جب سے شریعتِ مطہرہ جاری ہوئی ہے تب سے قیامت تک جو بھی آدمی عدل وانصاف کے ساتھ حکمرانی کرے گا، وہ سب اس میں آجائیں گے۔

اس باب میں یہ روایت اسی مناسبت سے لائے ہیں کہ وہ حکمران جس کے ہاتھ میں اختیارات ہیں، اور پہلے بتلا چکا ہوں کہ اختیارات کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں، ایک تو حاکمِ اعلیٰ اور بادشاہِ وقت ہوتا ہے جو سب سے اوپر ہوتا ہے اور اس کی ماتحتی میں مختلف علاقوں اور صوبوں کے حاکم ہوتے ہیں، پھر ان صوبوں کے جو حصے ہیں، مثلاً:

ضلع اور ضلعوں میں تحصیلیں، یہاں تک کہ گھر کا جو سربراہ ہوتا ہے وہ بھی اس گھر کا حاکم کہلاتا ہے، وہ بھی شریعت کی طرف سے اس بات کا پابند ہے کہ اپنے ماتحتوں کے معاملہ میں عدل وانصاف سے کام لے، ناانصافی کا برتاؤ نہ کرے۔ تو پہلا گروہ ہوا ’’إِمَامٌ عَادِلٌ‘‘ انصاف کرنے والا حکمران۔

دوسرا گروہ

’’وَشَابٌّ نَشَأَ فِيْ عِبَادَةِ اللهِ تَعَالَىٰ‘‘ وہ نوجوان جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں پرورش پائی، یعنی اس کی جوانی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں گزری ہو۔ کیوں کہ عام طور پر جوانی میں نفس کے تقاضے اور خواہشات عروج وشباب پر ہوتی ہیں، وہی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف لے جاتی ہیں، اس لیے جو نوجوان ایسے حالات میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اور اس کی عبادت میں اپنے اوقات کو گزارتا ہو، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی بڑی قدر وقیمت ہے۔

تیسرا گروہ

’’وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ‘‘ وہ آدمی جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ایک نماز کی ادائیگی سے فارغ ہو کر گھر، کاروبار، دوکان یا فیکٹری پر آیا اور اپنے کام میں تو لگا، لیکن اس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہے کہ دوسری نماز کا وقت آنے والا ہے، مَیں بروقت کیسے مسجد پہنچوں اور اس نماز کو شریعت کے بتلائے ہوئے صحیح طریقہ سے ادا کروں۔ تو اگرچہ وہ اپنے کاروبار کو بھی انجام دیتا ہے، اپنی دوسری ذمہ داریاں بھی پوری کرتا ہے لیکن اس کا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ مسجد میں لگا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کے فریضہ کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہے۔

چوتھا گروہ

"وَرَجُلانِ تَحَابَّا فی اللہِ اجتَمَعَا عَلَیْہِ, وَتَفرَّقَا عَلَیْہِ"، ایسے دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے اور اللہ کی نسبت پر محبت کی ہو۔ آپس میں ملے تو اللہ ہی کی نسبت پر، اور جدا ہوئے تب بھی اسی نسبت پر۔ اس لیے کہ کچھ ملاقاتیں اور تعلقات وہ ہوتے ہیں جو آدمی اپنی ذاتی اغراض کے پیشِ نظر قائم کرتا ہے۔ اور کچھ تعلقات وہ ہوتے ہیں جو اللہ کی نسبت پر ہوتے ہیں، اس میں کوئی اپنی ذاتی غرض شامل نہیں ہوتی، وہ ملاقات دین کی اور اللہ کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اپنی ذاتی غرض کے لیے تو سب ہی تعلق و محبت کرتے ہیں، لیکن اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت اور تعلق رکھنا، اسی بنیاد پر ملنا اور اسی بنیاد پر جدا بھی ہونا؛ ایسے دو آمیوں کی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قدر و قیمت ہے، اور قیامت کے روز اللہ تبارک و تعالیٰ ایسوں کو اپنے سائے میں جگہ دیں گے

پانچواں گروہ

"وَرَجُلٌ دَعَتْہُ امْرَأَۃٌ ذاتُ مَنْصِبٍ وجمالٍ, فَقَالَ: إنّی أخافُ اللہَ" وہ آدمی جس نے اپنی خواہشات پر ایسا کنٹرول کیا ہے کہ ایسی عورت جو اونچے منصب و خاندان والی ہے اور خوبصورت بھی ہے، اس نے بدکاری کے لیے دعوت دی، تنہائی میں اپنی طرف آمادہ کیا، ایسے موقع پر آدمی عام طور پر اس میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن وہ آدمی جواب میں کہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں، اس کے لیے اس حرکت سے باز رہنے کا ذریعہ صرف اللہ تعالیٰ کا خوف بنا؛ تو قیامت کے روز ایسے آدمی کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں جگہ دیں گے۔

چھٹا گروہ

"وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ" "وہ آدمی جس نے کوئی صدقہ ایسا چھپا کر کیا کہ بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔ اس لیے کہ صدقہ اگر کھل کر کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ اس میں مقصود نام آوری اور شہرت ہو، اس لیے ایسے چھپا کر دیا کہ گویا اس کے دائیں ہاتھ نے خرچ کیا لیکن اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا۔ آدمی کا اس طرح عمل کو انجام دینا انتہائی خلوص کی طرف اشارہ کرتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسا مقبول اور پسندیدہ ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کو بھی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنا سایہ عطا کریں گے۔

ورنہ تو عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ لوگ کھل کر دینے ہی پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ بعد میں بھی ساری دنیا میں اعلانات کرتے پھرتے ہیں کہ میں نے اس کو اتنا دیا اور فلاں کو اتنا دیا۔ اور اگر خدانخواستہ اس کے چشم و ابرو کا خیال رکھنے میں ذرا سی کوتاہی ہوئی تو پھر اس کی خیر نہیں ہوتی۔ اس لیے کہا گیا کہ یہ جو کچھ کر رہا ہے خالص اللہ کے واسطے اور اللہ تعالیٰ سے اپنا اجر و ثواب حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہے؛ اس لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی بڑی قدر ہے۔

ساتواں گروہ

"وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللهَ خَالِياً فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ" "وہ آدمی جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ تنہائی میں اللہ کو یاد کرکے رونا، یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ غایتِ تعلق اور انتہائی محبت اور اس کے خوف و خشیت کی علامت ہے، ایسے آدمی کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دیں گے۔

تو یہ سات قسم کے آدمی ہیں، جن میں نمبر اول پر حضور اکرم ﷺ نے اس حکمران اور صاحبِ اختیار کو شمار کرایا جو انصاف سے کام لے۔ اللہ تعالیٰ نے جس آدمی کو جہاں کہیں بھی کچھ اختیارات دیئے ہوں اور ان اختیارات کی نوعیت جیسی بھی ہو، وسیع پیمانے پر ہو، یا محدود طریقہ پر ہو، اپنے گھر میں ہو، اپنے خاندان میں ہو، اپنی برادری میں بڑا عہدہ اور بڑے اختیارات ملے ہوں، پوری جماعت اور برادری کی سربراہی ملی ہو، یا پورے علاقہ کا حاکم ہو، اور وہ اپنے اختیارات کے حدود اور دائرے میں عدل وانصاف سے کام لیتا ہو، تو ان شاء اللہ اس وعدے کا حقدار ہوگا اور یہ بشارت اس کو حاصل ہوگی۔ اسی طرح اپنے گھر میں اپنے ماتحتوں پر، بیوی بچوں پر اور دوسرے اہلِ خانہ پر جہاں اس کو اختیارات حاصل ہیں، اگر وہ انصاف سے کام لے گا تو اس کے حق میں بھی یہ بشارت پوری ہوگی۔

نور کے منبروں پر ہوں گے

۶۶۰:- وعن عبدِ اللهِ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رسولُ الله ﷺ: إِنَّ الْمُقْسِطِينَ عِنْدَ اللهِ عَلَى مَنَابِرَ مِنْ نُورٍ، الَّذِينَ يَعْدِلُونَ فِي حُكْمِهِمْ وَأَهْلِيهِمْ وَمَا وَلُوا. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: انصاف کرنے والے اللہ تعالیٰ کے یہاں نور کے منبروں پر ہوں گے، جو اپنے فیصلوں اور اپنے گھر والوں کے معاملہ میں اور جن لوگوں کے اوپر ان کو جو اختیارات دیئے گئے ہیں ان اختیارات کو استعمال کرنے کے معاملہ میں عدل وانصاف سے کام لیتے ہیں۔

افادات:- قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو نور کی کرسیوں اور نور

کے منبروں پر بٹھائیں گے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کا اعزاز واکرام ہوگا۔ انصاف کرنے والے کون ہیں؟ جو اپنے فیصلوں اور اپنے گھر والوں کے معاملہ میں اور جن لوگوں کے اوپر اس کو حاکم بنایا گیا ہے اور اختیارات دیئے گئے ہیں ان اختیارات کو استعمال کرنے کے معاملہ میں عدل وانصاف سے کام لیتے ہیں، یعنی بلا وجہ کسی کی جانب داری سے، ظلم وزیادتی اور کسی کو ترجیح دینے سے کام نہیں لیتے، بلکہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، اور ماتحتوں کے حقوق کو پورا پورا ادا کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نور کے منبروں پر بٹھائیں گے۔ اور جو ان تقاضوں کو پورا نہیں کریں گے، ان کے لیے یہ بشارت نہیں ہے۔

بہترین اور بدترین حکمرانوں کی علامت

۶۶۱:-عن عوف بن مالك رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال سمعتُ رسولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یقول: خِيَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُحِبُّونَهُمْ وَيُحِبُّونَكُمْ، وَتُصَلُّونَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّونَ عَلَيْكُمْ. وشِرَارُ أَئِمَّتِكُم الَّذِينَ تُبْغِضُونَهُمْ وَيُبْغِضُونَكُمْ، وَتَلعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ!، قَالَ: قُلْنَا: يَارسول اللهِ! أَفَلاَ نُنَابِذُهُم؟ قَالَ: لاَ، مَا أَقَامُوا فِيكُمُ الصَّلاَةَ. لاَ، مَا أَقَامُوا فِيكُمُ الصَّلاَةَ. (رواه مسلم)

قَوْله: ((تصلّون عَلَيْهِمْ)): تدعون لَهُمْ.

ترجمہ:-حضرت عوف بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: تمہارے حکمرانوں میں بہترین لوگ وہ ہیں جن سے تم محبت کرو، اور جو تم سے محبت کریں، ان کے لیے تم دعائیں کرو اور وہ تمہارے لیے دعائیں کریں۔ اور تمہارے حکمرانوں میں بدترین حکمران وہ ہیں کہ تم ان سے دل میں عداوت رکھو، اور وہ تم سے عداوت رکھیں

تم ان پر لعنت بھیجو، اور وہ تم پر لعنت بھیجیں، وہ تم کو برا کہیں اور تم ان کو برا کہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایسے حکمرانوں کی اطاعت کا پھندا کیا ہم اپنی گردنوں سے اتار نہ دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں! جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز کو قائم کرتے رہیں۔ نہیں! جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز کو قائم کرتے رہیں (وہاں تک ان کو پھینک مت دیجیو۔)

افادات:- دیکھو! آج دنیا کا حال کیا ہے؟ آج کل ہر گھر میں یہی مصیبت ہے۔ اس لیے اپنے گھر والوں میں بھی کون بہترین آدمی ہے اور کون نہیں؛ اس کا اِس سے اچھا کوئی معیار نہیں ہے۔ آدمی اپنے متعلق یہ سمجھنا چاہتا ہو کہ میرا تعلق اپنے ماتحتوں کے ساتھ کیسا ہے؟ تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا بہترین معیار بتلایا کہ وہ آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپ ان سے محبت کرتے ہو۔ وہ آپ کے لیے دعا کرتے ہیں اور آپ ان کے لیے دعا کرتے ہو۔ وہ آپ کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں اور آپ ان کے لیے بے چین ہو جاتے ہو؛ یہ ''خِيَارُ أَئِمَّتِكُمْ'' بہترین حکمران کی علامت ہے۔ اس لیے اگر آپ کو بھی معلوم کرنا ہے کہ اپنے ماتحتوں کے درمیان میں آپ کا معاملہ کیسا ہے؟ آپ کو جو اختیارات دیئے گئے ہیں ان کے استعمال میں آپ صحیح ہیں یا غلط؟ تو دیکھ لو کہ آپ کے ماتحت آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپ بھی ان کے ساتھ محبت کرتے ہو؟ آپ ان کو دل سے چاہتے ہو اور وہ بھی آپ کو دل سے چاہتے ہیں؟ آپ ان کے لیے دل سے دعائیں کرتے ہو اور وہ بھی آپ کے لیے دل سے دعائیں کرتے ہیں؟ اگر آپ کو ذرا سی گزند پہنچے تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں اور رونے لگتے ہیں آپ کے لیے دعائیں کرنے لگتے ہیں، اور اگر ان کو کچھ ہو جائے تو آپ بے چین ہو جاتے ہو، ان کے لیے آپ دعائیں کرنے لگ جاتے ہو، وہ آپ سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اور آپ بھی ان سے محبت رکھتے ہو؟ اگر ایسا ہے تب تو سمجھ جاؤ کہ معاملہ

برابر ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے، تو سیدھی بات ہے کہ معاملہ الٹا ہے۔

ویسے تو ہر آدمی اپنے طور پر یہی دعویٰ کرتا ہے کہ میرا معاملہ برابر ہے، اپنے آپ کو کون غلط کہتا ہے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی یہ علامت بتلادی۔

نظامِ سلطنت کے بقاء کی اہمیت

جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدترین حکمرانوں کی یہ علامت بتلائی کہ تم ان سے بغض رکھو، وہ تم سے بغض رکھیں، تم ان سے دشمناوٹ رکھو، وہ تم سے دشمناوٹ رکھیں، تم ان کو برا بھلا کہو اور لعنت ملامت کرو، اور وہ تم کو برا بھلا کہیں، تم پر لعنت ملامت کریں، تم ان کے لیے بددعائیں کرو اور وہ تمہارے لیے بددعائیں کریں، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ایسے حکمرانوں کی اطاعت کا پھندا ہم اپنی گردنوں سے اتار نہ دیں؟ یعنی جو حکمران ایسے ہوں تو ان کی بات ماننے کی کیا ضرورت ہے، ان کو گولی مارو؛ ہم ان سے بغاوت نہ کرلیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔

دیکھو! شریعت نظام کو باقی رکھنے کا کتنا اہتمام کرتی ہے! ان کی علامت تو بتلائی گئی، لیکن اس کے باوجود آگے کہہ رہے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جو ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے، اس سے آپ اپنے آپ کو نکال نہیں سکتے، جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز کو قائم کرتے رہیں وہاں تک ان کو پھینک مت دیجیو۔ یعنی یہ حکمران جب تک تھوڑا بہت بھی دین کو قائم کر رہے ہیں، نمازیں قائم کر رہے ہیں، ظاہری طور پر دین پر ہیں، تو پھر ان سے ان کی اطاعت کا جو عہد و پیمان آپ نے کیا ہے اس کو چھوڑ نہیں سکتے۔ ہاں! اگر وہ کفر میں مبتلا ہو جائیں، بلکہ بعض روایتوں میں یہاں تک ہے: "إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللهِ فِيهِ بُرْهَانٌ" (بخاری، باب قولِ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ستَرَوْنَ بَعْدِي أُمُورًا)

تُنْكِرُونَهَا. حديث رقم: ٤٠٥٦) جب کھلم کھلا کفر کرنے لگیں، اور بالکل اسلام سے ہٹ جائیں تو پھر تمہارے اوپر ان کی اطاعت کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ شریعت نے حکمرانوں کی زیادتیوں کے باوجود ان کی اطاعت سے نکلنے کی اجازت نہیں دی۔

یہی معاملہ گھر کے ذمہ دار کا ہے کہ اگر گھر کے بڑے کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہے تو شریعت یہ ضرور کہے گی کہ وہ غلطی پر ہے، اور اس کی علامتیں بھی بتلادیں، لیکن اس کے باوجود آپ کو یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ آپ ان کی اطاعت سے نکل جائیں، آپ کو تو ہر حال میں ان کی اطاعت کرتے رہنا ہے۔

تین جنتی

۶۶۲:- وعن عِياضِ بن حِمارٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يقول: أَهْلُ الْجَنَّةِ ثَلاثَةٌ: ذُو سُلْطَانٍ مُقْسِطٌ مُوَفَّقٌ، وَرَجُلٌ رَحِيمٌ رَقِيقُ الْقَلْبِ لِكُلِّ ذِي قُرْبَى وَمُسْلِمٍ، وَعَفِيفٌ مُتَعَفِّفٌ ذو عِيَالٍ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جنت والے تین ہیں؛ ایک تو وہ حکمران جس کے پاس پاور ہے پھر بھی وہ انصاف کرنے والا ہے، اور اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کی توفیق دی گئی ہے۔ دوسرا وہ آدمی جو ہر رشتہ دار اور مسلمان کے لیے مہربان اور نرم دل ہے۔ اور تیسرا وہ بال بچے والا جو اپنے آپ کو سوال کے تقاضوں سے بچاتا ہو۔

افادات:- بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی اس کو ڈانٹتے ہیں کہ ارے یار! تم اتنے میٹھے کیوں بنتے ہو، سب لوگ تم کو ہڑپ کر جائیں گے (خود سے تو کچھ بھلائی ہوتی نہیں، اور دوسرے کچھ کرتے ہیں تو ان کو بھی روکنے کی کوششیں کی

جاتی ہیں) تب بھی وہ کہتا ہے کہ جس کو جو کرنا ہے اس کو وہ کرنے دو، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بڑا اجر ہے۔

اور وہ بال بچے والا جو اپنے آپ کو سوال کے تقاضوں سے بچاتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ چوں کہ وہ بال بچے والا ہے اس لئے یہ احتمال تھا کہ وہ اپنی ضرورتوں کی زیادتی کی وجہ سے کسی کے سامنے اپنی ضرورتیں پیش کرے، لیکن وہ کسی سے سوال نہیں کرتا، جو ضرورت ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی سے مانگتا ہے؛ تو ایسا آدمی بھی جنتی ہے۔

وُجوبُ طَاعَةِ وُلاَةِ الأُمُورِ فِيْ غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيْمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ

حاکموں کی اطاعت کے احکام

(مجلس ۱)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حاکم کے حکم دینے کی وجہ سے جائز کام واجب ہوجاتا ہے

اس باب میں یہ بتلاتے ہیں کہ رعایا پر اپنے حکمرانوں کی اطاعت کن چیزوں میں ضروری ہے؟

حکمرانوں کی طرف سے دیا جانے والا کام گناہ کا نہ ہو، بلکہ جائز کام ہو تو حاکم کی حکمرانی کی وجہ سے وہ جائز کام واجب کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ ماں باپ کا بھی مسئلہ یہی ہے، اس لیے ماں باپ اگر اولاد کو ایسے کام کا حکم دیں جو جائز ہے، تو ماں باپ کے حکم دینے کے بعد وہ کام واجب ہوجاتا ہے۔

ماں باپ کے لیے اہم نصیحت

اسی لیے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ماں باپ کو چاہیے کہ اپنے الفاظ کو استعمال کرنے میں احتیاط سے کام لیں، اگر اولاد سے کوئی کام کروانا چاہتے ہیں تو یوں نہ کہیں کہ ایسا کرو۔ اس لیے کہ اگر اولاد وہ کام نہیں کرے گی تو ماں باپ کی حکم عدولی کرنے کی وجہ سے گنہگار ہوگی اور یہ حرکت نافرمانی قرار دی جائے گی۔ اور ماں باپ کی نافرمانی پر جو وعیدیں ہیں اس کی حق دار بن جائے گی اور مصیبتوں میں پڑے گی اور کوئی ماں باپ اپنی اولاد کے لئے ایسا نہیں چاہتے۔ لہٰذا ماں باپ کو یوں کہنا چاہیے کہ: بیٹا! ایسا ہوجائے تو اچھا ہے۔ اگر اس طرح ہوجائے تو ٹھیک ہے۔ اور اولاد کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ ماں باپ کی یہ خواہش ہے، اگرچہ وہ صاف لفظوں میں حکم نہیں دے رہے ہیں، لیکن ان کی منشاء یہی ہے، اور ان کا جی یہی چاہتا ہے تو اس کے مطابق عمل کرے۔

بہرحال! جس کو بھی آپ پر حکمران اور سربراہ بنایا گیا ہے، اس کی طرف سے کسی ایسے کام کا حکم دیا جائے جو گناہ نہیں ہے، بلکہ جائز ہے؛ تو اس حکمران کے حکم کے نتیجہ میں وہ کام ضروری اور واجب ہوجاتا ہے۔

سربراہ کی بات ماننے کے حدود

ایک بات یاد رکھیے کہ سربراہی کی نوعیتیں مختلف ہیں۔ کچھ سربراہی محدود ہوتی ہے، اور کسی کو عام سربراہی حاصل ہوتی ہے۔ جیسے: حاکم اعلیٰ اور پورے ملک کے بادشاہ کو عمومی سربراہی حاصل ہے۔ بعضوں کو مختلف شعبوں میں سربراہی حاصل ہوتی ہے، مثلاً: آپ نے کسی کے یہاں ملازمت اختیار کی اور اس کو اپنا بڑا مان لیا، تو وہ مالک اور سیٹھ اگر اس شعبہ سے متعلق کسی جائز کام کا حکم کرتا ہے تو آپ کے لیے اس کا حکم ماننا ضروری ہے۔ لیکن اگر وہی سیٹھ آپ کو اس شعبہ سے ہٹ کر کسی دوسرے کام کے متعلق کہتا ہے، مثلاً: آپ کا سیٹھ آپ کو یوں کہے کہ تو تیری بیوی کو طلاق دیدے؛ تو وہاں سیٹھ صاحب کا حکم نہیں مانا جائے گا۔ سیٹھ صاحب کا حکم دوکان، فیکٹری اور آفس سے متعلق جو بھی جائز کام ہیں، وہیں تک مانا جائے گا۔ اگر ناجائز کام یا شریعت کے خلاف کسی بات کے لیے کوئی بھی کہے؛ تو اس پر عمل کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

نافرمانی میں فرمانبرداری نہیں

"وَتَحْرِيمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ" گناہ اور نافرمانی کے کاموں کا حکم اگر بادشاہِ وقت بھی دے، اور باقاعدہ فرمان جاری کردے؛ تب بھی اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ جتنے بھی حکمران ہم پر بڑے بنائے گئے ہیں، ہم ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے ہی کرتے ہیں۔ میں پہلے بھی کسی موقع پر بتلا چکا ہوں کہ

مؤمن کا اصل تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، ایک آدمی جب یہ کہتا ہے کہ میں ایمان لایا تو اس نے اپنا تعلق اللہ تعالیٰ سے جوڑ دیا، اب اُدھر سے جو کہا جائے گا وہی کیا جائے گا۔ اولاد ماں باپ کی فرمانبردار اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ماں باپ کی فرمانبرداری کا حکم دیا ہے۔ آدمی اپنے بڑوں کی عزت اور ان کا احترام اس لیے کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اپنے بڑوں کی عزت واحترام کرو، جو آدمی ایسا نہیں کرتا وہ برا سمجھا جاتا ہے۔

اس طرح بیوی کا حق ادا کرتا ہے، اس کی فرمائشیں حق سمجھ کر اس لیے پوری کرتا ہے کہ شریعت نے اس کے حقوق کے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ بیوی شوہر کی بات اس لیے مانتی ہے کہ جس پر وہ ایمان رکھتی ہے اس نے حکم دیا ہے کہ شوہر کی اطاعت کرو، اولاد پر ماں باپ شفقت کا معاملہ کرتے ہیں اور ان کی ضرورتوں کا خیال اس لیے رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ جب اصل بات یہ ہے تو اب وہی شوہر، وہی ماں باپ، وہی بیوی، وہی اولاد؛ کوئی ایسی حرکت کرنے کے لیے کہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو، اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ہو؛ تو ہم کہیں گے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے کہنے سے تمہاری بات مانتے تھے، اب اگر تم ہم کو اللہ تعالیٰ ہی سے توڑنا چاہتے ہو، تو یہ کسی حال میں قابلِ برداشت نہیں ہوگا۔ معلوم ہوا کہ مؤمن کا اصل رشتہ اور تعلق اللہ تعالیٰ سے ہی ہوتا ہے۔

مؤمن کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کی مثال

میں نے مثال بھی دی تھی کہ آپ کے گھر میں جو فون ہوتا ہے اس کا کنکشن ٹیلیفون ایکسچینج کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی ٹیلیفون ایکسچینج کے ساتھ دوسرے بہت سارے فون بھی جڑے ہوئے ہوتے ہیں، یہاں تک کہ آپ کے پڑوس میں مکان ہے جس کی

دیواریں بالکل آپ کے گھر سے لگی ہوئی ہیں، اگر آپ اس کے فون پر بھی کال (Call) کریں گے تو وہ سیدھی اس کے فون پر نہیں جائے گی، بلکہ پہلے ٹیلیفون ایکسچینج جائے گی اور وہاں سے اُدھر آئے گی۔ وہ جواب دے گا تو وہ بھی ڈائرکٹ (Direct) آپ کے فون پر نہیں آئے گی بلکہ اِنڈائرکٹ (In Direct) آئے گی۔ اگر آپ کا تعلق ٹیلیفون ایکسچینج سے ختم ہو جائے گا تو پڑوسی سے بھی ختم ہو جائے گا، حالاں کہ وہ بالکل پڑوس میں ہے، لیکن ایکسچینج کے واسطے سے بات ہو رہی ہے۔ ایسے ہی جن جن لوگوں کے ساتھ مؤمن کا تعلق ہے وہ اللہ تعالیٰ کے واسطے سے ہے، درمیان میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہی واسطہ ہے۔ اس لیے چاہے باپ ہو، یا شوہر ہو، یا کوئی اور بڑا ہو؛ اگر وہ کسی ایسے کام کے کرنے کا حکم دیتے ہیں جو ناجائز ہے، شریعت نے جس کام کی اجازت نہیں دی ہے، تو ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی، اور نہ کرنے پر کوئی گناہ بھی نہیں ہوگا، بلکہ آدمی کے لیے لازم اور ضروری ہے کہ ایسا کام نہ کرے، اگر ایسا کام کرے گا تو گنہگار ہوگا۔

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں

بعض مرتبہ لوگ آ کر کہتے ہیں کہ ابّا ایسی بات کا حکم دیتے ہیں جو گناہ ہے، اور جب میں نہیں مانتا تو ابّا کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ میری بات مانو۔ پھر بھی میں نہیں مانتا تو ابّا ناراض ہو کر مجھے بددعا دیتے ہیں؛ اب مَیں کیا کروں؟ مَیں ان سے کہتا ہوں کہ: بھائی! ابّا کی بددعا کو عمل میں کون لائے گا؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی عمل میں لائیں گے۔ اگر ابّا کے ہاتھ میں کچھ ہوتا تو وہ کچھ کر کے نہ بتلاتا؟ صرف بددعا کر کے چپ چاپ کیوں بیٹھا رہتا؟ معلوم ہوا کہ بددعا کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی سے

کہہ رہا ہے کہ: اے اللہ! یہ میری بات نہیں مانتا ہے، اس لیے اس کا ایسا کرڈالیو۔ اور اللہ تعالیٰ بھی جانتے ہیں کہ وہ کس بنیاد پر ایسا کہہ رہا ہے، اس نے میرے ایک بندہ کو میرے ہی حکم کی خلاف ورزی کرنے کا حکم دیا تھا، اور اس نے وہ بات نہیں مانی تھی، اس پر وہ بددعا کر رہا ہے؛ تو اب اس کی بددعا تھوڑے ہی قبول کی جائے گی؟ لہٰذا ایسے موقع پر ذرا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ......

۶۶۳: عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِيمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ، إِلَّا أَنْ يُؤْمَرَ بِمَعْصِيَةٍ، فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی بھی حکمران کی طرف سے جب حکم دیا جائے، تو مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس کو سنے مانے اور اس پر عمل کرے، چاہے جو چیز کرنے کے لیے کہی گئی ہے وہ اس کی طبیعت کو پسند ہو، یا ناپسند ہو (بس صرف یہ دیکھا جائے گا کہ گناہ کے کام کا حکم تو نہیں ہے، اگر کسی جائز چیز کا حکم ہے، تو چاہے آپ کی طبیعت کو پسند ہو یا نہ ہو، طبیعت اس کے لیے آمادہ ہو یا نہ ہو؛ اس کو ماننا ضروری ہے۔ ہاں!) اگر گناہ کا حکم دیا جائے تو (آپ ادب کے ساتھ بتلا دو کہ آپ کی) یہ بات سننے اور عمل کے قابل نہیں ہے۔

۶۶۴:- وعنه قَالَ: كُنَّا إِذَا بَايَعْنَا رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، يَقُولُ لَنَا: فِيمَا اسْتَطَعْتُمْ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب ہم نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر (کسی بھی حاکم کی بات) سننے اور اس کو ماننے کے بارے میں عہد کرتے تھے تو آپ یہ

قید لگادیا کرتے تھے کہ جتنی طاقت وقدرت میں ہوگی (اتنی ضرور سنیں گے اور مانیں گے)۔

......جاہلیت کی موت مرے گا

۶۶۵:- وعنه قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله ﷺ يقول: مَنْ خَلَعَ يَداً مِنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلاَ حُجَّةَ لَهُ، وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فى عُنُقِهِ بَيْعَةٌ، مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً. (رواه مسلم)

وفى رواية لَهُ: وَمَنْ مَاتَ وَهُوَ مُفَارِقٌ لِلجَمَاعَةِ، فَإِنَّهُ يَمُوتُ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً.

((المِيتَةُ)) بكسر الميم.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ میں نے نبیٔ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس نے اپنے امیر اور حاکم کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملے گا کہ اپنے اس جرم کے اوپر معذرت کے واسطے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی (یعنی اس کے پاس کوئی عذر اور دلیل ایسی نہیں ہوگی جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو اپنے حاکم کی نافرمانی کی سزا سے بچا سکے۔ جب اسلامی حکومت ہوتی ہے تو حکومت کا جو حکمرانِ اعلیٰ اور بادشاہِ وقت ہوتا ہے، لوگ اس کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، ہاتھ میں ہاتھ دے کر وعدہ اور عہد و پیمان کرتے ہیں کہ ہم آپ کی اطاعت کریں گے، آپ کا حکم مانیں گے۔ تو حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ) جو آدمی ایسی حالت میں مرا کہ اس نے کسی ایسے مسلمان حاکم (جس کو باقاعدہ حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا ہے اس) کے ہاتھ پر اطاعت کی بیعت نہیں کی؛ تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

افادات:- زمانۂ جاہلیت میں اس طرح کا کوئی نظام نہیں تھا اور جس وقت

نبیٔ کریم ﷺ جزیرۃ العرب میں مبعوث ہوئے اس وقت بھی کوئی بادشاہت نہیں تھی، ہر ہر قبیلے کا اپنا اپنا الگ الگ نظام ہوتا تھا، اور ہر ہر قبیلے میں مختلف سردار ہوتے تھے، کوئی اِس کی مان رہا ہے، کوئی اُس کی مان رہا ہے، کسی ایک کی اطاعت وفرمانبرداری پر کسی کا اتفاق نہیں تھا، لیکن اسلام نے آکر پورا ایک نظام قائم کیا اور ایک آدمی کی اطاعت کے لیے سب کو آمادہ کیا، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی بغیر بیعت کے انتقال کرے گا تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

ہر حکمران کی بات سنو اور مانو؛ چاہے......

۶۶۶:- وعن أنسٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: اسْمَعُوا وأَطِيعُوا، وَإنِ استُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ، كَأَنَّ رأْسَهُ زَبِيبَةٌ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اپنے حکمرانوں کی بات سنو اور اس پر عمل کرو، چاہے تم پر کسی حبشی غلام کو حاکم بنایا جائے اور وہ بھی ایسا حبشی غلام ہو کہ جس کا سر اتنا چھوٹا ہو جیسے کشمش (کالی دراک) ہوتی ہے۔

افادات:- بعض حبشی ایسے ہوتے ہیں جن کے سر چھوٹے ہوتے ہیں۔ تو ویسے بھی عرب اور تمام اقوام میں حبشی سب سے کمتر سمجھے جاتے ہیں، اور اس میں بھی جو غلام ہو تو وہ اور زیادہ کمتر سمجھا جاتا ہے، اور پھر وہ غلام بھی چھوٹے سر والا ہو، تو اس کی تو کوئی وقعت ہی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر حاکمِ اعلیٰ کی طرف سے کسی ایسے غلام کو بھی کسی جگہ کا حاکم بنا دیا جائے جو پہلے غلام تھا؛ تو اس کی اطاعت ضروری ہے۔

ویسے یہ مسئلہ اپنی جگہ پر الگ ہے کہ جو خود غلام ہو اس کو کسی طرح کی حکمرانی سونپی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس کو کسی ماتحت جگہ کا حاکم بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ یہاں

مطلب یہ ہے کہ پہلے وہ غلام تھا، اب غلامی سے آزاد ہو چکا ہے، لیکن سیاہ فام ہے اور ظاہری شکل وصورت اور جسم کے اعتبار سے ایسا نہیں کہ جس کو دیکھ کر کسی کے دل میں اس کی وقعت پیدا ہوتی ہو، ایسے آدمی کو بھی اگر تمہارے اوپر نگران اور حاکم مقرر کر دیا گیا ہو تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی بات بھی کو سنو اور مانو۔

ہر حال میں مانو

۶۶۷:- وعن أَبی هریرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: عَلَيْكَ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِى عُسْرِكَ وَيُسْرِكَ، وَمَنْشَطِكَ وَمَكْرَهِكَ، وَأَثَرَةٍ عَلَيْكَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہارے لیے ضروری ہے کہ اپنے حکمران کی بات سنو اور اس کی اطاعت اور فرماں برداری کرو، فقیری کی حالت میں ہو یا مالداری کی حالت میں ہو (ایسا نہیں کہ جیب خالی ہے تو حکم مانتے رہے، لیکن جب دو پیسے آ گئے تو ماننے کے لیے تیار نہیں) اور تمہاری طبیعت اس حکم کو ماننے کے لیے آمادہ ہو یا نہ ہو (تمہارا موڈ ہو یا نہ ہو) اور تمہارے مقابلہ میں جب دوسروں کو ترجیح دی جائے (تب بھی ماننا ضروری ہے)

افادات:- "مَنْشَطِكَ وَمَكْرَهِكَ" کا مطلب یہ ہے کہ ہر حال میں ماننا ہے۔ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ موڈ میں آئے تو اپنے ابّا کی بات پر عمل کر لیا، ورنہ نہیں کیا، ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ان کی بات کو تو ہر حال میں ماننا ہی ہے، بس شرط ایک ہی ہے جو اوپر گزر چکی کہ گناہ کے کام کا حکم نہ دیا جا رہا ہو۔

......تو پھر تم میں اور اجنبی میں فرق ہی کیا؟

"وَأَثَرَةٍ عَلَيْكَ"، ایک تو یہ کہ ابّا آپ کو خوب پیسے دے رہے ہیں، کھلا پلا رہے

ہیں، اس وقت آپ ابّا کی بات مان رہے ہیں، اسی طرح حاکم کی طرف سے خوب نوازشات کا معاملہ چل رہا ہے، داد ودہش ہورہی ہے، اس وقت تو مانتے ہیں، حالاں کہ ایسے وقت تو سب ہی مانتے ہیں، لیکن جب آپ کے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دی جارہی ہے، مثلاً: چار بھائی ہیں، تین بھائیوں کے ساتھ ابّا بہت اچھا معاملہ کررہے ہیں، آپ کو تو ایک پائی بھی نہیں دیتے، ان کو اچھے اچھے کپڑے لاکر دے رہے ہیں، لیکن آپ کو کبھی اچھا سوٹ لاکر نہیں دیا، ان کی ساری فرمائش پوری ہوتی جارہی ہیں، اور آپ کی ایک فرمائش بھی پوری نہیں کی؛ پھر بھی ابّا یہ حکم دیں کہ تمھیں ایسا کرنا ہے، تو حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ان کی بات مانو اور ویسا ہی کرو۔ یوں مت کہنا کہ ان تینوں بھائیوں کی باتیں تو مانی جائیں اور ان کی فرمائشیں پوری کی جائیں، میرا تو آج تک کبھی کچھ کیا ہی نہیں؛ اب میں آپ کی بات کیسے مانوں؟ ارے بھائی! اس بنیاد پر بات مانی جائے گی تو پھر تمہارے اور اجنبی میں فرق ہی کیا رہا؟ تم پر جو اطاعت ضروری قرار دی گئی وہ تو ہر حال میں ضروری ہے، بس شرط ایک ہی ہے کہ گناہ کے کام کے لیے نہ کہا جائے۔

کسی حاکم یا بڑے کی طرف سے کسی کے ساتھ کوئی خصوصی معاملہ کیا جارہا ہے جس کی وجہ سے وہ اطاعت کرتا ہے، تو وہ تو اطاعت کرے گا ہی، لیکن آپ کے ساتھ کوئی خصوصی معاملہ نہیں کیا بلکہ آپ کے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دی جارہی ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی جماعت کا چیرمین دوسرے کو ترجیح دے رہا، اور آپ کی بات کی طرف دھیان نہیں دیتا، تب بھی چیرمین چوں کہ چیرمین (Chair Man) ہے، اس لیے آپ بات مان رہے ہیں؛ تب تو برابر ہے۔ ورنہ آپ کو اگر لڈّو کھلا رہا ہے اور آپ اس کی بات مان رہے ہیں؛ تو کیا فرق پڑتا ہے۔

کہنے کا حاصل یہی ہے کہ اپنے حکمران اور سربراہ کی اطاعت ہر حال میں کرنی

ہے، چاہے وہ آپ کے ساتھ اچھا سلوک رکھتا ہو، یا نہ رکھتا ہو۔ آپ کے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دیتا ہو تب بھی آپ کو اس کا حکم ماننا ہے، بس ایک شرط ہے کہ وہ کوئی گناہ کے کام کا حکم نہ دیتا ہو۔ اور اسی شعبہ سے متعلق حکم کو ماننا لازم ہے جس شعبہ میں آپ اس کے ماتحت ہیں جیسا کہ میں نے اوپر مثال دے کر بتلایا تھا۔

وُجوبُ طَاعَةِ وُلاَةِ الأُمُورِ فِيْ غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيْمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ

حاکموں کی اطاعت کے احکام

(مجلس ۲)

یکم ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۲۷/جنوری ۲۰۰۱ء

بنیادی اصول

باب کا عنوان قائم کیا ہے کہ: حکمران اگر ایسا حکم دے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہوتی ہو، تو ان کے حکم کو ماننا واجب اور ضروری ہے۔ اور اگر وہ کوئی ایسا حکم دے جس کے بجالانے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی ہوتی ہے، تو پھر اس کو پورا کرنا اور اس پر عمل کرنا حرام ہے۔ اسی مناسبت سے روایتیں لا رہے ہیں۔

پہلے بھی میں نے بتلایا تھا کہ مسلمان کا اصل تعلق تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے، جب وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے تو اسی کے حکم سے دوسرے لوگوں کی اطاعت کرتا ہے، اگر ماں باپ کا حکم مانتا ہے تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کی اطاعت کو ضروری قرار دیا ہے۔ بیوی اگر شوہر کا حکم مانتی ہے تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے شوہر کی اطاعت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اسی طرح کوئی ماتحت اپنے سربراہ کا کوئی حکم مانتا ہے تو وہ اسی لیے کہ شریعت نے اس کی اتباع اور فرمانبرداری کا حکم دیا ہے، مؤمن کا اصل تعلق اور رشتہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ ہی ہے، اس کے بعد وہ ان سارے لوگوں کے احکام کو اللہ تعالیٰ ہی کے حکم کی وجہ سے مانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے احکام کو اپنے اپنے دائرے اور حدود میں واجب الاطاعت قرار دیا ہے۔

اس میں بنیادی اصول بتلادیا گیا تھا کہ جب کسی کا کوئی حکم ایسا ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو تو پھر ان کے کسی حکم پر عمل نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے ان کے حکم پر عمل کرتے تھے، بلکہ ان کے حکم کی تعمیل کو اپنی سعادت سمجھتے تھے، لیکن جب وہی ایسی بات کا حکم دے رہے ہیں جس پر عمل کرنے کے نتیجہ میں

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہے؛تو پھران کے حکم کو ہم رد کردیں گے۔

اُمتِ محمدیہ کی فتنوں سے سلامتی

۶۶۸:-وعن عبدِاللهِ بن عمرو رضی اللہ عنہما قَالَ: كنا مَعَ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم في سَفَرٍ فَنَزَلْنَا مَنْزِلاً ، فَمِنَّا مَنْ يُصْلِحُ خِبَاءَهُ ، وَمِنَّا مَنْ يَنْتَضِلُ ، وَمِنَّا مَنْ هُوَ في جَشَرِهِ ،إذْنَادَى مُنَادِي رسولِ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم : الصَّلاةُ جَامِعَةٌ.فَاجْتَمَعْنَا إلَى رسولِ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَقَالَ: إنَّهُ لَمْ يَكُنْ نَبِيٌّ قَبْلِي إلاَّ كَانَ حَقّاً عَلَيْهِ أنْ يَدُلَّ أُمَّتَهُ عَلَى خَيْرِ مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ ، وَيُنْذِرَهُمْ شَرَّ مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ .وَإنَّ أُمَّتَكُمْ هذِهِ جُعِلَ عَافِيَتُهَا في أوَّلِهَا ،وَسَيُصيبُ آخِرَهَا بَلاَءٌ وَأُمُورٌ تُنْكِرُونَهَا ،وَتَجِيءُ فِتنَةٌ يُرَقِّقُ بَعْضُهَا بَعْضاً ،وَتَجِيءُ الفتنَةُ فَيقُولُ المُؤْمِنُ: هذه مُهلكتي، ثُمَّ تنكشفُ، وتجيء الفتنةُ فيقولُ المؤمنُ: هذِهِ هذِهِ. فَمَنْ أحَبَّ أنْ يُزَحْزَحَ عَنِ النَّارِ، ويُدْخَلَ الجَنَّةَ،فَلْتَأتِهِ منيَّتُهُ وَهُوَ يُؤْمِنَ باللهِ واليَوْمِ الآخِرِ ،وَلْيَأتِ إلَى النَّاسِ الَّذِي يُحِبُّ أنْ يُؤتَى إلَيْهِ.وَمَنْ بَايَعَ إمَاماً فَأعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهِ،وَثَمَرَةَ قَلْبِهِ،فَلْيُطِعْهُ إن استَطَاعَ،فإنْ جَاءَ آخَرُ يُنَازِعُهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَ الآخَرِ .

ترجمہ مع مختصر تشریح:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے،دورانِ سفر آرام کی ضرورت پیش آئی تو ہم نے ایک جگہ پر قیام کیا۔اس دوران کوئی آدمی اپنے خیمے کو درست کر رہا تھا،کوئی آدمی نیزے بازی کی مشق کر رہا تھا،اور کوئی آدمی اپنے مویشیوں میں مشغول تھا(اس لئے کہ جب کسی جگہ پر ٹھہرتے ہیں تو ہر ایک اپنی اپنی ضرورتیں پوری کرلیتا ہے)اتنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منادی نے آواز دی: اَلصَّلوٰةُ جَامِعَةٌ (حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کو کسی خاص بات بتلانے

کے لئے یا کسی خاص پیغام کو ان تک پہنچانے کے لئے اگر فوری طور پر جمع کرنا چاہتے تو اس کے لئے ان الفاظ میں اعلان کراتے تھے۔ مقصد ہوتا تھا کہ فوراً آجاؤ) چناں چہ ہم لوگ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جمع ہو گئے اس وقت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: مجھ سے پہلے جو بھی نبی آئے ان پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ ضروری قرار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی امت کو ہر ایسی چیز کی طرف رہنمائی کریں جسے اُس امت کے لئے بھلائی کا ذریعہ سمجھتے ہوں۔ اوران کو اس برائی سے ڈرائیں جو ان کے حق میں وہ بری سمجھتے ہوں۔ پھر ارشاد فرمایا: ہماری اس امت -یعنی امتِ محمدیہ- کی فتنوں سے سلامتی اللہ تعالیٰ نے اس کے شروع میں رکھی ہے، البتہ اس امت کے بعد میں آنے والے حصے اور طبقے کو کچھ آزمائشیں اور کچھ ایسی چیزیں پیش آئیں گی جن کو تم اُوپرا اور اَجنبی سمجھتے ہو۔ اس امت کے آخری زمانہ میں ایسے فتنے آئیں گے کہ ایک فتنہ دوسرے فتنے کو کم کر کے دکھلائے گا اور صورتِ حال یہ ہوگی کہ ایک فتنہ آئے گا اور ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ جس میں آدمی کے لیے حق و باطل میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا، ایسے موقع پر ایک مؤمن یوں کہے گا کہ یہ فتنہ تو مجھے ہلاک ہی کر ڈالے گا (مطلب یہ ہے کہ ہر بعد میں آنے والا فتنہ پہلے والے فتنہ سے بڑا ہوگا۔ ایک فتنہ جب آئے گا تو اس کو دیکھ کر آدمی یوں سمجھے گا کہ یہ فتنہ بہت بڑا ہے اور اس فتنہ کی کیفیت کو دیکھ کر مؤمن اپنے ایمان کے متعلق خطرہ محسوس کرے گا اور یوں کہے گا یہ مجھے ہلاک کر دے گا۔ پھر جب وہ فتنہ ختم ہو جائے گا اور وہ حالات دور ہو جائیں گے) اس کے بعد دوسرا فتنہ آئے گا تو اس وقت مؤمن کہے گا کہ بس یہی وہ فتنہ ہے جو مجھے ہلاک کر دے گا اور میرے ایمان کو ختم کر دے گا۔ اس لیے جو آدمی یہ چاہتا ہو کہ اس کو جہنم سے دور کیا جائے اور جنت میں داخل کیا جائے؛ اس کو چاہیے کہ اس کی موت ایسی حالت میں آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اور لوگوں کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ اور جس کسی نے حاکمِ وقت امام یعنی حاکمِ اَعلیٰ، بادشاہِ وقت

کے ہاتھ پر اطاعت وفرمانبرداری کی بیعت کی اور بیعت کے وقت اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دل سے عہد و پیمان اور اقرار بھی کیا، تو اب اپنی طاقت کے مطابق اس حکمران کی پوری پوری اطاعت کرے۔ اس کے بعد اگر کوئی دوسرا آدمی حکومت اور تاج وتخت کا دعویدار کھڑا ہو جائے تو جو بعد میں کھڑا ہوا ہے اس کی گردن اڑا دو۔

افادات:- اس روایت سے مندرجۂ ذیل امور معلوم ہوئے:-

[۱]: ہر نبی کا یہ فریضہ تھا کہ جو کام اور طریقہ اپنی امت کے لئے باعثِ خیر جانتا ہو، اپنی امت کو اس طریقہ اور اس کام کی طرف رہنمائی کرے اور دعوت دے، اور جو کام اور طریقہ اپنی امت کے لئے غلط، برا، مضر اور نقصان دہ سمجھتا ہو، اس سے اپنی امت کو ڈارئے اور اس کام سے بچائے۔ حضرات علمائے کرام بھی چونکہ انبیاء کے جانشین ہیں، اس لئے ان کا بھی یہی فریضہ ہے کہ لوگوں کو وہ چیز بتلائیں جو دین اور شریعت کی تعلیمات کے اعتبار سے بھلائی اور خیر کا ذریعہ ہیں۔ اور جو چیزیں لوگوں کے حق میں مضر اور نقصان دہ ہوں، ان سے روکنا بھی اہلِ علم کے لیے ضروری ہے۔ یہ کام علماء کے لیے ضروری اور واجب ہے، خاموشی اختیار کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی

[۲]: اس امت کا ابتدائی دور وہ ہے جس میں یہ امت فتنوں سے محفوظ رہے گی، ظاہر ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ تشریف فرما تھے، آپ کے بعد حضراتِ خلفائے راشدین کا زمانہ تھا، تو اس وقت یہ اُمت دینی فتنوں سے محفوظ تھی۔ البتہ اس امت کے بعد میں آنے والے حصے اور طبقے کو کچھ آزمائشیں اور کچھ ایسی چیزیں پیش آئیں گی جن کو اُوپرا اور اَجنبی سمجھا جائے گا۔

ہر وہ کام جس کے کرنے کی شریعت نے اجازت نہ دی ہو، اس کو غلط اور ممنوع قرار دیا ہو؛ ان کو ''منکَر'' کہتے ہیں۔ اور جس کام کا شریعت کی طرف سے حکم دیا گیا ہو؛

اس کو''معروف'' کہا جاتا ہے۔لغوی اور ڈکشنری کے اعتبار سے معروف کا ترجمہ 'جانی پہچانی چیز' ہوتا ہے۔جس کا مزاج دینی ہوگا اور ماحول بھی دینی ہوگا، ایسے معاشرہ میں نیک کام جانے پہچانے ہوں گے۔اور غلط وگناہ کے کام انجانے ہوں گے، جن کو کوئی جانتا اور پہچانتا نہ ہوگا، گویا ایسے کام اجنبی اور اُوپرے سمجھے جاتے ہیں، اس لیے ان کو''منکر'' سے تعبیر کیا جاتا ہے(معروف اور منکر پر تفصیلی کلام جلد/ ۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔مرتب۔)

فتنہ کسے کہتے ہیں؟

۳: ''فتنہ'' عربی زبان کالفظ ہے''فَتَنَ يَفْتِنُ'' کا اصل ترجمہ ہوتا ہے: سونے کے کھرے اور کھوٹے ہونے کو پہچاننے اور اس کے میل کچیل کو دور کرنے کے لئے آگ کے اندر ڈالنا۔اور شریعت کی اصطلاح میں''فتنہ'' ان حالات اور آزمائش کو کہا جاتا ہے جس سے آدمی کے ایمان اور نفاق، اخلاص اور عدمِ اخلاص کو پہچانا جاتا ہے ایسے حالات کہ جس میں حق اور باطل ایسے گھل مل جائیں، دونوں میں ایسی آمیزش ہوجائے، دونوں ایسے قریب قریب ہوجائیں کہ آسانی کے ساتھ یہ پہچاننا مشکل ہوجائے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے، سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے، ایسے حالات کو سمجھنا ہرآدمی کا کام نہ رہے؛ ایسے واقعات کو''فتنہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسی طریقہ سے اگر گناہوں کی کثرت ہونے لگے، فسق وفجور عام ہوجائے، تو اس کو بھی بعض روایتوں میں''فتنہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کی دو جماعتوں میں آپس میں ٹکراؤ ہوجائے اور جنگ چھڑ جائے اور ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے موقف اور نظریہ پر ایسا قائم ہو کہ اس کو چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہ ہو، دونوں ایک دوسرے سے ایسے بھڑے ہوئے

ہوں کہ ملنے کے لئے بھی تیار نہ ہوں، ہر ایک اپنے حق پر ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، ایسے مشکل حالات پیدا ہوجائیں، اور ایسی شکل بن گئی ہو کہ عام آدمی کے لیے تمیز کرنا دشوار ہوجائے کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے؛ اس کو بھی روایتوں میں ''فتنہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بہر حال! لفظ ''فتنہ'' کا مفہوم عام ہے، سب کے اندر قدرِ مشترک بات اتنی ہے کہ ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ جس میں آدمی کے لئے آسانی سے حق اور باطل، سچ وجھوٹ کے اندر تمیز کرنا مشکل ہوجائے۔ بس! جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمانی بصیرت عطا فرمائی ہو اور جس پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل وکرم ہو، وہی ان حالات کے اندر کوئی صحیح فیصلہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے، ورنہ ہر ایک کے لیے یہ کام آسان نہیں ہوا کرتا؛ ایسے حالات کو ''فتنہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایسے فتنے آئیں گے کہ ایک فتنہ دوسرے فتنہ کو کم کر کے بتلائے گا، یعنی ہر بعد میں آنے والا فتنہ اس سے پہلے والے فتنہ کے مقابلہ میں بڑھا ہوا ہوگا۔ ایک حالت آتی ہے تو آدمی اس کو دیکھ کر سہم جاتا ہے اور ڈر جاتا ہے کہ یہ تو بڑا خطرناک معاملہ ہے، ایسا تو ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں، لیکن جب اس کے ختم ہونے کے بعد دوسرا معاملہ پیش آتا ہے تو بعد والا معاملہ اس سے بھی زیادہ بھیانک اور خطرناک ہوتا ہے، اس وقت وہی آدمی یوں کہتا ہے کہ پہلے والے حالات تو اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں تھے۔

''فتنہ'' کی تشریح بہ زبانِ نبی

اور فتنہ کی تشریح فرماتے ہوئے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود فرماتے ہیں کہ

صورتِ حال یہ ہوگی کہ ایک فتنہ آئے گا اور ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ جس میں آدمی کے لیے حق و باطل میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا، ایسے موقع پر ایک مؤمن کہے گا کہ یہ فتنہ تو مجھے ہلاک ہی کر ڈالے گا، یعنی اس فتنہ کی کیفیت کو دیکھ کر مؤمن اپنے ایمان کے متعلق خطرہ محسوس کرے گا اور یوں کہے گا یہ مجھے ہلاک کر دے گا، پھر وہ فتنہ ختم ہو جائے گا، حالات دور ہو جائیں گے، اس کے بعد دوسرا فتنہ آئے گا تو اس وقت مؤمن کہے گا کہ بس! یہی فتنہ ایسا ہے جو مجھے ہلاک کر دے گا اور میرے ایمان کو ختم کر دے گا گویا پہلے کے مقابلہ میں دوسرے کو اتنا زیادہ سخت پائے گا کہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ یہی میرے ایمان کی بربادی کا ذریعہ بنے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی صورتِ حال ہوگی کہ ہر آنے والا فتنہ پہلے والے فتنہ کے مقابلہ میں بڑا ہوگا، ہر آنے والی کیفیت پہلی والی کیفیت کو مات کر دے گی۔ آج کل یہی شکلیں پیدا ہو رہی ہیں۔

امیر کی اطاعت ضروری ہے

[۴]: جس کسی نے حاکمِ وقت امام یعنی حاکمِ اعلیٰ بادشاہِ وقت کے ہاتھ پر اطاعت و فرمانبرداری کی بیعت کی، اور اپنے دل سے اقرار بھی کیا، گویا وہ اس بات کا عہد و پیمان لیتا ہے کہ میں اس کو اپنا امیر تسلیم کرتا ہوں اور اس کی اطاعت کروں گا، چاہے اس کا حکم میرے مزاج کے موافق ہو، یا میرے مزاج کے خلاف ہو۔ آدمی جب بیعت کرتا ہے تو اس وقت اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دل سے عہد و پیمان اور اقرار بھی کرتا ہے، تو اب اس حکمران کی پوری پوری اطاعت اپنی طاقت کے مطابق کرے، اس کے بعد کوئی دوسرا آدمی حکومت اور تاج و تخت کا دعویدار اگر کھڑا ہو جائے تو جو بعد میں کھڑا ہوا ہے اس کی گردن اڑا دو۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم

پہلے والے سے عہد و پیمان کر چکے ہو، تو اب دوسرے کا ساتھ دینا کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ پہلے والے کے ساتھ اطاعت کا عہد و پیمان کیا تھا تو اب اس کی اطاعت ضروری ہے اور دوسرا جو دعویدار کھڑا ہوا ہے اس کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو تو ختم کیا جائے گا۔ بہر حال! باب کا عنوان جو قائم کیا تھا کہ امیر کی اطاعت ضروری ہے وہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے۔

اُن کا بوجھ اُن پر؛ تمہارا تم پر

۶۶۹:- وعن أَبِي هُنَيْدَةَ وَائِلِ بن حُجرٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: سَأَلَ سَلَمَةُ بن يَزِيدَ الجُعفِيُّ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَقَالَ: يَانَبِيَّ الله، أَرَأَيْتَ إِنْ قامَتْ عَلَيْنَا أُمَرَاءُ يَسأَلُونَا حَقَّهُم، وَيَمْنَعُونَا حَقَّنَا، فَمَا تَأْمُرُنَا؟ فَأَعْرَضَ عنه، ثُمَّ سَأَلَهُ، فَقَالَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: إِسْمَعُوا وَأَطِيعُوا، فإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوا، وَعَلَيْكُمْ مَا حمِّلْتُمْ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت سلمہ بن یزید جعفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے نبی! ہمیں بتلائیے کہ اگر ہمارے اوپر ایسے حکمران مسلط ہوں جو ہم سے اپنا حق مانگتے ہوں اور ہمارا حق ادا نہ کرتے ہوں؛ ایسوں کے متعلق آپ ہمیں کیا حکم ارشاد فرماتے ہیں؟ ہم ان کے ساتھ کیا معاملہ کریں؟ یہ سن کر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بے رخی برتی۔ انہوں نے پھر یہی سوال پوچھا تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے حکمرانوں کے حکم کو سنو اور ان کی اطاعت کرو، اس لیے کہ اگر وہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے تو اس کا بوجھ ان پر رہے گا، اور تمہاری ذمہ داری تم پر رہے۔

افادات:- اسلام نے حاکم کا حق محکومین و ماتحتوں پر مقرر کیا ہے، ان کا حق رعایا کے ذمہ یہ ہے کہ جائز کاموں کے اندر ان کی اطاعت واجب اور فرض قرار دی

گئی ہے، اس کے علاوہ بھی حقوق ہیں کہ ان کی خیر خواہی ضروری ہے۔ اسی طریقہ سے محکوم یعنی رعیت کے بھی حقوق ہیں جیسا کہ پہلے بھی آچکا ہے کہ رعایا کی خیر خواہی کرنا حاکم کے لیے ضروری ہے، اور دوسرے حقوق بھی ہیں جن کی تفصیل پچھلے باب میں آگئی تھی۔

ان صحابی نے سوال کیا کہ ایسے حکمران اگر ہمارے اوپر آگئے جو اپنا حق تو ہم سے وصول کرتے ہیں یعنی اپنی بات تو ہم سے منواتے ہیں، اپنی اطاعت تو کرواتے ہیں گویا ان کی طرف سے اس بات کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ہماری فرمانبرداری کرو، لیکن ہمارے جو حقوق ان کے اوپر لازم ہوتے ہیں وہ ادا نہیں کرتے، ہماری ضرورتوں اور تقاضوں کو وہ پورا نہیں کرتے، ہمارے ساتھ جو خیر خواہی کا معاملہ کرنا چاہیے وہ نہیں کرتے؛ ایسے وقت ہم کیا کریں؟ ان کا یہ سوال سن کر نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

عام طور پر جب اس طرح کے سوالات حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیے جاتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابتداءً اس کا جواب نہیں دیا کرتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر سوال کا فوری جواب نہیں دیا جاتا، بلکہ بعض سوالات ایسے ہوتے کہ ان کے جواب میں ٹال مٹول سے کام لیا جاتا ہے، اور بہت سے سوال تو ایسے ہوتے بھی نہیں کہ ان کا فوری جواب دیا جائے۔ ہاں! جب دیکھے کہ آدمی کے سوال کا جواب دیئے بغیر چارۂ کار نہیں ہے؛ تو بات دوسری ہے۔

شریعت کا اصول

دیکھو! شریعت کا یہ ایک اصول ہے جو میں پہلے بھی کئی مرتبہ بتلا چکا ہوں کہ شریعت کی طرف سے ہر جگہ حقوق مقرر کر دئے گئے ہیں۔ حکمرانوں کے اوپر ان کے ماتحتوں اور رعایا کے حقوق مقرر کیے گئے، اور رعایا کے اوپر حکمرانوں کے حقوق مقرر کیے گئے۔ اب ہر ایک کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان حقوق کو ادا کرے۔ یا جیسے شوہر

کے اوپر بیوی کا حق مقرر کیا گیا اور بیوی کے اوپر شوہر کا حق مقرر کیا گیا۔ اب شوہر کے لیے ضروری ہے کہ بیوی کا حق ادا کرے اور بیوی کے لیے ضروری ہے کہ شوہر کا حق ادا کرے۔ لیکن عام طور پر دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ جن دو فریق کے آپس میں ایک دوسرے کے اوپر حقوق مقرر کیے گئے ہیں (جیسے میاں بیوی، یا حاکم اور محکوم، آقا اور غلام) اس میں جو قوت والا فریق ہوتا ہے وہ ایسا انداز اور ایسی روش اختیار کرتا ہے کہ اپنا حق جو سامنے والے پر ہے وہ تو اپنی قوت کے زور سے وصول کرتا ہے، لیکن سامنے والے کا جو حق اپنے اوپر ہے اس کو ادا کرنے کی فکر نہیں کرتا؛ تو اب ایسے مواقع پر کیا کیا جائے؟

آپ حدیث کے پورے ذخیرے کو اٹھا کر دیکھ لیجیے کہ آپ ﷺ نے ایسے تمام مواقع پر یہ نہیں فرمایا کہ وہ تمہارا حق ادا نہیں کرتا تو تم بھی اس کا حق ادا مت کرو۔ کہیں بھی ایک حدیث آپ کو ایسی نہیں ملے گی، اس لیے کہ نظامِ عالَم کو باقی رکھنے کا طریقہ یہ ہے ہی نہیں۔ اور میں پہلے بھی کئی مرتبہ بتلا چکا ہوں کہ اگر دونوں فریق ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں تب تو نورٌ علیٰ نورٍ؛ پورا معاشرہ جنت کا نمونہ بن جائے گا۔ اور اگر جن دو فریق کے ایک دوسرے کے اوپر حقوق مقرر کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک فریق سامنے والے کے حقوق کو ادا نہیں کرتا، لیکن دوسرا فریق اس کے حقوق کو ادا کرتا ہے؛ تب بھی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئے گی، معاملہ سنبھلا ہوا رہے گا۔ لیکن اگر سامنے والا فریق بھی حق ادا نہیں کرتا تو پھر ٹکراؤ کی نوبت آئے گی۔ جیسے: شوہر اپنا حق وصول کرتا ہے، لیکن بیوی کا حق ادا نہیں کرتا، تو وہاں ہم بیوی کو کبھی یہ مشورہ نہیں دیں گے کہ تو بھی شوہر کا حق ادا مت کر۔ اسی طرح حاکم کے پاس قوت ہے جس کی وجہ سے وہ اپنا حق وصول کرتا ہے، لیکن اس کے اوپر اپنے ماتحتوں کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں وہ ان کو ادا نہیں کرتا۔ اب اگر ماتحت آ کر یہ سوال کریں کہ آپ ہی بتائیے کہ ہم کیا

کریں؟ تو آپ کبھی بھی یہ مشورہ نہ دیں کہ تم بھی اس کا حق ادامت کرو۔اس روایت میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی ایسا مشورہ نہیں دے رہے ہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''إِسْمَعُوْا وَأَطِيعُوْا''اس کا تم پر یہ حق ہے کہ وہ تم کو جو حکم دے اس کو مانو، بس! جب وہ حکم دیتا ہے تو مان لو، اس طرح تمہاری ذمہ داری تو تم پوری کرلو۔

''فإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوا ،وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ''ہماری ذمہ داری یہی ہے کہ جو شریعت کی طرف سے ہم پر لازم کی گئی، اور ان کی ذمہ داری وہ ہے جو شریعت کی طرف سے ان پر لازم کی گئی تھی۔اب اگر وہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے تو اس کا بوجھ ان پر رہے گا، ہمیں اس بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ ہمارا حق ادا نہیں کرتے تو ہم ان کا حق کیوں ادا کریں؟ شریعت ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ حق ادا کرتے رہے یا نہیں؛ اس کا فیصلہ تو اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے آپ کے ساتھ قیامت کے روز کیا ہی جائے گا جہاں کبھی اس کے خلاف ہونے والا نہیں ہے۔

یہاں یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ حکمران کی اطاعت ضروری ہے۔اور ویسے بھی جب وہ قوت کے زور سے اپنا حق وصول کررہا ہے، تو اگر ہم یہ مشورہ دیں کہ تم اس کا حق ادامت کرو؛ تو یہی چیز فتنہ بڑھانے کا ذریعہ بنے گی۔

اصل علاج یہ نہیں

اور ایک بات یہ بھی غور طلب ہے کہ وہ اپنا حق اسی لئے تو وصول کررہا ہے کہ اس کا حق ہے، اور کسی آدمی کا اپنے حق کو وصول کرنا کوئی گناہ کا کام نہیں ہے، سیدھی سی بات ہے۔اس کو حق پہنچتا ہے کہ اپنا حق وصول کرے اس لیے کررہا ہے۔ہاں! سامنے والے کا جو حق ادا نہیں کررہا ہے، یہ بات غلط ہے، اس کی طرف سے یہ کوتاہی ہورہی

ہے۔اب اگر ہم سامنے والے کو یہ مشورہ دیں کہ تم بھی حق ادا مت کرو،تو آپ ہی سوچئے کہ ہم سامنے والے کو بھلائی کا مشورہ دے رہے ہیں، یا غلط مشورہ دے رہے ہیں؟ جو غلطی یہ کرر ہا تھا اس کا علاج ڈھونڈنے کے لیے سامنے والا فریق ہمارے پاس آیا،تو علاج میں ہم بھی وہی بات بتلا رہے ہیں کہ تو بھی اس کا حق مت ادا کرنا؛تو یہ علاج کہاں ہوا، بلکہ معاملہ کو اور زیادہ بگاڑنا ہوا۔شریعت کبھی یہ مشورہ نہیں دیتی۔

اگر ہم یہ کہیں گے کہ تم اس کا حق ادا مت کرو تو ظاہر ہے کہ وہ تو پہلے ہی قوت سے اپنا حق وصول کرر ہا تھا اور اب اگر یہ حق ادا نہیں کرے گا تو ٹکراؤ کی شکلیں پیدا ہوگی جب یہ اس پر اپنا زور چلانا چاہیے گا تو اس کے اس زور سے بچنے کے لیے سامنے والا فریق جو کمزور ہے وہ دوسروں کی حمایت حاصل کرے گا،اور جب دوسروں کی حمایتیں آئیں گی تو جھگڑے اور فتنے زیادہ پیدا ہوں گے،اس لئے شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، یہ بات بڑے خطرے کی ہے،عام طور پر فتنے اسی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں، ایسے تمام حالات میں شریعت کی بڑی تاکید رہتی ہے کہ تم سامنے والے کا حق ادا کرتے رہو،اگر چہ وہ تمہارے حق میں کوتاہی کرے۔

شفا بخش علاج

آج کل تو ایسا مزاج بن گیا ہے کہ لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کیا ہم بزدل ہیں کہ وہ ہمارا حق ادا نہیں کرتا تب بھی ہم اس کا حق ادا کریں؟ لوگوں نے اس کا نام بزدلی رکھ دیا ہے، حالاں کہ یہ بزدلی نہیں ہے۔آپ یہ طے کر لیجئے کہ میں اس کا جو حق ادا کرر ہا ہوں وہ بزدلی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس لئے ادا کرر ہا ہوں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ہر کام میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو پیشِ نظر رکھیں۔

اور یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ بہت سے دینی کام جو ہم کرتے ہیں وہ حکمِ خداوندی کی وجہ سے نہیں، بلکہ معاشرے اور سماج کا ایک طریقہ اور دھارا بنا ہوا ہے اس لیے کرتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہماری دینداری کا بہت بڑا حصہ ایسا ہی ہے۔ بعض لوگ اگر شراب نہیں پیتے تو وہ اس لیے نہیں کہ حرام ہے، بلکہ سوچتے ہیں کہ اگر میں پیوں گا تو لوگ کیا کہیں گے۔ میں سنیما دیکھنے جاؤں گا تو لوگ کیا کہیں گے؟ وہاں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو نہیں سوچتا۔ تو درحقیقت بہت سے گناہوں سے لوگ اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں، بلکہ سماج کے ڈر سے بچتے ہیں، اور بہت سے کام اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں، بلکہ سماج کے ڈر سے کرتے ہے۔ حالاں کہ شریعت کی تعلیم تو یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا کام کرو تب بھی اور بڑے سے بڑا کام کرو تب بھی اللہ تعالیٰ کے واسطے ہی کرو۔ اور اگر کوئی کام نہ کرو، تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے واسطے مت کرو۔ جیسا کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے: "مَنْ أَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ" جس نے دیا تو اللہ کے واسطے دیا، اور نہیں دیا تب بھی اللہ کے واسطے نہیں دیا "فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ" تو اس کا ایمان کامل ہوگیا۔

خلاصۂ علاج

خلاصہ یہ ہوا کہ ایسے مواقع پر آدمی اللہ تعالیٰ کے حکم کو مدِّ نظر رکھے، اور یہی سوچے کہ میرا اس کے حق کو ادا کرنا بزدلی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے؛ تو پھر دیکھئے کہ بھائیوں بھائیوں میں اور رشتہ داروں میں کیسی محبتیں قائم ہوجاتی ہیں۔ ہمارے سماج میں جتنے بھی بگاڑ ہیں یہ آپسی حقوق کے ادا نہ کرنے کے نتیجہ ہی میں ہیں، اگر اس تعلیم پر عمل کرلیا گیا تو ان شاء اللہ سارے بگاڑ ختم ہوجائیں گے۔ جب بھی ایسا کوئی معاملہ ہو اور لوگ کہیں کہ کیا تو بزدل ہے؟ وہاں اسی سوچ کی

ضرورت ہے "فَإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوا، وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ" وہ جو کرتا ہے اس کی ذمہ داری اس پر ہے، کل کو قیامت میں اس کا جواب اس کو دینا ہے۔ ہاں! میری ذمہ داری مجھ پر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا جو حق میرے اوپر لازم کیا ہے، میں اس کو ادا کروں گا، چاہے وہ میرا حق ادا نہ کرتا ہو۔

یہ سودے بازی نہیں ہے

''معاملات میں سودے بازی ہوتی ہے، حقوق میں سودے بازی نہیں ہوتی''

دونوں باتیں الگ الگ ہیں جس کو ذرا برابر سمجھ لیجئے۔ جیسے: میں نے آپ سے ایک مکان خریدا، اگر میں پیسے نہ دوں تو آپ مجھے مکان نہ دیجئے۔ آپ مکان نہ دیں، تو میں پیسے نہ دوں؛ یہ تو برابر کا معاملہ ہے، یہ تو سودا ہوا جو آپس کے معاملات میں ہوتا ہے۔ لیکن شریعت نے جو حقوق مقرر کئے ہوئے ہیں، یہ کسی طرح کی سودے بازی نہیں ہے، باپ کے اوپر بیٹے کا حق، یا بیٹے کے اوپر باپ کا حق؛ یہ کوئی سودے بازی نہیں ہے کہ بیٹا باپ کا حق ادا کرے تب ہی باپ بیٹے کا حق ادا کرے گا۔ بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اور دونوں کے لیے لازم ہے کہ اپنا اپنا کام کریں۔ دونوں میں کوئی ایک نہیں کرتا تو دوسرے کو چاہیے کہ یہ نہ دیکھے کہ وہ کیوں نہیں کرتا، بلکہ وہ خود حق ادا کرنے کا اہتمام کرے۔ یہ سب حقوق ہیں اور حقوق اللہ تعالیٰ نے متعین کئے ہیں۔ اسی ایک اصول کو مدِّ نظر رکھنے کی ضرورت ہے، اگر ہم اس چیز کو پیشِ نظر رکھیں گے، تو ان شاء اللہ کبھی کوئی گڑبڑ کی نوبت نہیں آئے گی۔

ایسے زمانہ میں کیا کرے؟

۶۷۰:- عن عبد الله بن مسعود رضی اللہ تعالٰی عنہ قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: إِنَّهَا

سَتَكُونُ بَعْدِي أَثَرَةٌ وَأُمُورٌ تُنْكِرُونَهَا! قالوا: يَارسول الله! كَيْفَ تَأْمُرُ مَنْ أَدْرَكَ مِنَّا ذَلِكَ؟ قَالَ: تُؤَدُّونَ الحَقَّ الَّذِي عَلَيْكُمْ، وَتَسْأَلُونَ اللهَ الَّذِي لَكُمْ.

(متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے بعد ترجیحی معاملہ کیا جائے گا، اور ایسی چیزیں ہوں گی جن کو تم اجنبی سمجھو گے یعنی پسند نہیں کرو گے۔ اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! جو آدمی ایسا زمانہ پالے تو وہ کیا کرے؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ان حاکموں کا تم پر جو حق ہے وہ تم ادا کرو، اور تمہارا ان پر جو حق ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو اور اسی سے دعا کرو۔

افادات:- حُکّام جن کے ہاتھ میں اختیارات اور پاورس (Powers) ہوتے ہیں، ان اختیارات کے نتیجہ میں جب وہ کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو انصاف کے ساتھ اور حقدار کا حق سمجھ کر کرتے ہیں، لیکن بعض لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح نہیں ہے، اس کو یہ منصب اور عہدہ نہیں دینا چاہیے تھا، وہ آدمی اس لائق نہیں تھا، اس نے اس کی فیور (Favour) کی ہے۔ "أَثَرَةٌ" کے معنیٰ فیور کرنا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کوئی معاملہ کیا تو بعض لوگوں نے اس کو بھی فیور پر محمول کیا تھا جس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: ہم تو ایسا نہیں کرتے، لیکن آئندہ ایسا ہوگا کہ تم ایسے ترجیحی اور فیور والے معاملات دیکھو گے۔

تو حکمرانوں کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہوتا ہے، جن کے ہاتھ میں اختیارات ہوتے ہیں، وہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے، بلکہ ان کی بڑی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اگر وہ اپنی ذمہ داری کے مطابق کام کرتا ہے، پھر بھی اپنے اور پرائے سب ان پر اشکالات کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ غلط کیا ہے، اس کو یہ چیز نہیں کرنی چاہیے تھی، فلاں منصب فلاں کو نہیں دینا

چاہیے تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! جو آدمی ایسا زمانہ پالے اور اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ ترجیحی سلوک کئے جارہے ہیں، نامناسب باتیں ہورہی ہیں؛ تو وہ کیا کرے؟ تلوار نکال کر مقابلہ کے لئے میدان میں آجائے؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا: اپنا حق وصول کرنے کے لیے آستینیں مت چڑھاؤ، تلوار لے کر میدان میں مت اتر آؤ؛ یہی چیز فتنہ ہے، اور فتنہ چھوٹے انداز میں ہو یا بڑے انداز میں؛ بہت بری چیز ہے۔ اس لیے ان حاکموں کا تم پر جو حق ہے وہ تم ادا کرو، اور تمہارا ان پر جو حق ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو اور دعا کرتے رہو۔

عام طور پر آپ دیکھیں گے کہ جہاں کہیں بھی اس طرح کے فتنے، جنگیں اور لڑائیاں ہوتی ہیں، وہ انہی بنیادوں کے اوپر ہوا کرتی ہیں کہ فلاں ہمارا حق کیوں نہیں دے رہا ہے، ہم تو اپنا حق وصول کر کے رہیں گے، اسی میں دو پارٹیاں ہوجاتی ہیں اور مقابلہ کی نوبت آجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سب کو صحیح سمجھ اور نیک توفیق عطا فرمائے۔

وُجُوبُ طَاعَةِ وُلَاةِ الْأُمُورِ فِي غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ

حاکموں کی اطاعت کے احکام

(مجلس ۳)

۸/ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۳/فروری ۲۰۰۱ء

بیان چل رہا تھا کہ جو حکمران ہیں، چاہے وہ حاکمِ اعلیٰ اور بادشاہِ وقت ہوں، یا حاکمِ اعلیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ماتحت حاکم ہوں، پھر وہ ایسی بات کا حکم دیتے ہوں جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم نہیں آتی ہو، تو اس صورت میں ان کی اطاعت اور فرماں برداری واجب اور ضروری ہے؛ البتہ گناہ کے کاموں کا وہ حکم دیں تو اس صورت میں اس کو مانا نہیں جائے گا اور ان پر عمل نہیں ہوگا۔

جس نے امیر کی اطاعت کی……

۱۷۶:-وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ، وَمَنْ يُطِعِ الأَمِيرَ فَقَدْ أَطَاعَنِي، وَمَنْ يَعْصِ الأَمِيرَ فَقَدْ عَصَانِي. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے میری اطاعت کی گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ اور جس نے میری نافرمانی کی گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی، اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

افادات:- اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر آدمی جس گناہ کا مرتکب شمار ہوتا ہے اور اس پر جو سزا مل سکتی ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی پر بھی وہی حکم ثابت ہوگا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا ہی اس لئے ہے کہ آپ جن چیزوں کا حکم دیں ان پر تمام لوگ عمل کریں، اور جن چیزوں سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منع فرمائیں ان سے لوگ باز رہیں ﴿مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ قرآنِ کریم میں ہے

کہ: رسول جس چیز کا حکم دیں اس کو لے لو، اس پر عمل کرو، اور جس چیز سے وہ منع کریں اس سے باز آجاؤ۔ تو جس طرح اللہ تعالیٰ کا حکم ماننا اور اس کی اطاعت وفرماں برداری ضروری ہے، اسی طرح رسولِ پاک کا حکم ماننا اور آپ کی اطاعت وفرمانبرداری بھی ضروری ہے۔ اور نبیٔ کریم ﷺ کی طرف سے جو حکام اور ماتحت امراء مختلف امور کو انجام دینے کے لئے مقرر کئے جاتے تھے ان کے متعلق حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میری طرف سے جو امراء مقرر کئے جائیں، جو ان کی اطاعت کرے گا گویا اس نے میری اطاعت کی۔

عام طور پر یہی ہوتا ہے جو حاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے یا جو بڑی شخصیت ہوتی ہے، اس کا حکم اور اس کی بات تو لوگ خوشی خوشی مان لیا کرتے ہیں، اور اس پر عمل کرنے میں اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے، لیکن گڑبڑ نیچے آکر ہوتی ہے کہ جب ان کی طرف سے کچھ باتیں پیش کی جاتی ہیں تو لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ حالاں کہ یہ بات بدیہی ہے کہ حاکمِ اعلیٰ تو پورے حدودِ سلطنت میں پہنچ نہیں سکتا، اس کو نظام چلانے کے لئے اور اپنے ماتحت مختلف شعبوں اور مختلف کاموں کو انجام دینے کے لئے آدمی مقرر کرنے ہی پڑیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ جو شعبہ جس کے حوالہ کیا جائے گا اس شعبہ سے متعلق اختیارات بھی اس کو دیئے جائیں گے، تو اس نے جن لوگوں پر اعتماد کیا ہے اور جن کی صلاحیتوں کو قابل سمجھتے ہوئے ان کو متعین کیا ہے، ان حضرات کے متعلق حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جس نے ان مقرر کردہ لوگوں کی اطاعت کی گویا اس نے میری اطاعت کی، اور جس نے ان کی نافرمانی کی اس نے گویا میری نافرمانی کی۔

گورنمنٹ کا اصول بھی یہی ہوتا ہے۔ گورنمنٹ کے عملہ اور اسٹاف کی طرف سے گورنمنٹ کے قوانین اور اصول کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے جو حکم جاری کیا جائے گا، اس حکم کو ماننا اور اس پر عمل کرنا اسی طرح ضروری ہوتا ہے جیسا اوپر والے حاکم کی طرف سے

جاری کئے ہوئے حکم کو ماننا۔ اگر اس کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو اسی طرح سزا کا حقدار ہوتا ہے جس طرح حاکمِ اعلیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی صورت میں سزا کا حقدار ہوتا ہے، اس کے بغیر کسی بھی سلطنت کا نظام، اور کوئی بھی نظمِ مملکت چل ہی نہیں سکتا، اسی لئے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاص طور پر اس طرف متوجہ کیا ہے۔

ایک اہم اصول

ہمارے سماج اور معاشرہ میں مختلف طریقوں سے جو نظام چلائے جاتے ہیں، چاہے انجمنوں کی شکلوں میں ہوں، چاہے جماعتوں کی شکلوں میں ہوں، یا مسجد و مدرسہ کا نظام ہو، ہر ایک جگہ نظام چلانے کے لئے ایک تو سربراہ مقرر کیا جاتا ہے اور پھر وہ سربراہ اپنے ماتحت کاموں کو انجام دینے کے لئے مختلف لوگوں کو مقرر کرتا ہے، تو عام طور پر دوسروں کی طرف سے رکاوٹیں نیچے والوں کے معاملہ میں ہی پیش آتی ہیں، وہ یوں سمجھتے ہیں کہ مَیں اس کی کیوں مانوں؟ میں تو اس سے اونچا ہوں۔ تو ان کو یہ سوچنا چاہیے کہ دراصل وہ اِس کی نہیں مان رہے ہیں، بلکہ اِس کو جس نے مقرر کیا ہے اُس کی مان رہے ہیں، اگر یہی بات سمجھ لیں گے تو پھر کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی، اور کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ جتنے بھی جھگڑے اور اختلافات شروع ہوتے ہیں اور اس قسم کے نظاموں کو چلانے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہی ہوتی ہے۔

جاہلیت کی موت

۶۷۲:-وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال: مَنْ كَرِهَ مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئاً فَلْيَصْبِرْ، فَإِنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنَ السُّلْطَانِ شِبْراً مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً.

(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنے بادشاہ اور امیر کی طرف سے کسی چیز کو ناپسند سمجھے (یعنی امیر نے کوئی حکم دیا، یا کوئی معاملہ اور سلوک اس کے ساتھ ایسا کیا جو اس کو ناگوار ہے، اس کی طبیعت اس کو پسند نہیں کرتی) تو اس کو چاہیے کہ صبر کرے (نہ کوئی مقابلہ کرے اور نہ اس کے خلاف کرے) اس لیے کہ جو آدمی حاکم کی فرمانبرداری سے ایک بالشت بھی باہر نکلا، وہ جاہلیت کی موت مرا۔

افادات:- اس لئے کہ مقابلہ کرنے، اس کی خلاف ورزی کرنے اور اس کی نافرمانی کرنے میں بڑی خرابیاں ہیں، ایسے ایسے نقصانات ہیں جس کی کوئی تلافی ہو ہی نہیں سکتی، لہٰذا جب یہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے تو صبر سے کام لے۔

اور چوں کہ زمانۂ جاہلیت میں اس طرح کا کوئی نظام نہیں تھا، ہر قبیلہ اپنا ایک الگ نظام، اور اپنی الگ حکومت چلاتا تھا، اسلام نے آ کر وہ سارے نظام ختم کر کے ایک امیر کے ماتحت سب لوگوں کو لا کر اس ایک امیر کی اطاعت کو ضروری قرار دیا، اور ایک اجتماعی نظام انسانوں کو عطا فرمایا، پھر اس نظام کو چلانے کے لئے حکام کی تعیین کی گئی اور ان کے ذریعہ سے پورے نظام کو چلایا گیا۔ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو اسلام نے آ کر بتلائیں، ورنہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں میں ایسا کوئی نظام نہیں تھا، اس لئے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: جو اس کی خلاف ورزی کرے گا گویا اس نے جاہلیت والا طریقہ اپنانا چاہا، اسی لئے وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

جس نے حاکم کی توہین کی

۶۷۲:-وعن أبي بكرة رضي الله تعالى عنه قال: سمعتُ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم يقول: مَنْ أهانَ السُّلطَانَ؛ أَهَانَهُ اللهُ. (رواه الترمذي وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس نے حاکم اور بادشاہ کی بے عزتی اور توہین کی، اس کے ساتھ اس کی شان کے خلاف معاملہ کیا؛ اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے آدمی کو بے عزت کرے گا۔

افادات:- اس لئے کہ جو حاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جانا پورے نظم ونسق کو برباد کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، ہر ایک کو جرأت نہیں ہوتی لیکن کسی ایک آدمی نے جرأت کرلی تو گویا اس نے دوسروں کو بھی جرأت پر آمادہ کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نظام کا سارا ڈھانچہ ختم ہوجائے گا، اس ایک کی اہانت پورے نظام کی بربادی کی شکل میں ظاہر ہوگی، اور ظاہر ہے کہ اس کے نقصانات کتنے ہوسکتے ہیں؟ اسی لئے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جس نے حاکم کی توہین کی، اللہ تعالیٰ اس کی توہین اور بے عزتی کرے گا۔ وہ آدمی یہ نہ سمجھے کہ ایسا کرکے میرا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے، قدرت کی طرف سے تکوینی طور پر اس کے ساتھ اسی کے مناسب سزا کا معاملہ کیا جائے گا۔

اَلنَّهْيُ عَنْ سُؤَالِ الْإِمَارَةِ وَإِخْتِيَارُ تَرْكِ الْوَلَايَاتِ إِذَا لَمْ يَتَعَيَّنْ عَلَيْهِ

عہدہ طلب کرنے کی ممانعت

اور اختیاری صورت میں عہدہ قبول نہ کرنا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلامی اصول

اگر کوئی آدمی اپنی طرف سے کوئی عہدہ مانگے اور طلب کرے؛ تو اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا، لیکن اگر کسی آدمی کے اندر صلاحیت ہے اور وہ با کمال شخصیت ہے اس میں ایسے اوصاف ہیں کہ ذمہ داری کے کاموں کو انجام دے سکتا ہے، تو خود حاکمِ اعلیٰ کو چاہیے کہ وہ اس کو ذمہ داری حوالہ کرے۔ ویسے بھی اسلام نے تو ایک اصول بتا دیا ہے: ﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا﴾ اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ۔ حکومتوں کے یہ عہدے اور مناصب بھی ایک طرح کی امانت ہیں، اسی لئے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: کسی آدمی نے کسی کو کوئی عہدہ و منصب دیا، اور اس قوم میں اس سے اچھا آدمی موجود ہے جو اس ذمہ داری کو اس سے بھی اچھی طرح ادا کر سکتا ہے؛ تو اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خیانت کی۔ یعنی جس کو عہدہ دیا ہے، اس کے مقابلہ میں دوسرے آدمی میں اس سے اچھی صلاحیتیں موجود ہیں، اور حاکم بھی اس کو جانتا ہے اور اس کو دینے میں کوئی دوسری رکاوٹ اور مانع بھی نہیں ہے، اس کے باوجود اُس کو نہ دے کر دوسرے کو وہ منصب و عہدہ دیا؛ تو اسلام کی تعلیم کے مطابق اس نے خیانت کی۔ حاکمِ اعلیٰ کی ذمہ داری ہے کہ مناصب و عہدوں کی تقسیم کے وقت جب کسی آدمی کو تجویز کیا جائے تو ان کمالات، صلاحیتوں اور اوصاف کی بنیاد پر تجویز کیا جائے جو اس کام کو انجام دینے کے لیے ہونے چاہئیں۔ جس میں جتنی زیادہ صلاحیت ہو اسی کو دینا چاہیے، اگر اس کو نہ دے کر اس سے کم صلاحیت والے کو دیا گیا تو اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے ساتھ خیانت کی۔ جب اسلام کی تعلیم یہ ہے تو پھر کسی کو کوئی عہدہ مانگنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاکمِ اعلیٰ کو حکم دیا گیا ہے کہ جو باصلاحیت ہو اس کو پیشکش کرے۔ باقی خود ہی مانگنا کہ مجھے یہ عہدہ ومنصب دیا جائے، اسلام اس کو پسند نہیں کرتا۔

باصلاحیت آدمی کے لیے دو راستے ہیں

پھر یہ ہے کہ کسی کو اس کی صلاحیت اور کمالات کی وجہ سے کوئی عہدہ دیا جارہا ہو، جیسے: صدر بنایا جارہا ہو، سکریٹری بنایا جارہا ہو؛ تو اس کو قبول کرنا چاہیے یا نہیں؟

بعض مرتبہ شکل ایسی ہوتی ہے کہ پورے سماج ومعاشرہ اور پوری کمیونٹی (community) میں کوئی ایسا ہے ہی نہیں جو اس عہدہ کو سنبھال سکے، صرف یہی اکیلا ہے۔ کسی دوسرے میں ایسے اوصاف نہیں جو اس ذمہ داری کو امانت داری کے ساتھ کما حقہٗ پورا کرسکے، سب لوگ کہتے ہیں کہ یہ کام تو یہی کرسکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں کرسکتا؛ تو پھر اس کو انکار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں تو اس کی یہ ذمہ داری ہوجاتی ہے کہ اس ذمہ داری کو قبول کرلے، اگر انکار کردے گا تو گنہگار ہوگا۔

لیکن اگر ایسا نہیں ہے، اس ذمہ داری کو انجام دینے کی صلاحیت رکھنے والا یہ اکیلا نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سارے لوگ اسی کے برابری اور لیول کے موجود ہیں جو اس ذمہ داری کو قبول کرسکتے ہیں، اور پھر اس سے کہا جارہا ہے کہ آپ قبول کیجئے، تو اس صورت کے اندر اپنے آپ کو اس ذمہ داری سے بچانے کے واسطے یہ سوچتے ہوئے انکار کرتا ہے کہ ذمہ داری کا کام ہے، پتہ نہیں کہ مجھ سے پورے طور پر یہ ذمہ داری ادا ہوگی یا نہیں، اس امانت کو پورے طور پر انجام دے سکوں گا یا نہیں، اس لیے کہتا ہے کہ یہ عہدہ

مجھے نہیں چاہیے، میں اس ذمہ داری کو قبول کرنا اور یہ بوجھ اٹھانا نہیں چاہتا، یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا، یا میں اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہوں؛ تو شرعاً اس کی اجازت ہے۔

اسلام اس نظریہ کا قائل ہی نہیں

لیکن اسلام نے سامنے سے کسی عہدہ اور منصب کو مانگنے کی تو بالکل اجازت دی ہی نہیں۔ آج کل تو معاملہ بالکل بدل ہی گیا ہے۔ الیکشن میں خود ہی امیدواری کرتے ہیں کہ مجھے ذمہ دار بناؤ، حالاں کہ اسلام اس نظریہ کا قائل ہی نہیں اور اس نظریہ کو بالکل پسند ہی نہیں کرتا۔ اسلام تو کہتا ہے کہ آپ لوگوں سے نہ کہو، لیکن اگر ذمہ دار، اہل الرای، اربابِ حل وعقد آپ کی ان صلاحیتوں کو دیکھ کر آپ سے کہیں کہ آپ کو ہی یہ کام کرنا ہے اور آپ منع کریں؛ تو یہ اصل بات ہے۔ ایسا نہیں کہ ساری دنیا منع کرتی ہے کہ ان کو نہیں دینا ہے، لیکن آپ کہتے ہیں کہ: ''میں ہی صدر بنوں گا، میں ہی سکریٹری بنوں گا، اور میں بھی دیکھتا ہوں کہ کون میرے مقابلہ پر آتا ہے؟'' اسلام اس نظریہ کا قائل نہیں ہے، یہ تو بڑی گڑبڑ والی چیز ہے۔

آخرت کا گھر کس کے لیے؟

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (القصص:۸۳)﴾ اس آیت سے پہلے آخرت کی کچھ چیزیں بیان کی گئی تھیں، اس کے بعد باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آخرت کا وہ گھر ہم انہی لوگوں کو دیں گے، انہی کے لیے ریزروڈ (Reserved) رکھتے ہیں جو زمین میں بڑا بننا نہیں چاہتے، اور نہ زمین میں فساد پھیلانا چاہتے ہیں، اور انجام تو نیکوکاروں کے واسطے ہی ہے۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلتے ہیں اور نافرمانیوں سے

اپنے آپ کو بچاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے آپ کو بڑائی طلب کرنے سے بھی بچاتے ہیں؛ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ آخرت میں کامیاب کرتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو بندے آخرت کے حقدار ہیں ان کا مخصوص وصف ﴿لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ﴾ ہے کہ وہ عہدہ نہیں چاہتے، ان کا مزاج ایسا ہے کہ ان کو کوئی عہدہ دیا جائے تب بھی وہ منع کرتے ہیں، ہاں! لوگوں کے اصرار کے نتیجہ میں قبول کرلیں؛ تو یہ بات اور رہی، لیکن وہ اپنی طرف سے اس کے خواہش مند نہیں ہوتے، بلکہ ان کی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ یہ عہدہ مجھے نہ سونپا جائے۔

اگر مدد چاہتے ہو تو عہدہ مت مانگو

۶۷۴: وعن أبي سعيد عبد الرحمن بن سمرة رضي الله تعالى عنه قال قال لي رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: يَا عَبْدَ الرَّحمان بن سَمُرَةَ! لاَ تَسْأَلِ الإِمَارَةَ، فَإِنَّكَ إن أُعْطِيتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا، وَإِنْ أُعْطِيتَهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ وُكِلْتَ إِلَيْهَا، وَإِذَا حَلَفْتَ عَلَى يَمِينٍ، فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْراً مِنْهَا، فَأْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ وَ كَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد الرحمن بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا: اے عبد الرحمن! عہدہ مت مانگو، امارت مت طلب کرو، سرداری کا سوال مت کرو (کہ مجھے پرسیڈنٹ بناؤ، مجھے سکریٹری بناؤ) اس لئے کہ (اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک اصول ہے کہ) جو عہدہ اور منصب بغیر مانگے ہوئے ملتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی مدد ہوگی، اور اگر آپ کے طلب کرنے اور مانگنے سے ملا ہے، تو (اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں ہوگی، بلکہ) تمہارے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اور جب تم نے کسی کام کی قسم کھائی اور دوسرا کام ایسا ہے جو اس سے بہتر ہے تو ایسی قسم کو چھوڑ کر دوسرے اچھے کام کو انجام دو اور قسم ٹوٹنے کا کفارہ دیدو۔

افادات:- آدمی نے کوئی عہدہ مانگا نہیں تھا، کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا، بلکہ ذمہ داروں نے اس کی صلاحیتوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے بغیر طلب کے اس پر ڈالا ہے؛ تو اس صورت میں اس عہدہ کی جو ذمہ داریاں ہیں ان کو انجام دینے میں اور اس ڈیوٹی کو پورا کرنے میں اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا۔ اور اگر کوئی عہدہ سامنے سے مانگتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ میں اس کام کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہوں، باری تعالیٰ کہتے ہیں کہ: اچھا! اب اس کام کو تم ہی انجام دو۔

چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی آدمی کو چاہیے کہ اپنی ذات کے اوپر اعتماد نہ کرے، ہر کام میں اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ کام کرواسکتا ہے، اور کسی کا سامنے چل کر عہدہ مانگنا؛ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بجائے اپنی ذات پر اعتماد کی دلیل ہے۔

عمدہ مثال

جیسے: ایک باپ کئی فیکٹریوں کا مالک ہے، اس کے ماتحت کئی طرح کے کام ہیں، اس کے بیٹوں میں سے ایک بیٹا کہتا ہے کہ: ابا جان! مجھے فلاں پوسٹ دیدو، میں اس عہدہ پر کام کروں گا، اپنی طرف سے اس نے ابا سے یہ فرمائش کی کہ مجھے اس عہدہ پر کام کرنا ہے۔ تو اس کی طرف سے یہ فرمائش کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ یوں سمجھتا ہے کہ میں اس عہدہ کا حقدار اور اہل ہوں، اور میں اس کام کو برابر انجام دوں گا۔ ویسے باپ کی خواہش تو یہ تھی کہ وہ دوسرے کو دیتا، لیکن یہ سامنے سے مانگ رہا ہے۔

ایک شکل یہ تھی کہ اس نے مانگا نہیں، بلکہ باپ نے کہا کہ تم یہ کام کرو، اور وہ منع کرتا ہے کہ ابا جان! مجھے نہیں چاہیے، اس کے منع کرنے کے باوجود جب باپ وہ کام

سونپے گا، تو پھر اس پر برابر نظر بھی رکھے گا، ذرّہ بھی اِدھر اُدھر ہوگا تو فوراً باپ اس کو ڈائریکشن دے گا کہ بیٹا! ایسا نہیں، بلکہ ایسا کرو۔ ہمہ تن اس کی طرف متوجہ رہے گا کہ کہیں چوک نہ ہوجائے۔ لیکن جس نے خود ہی مانگا ہے، اور کہیں گڑبڑ کا موقع آئے گا تو باپ سوچے گا کہ چلو! دیکھتے ہیں وہ کیا کرتا ہے؟ بہت اکڑتا تھا کہ میں کر کے دوں گا تو اب دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کرتا ہے؟ قدرت کی طرف سے بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

بہتر کام کو انجام دینے کے لیے قسم توڑنا

اس روایت میں دوسری چیز یہ بتلائی گئی کہ کسی بات پر قسم کھائی ہو، اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی کام تمہیں اچھا معلوم ہوا، جیسے: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی معاملہ پر آدمی قسم کھالیتا ہے کہ فلاں جگہ نہیں جاؤں گا، لیکن وہاں جانے میں ہی خیر معلوم ہوتی ہے۔ یا کسی نے قسم کھالی کہ میں فلاں سے بات نہیں کروں گا، لیکن جب مسئلہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایسی قسم کھانا جائز نہیں ہے، اس لیے اس قسم کو توڑو اور اس سے بات کرلو۔ جب بات کروگے تو قسم ٹوٹے گی، تو اس کا کفارہ دیدو۔ تو کسی کام کی قسم کھائی اور دوسرا کام سامنے آیا جو اس سے بہتر ہے تو ایسی قسم کو چھوڑ کر دوسرے اچھے کام کو انجام دینا چاہیے، اور قسم ٹوٹنے کا کفارہ دے دینا چاہیے۔

پہلے بھی کئی بار یہ قصہ بتا چکا ہوں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت مسطح بن اُثاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق قسم کھائی تھی کہ ان کو خرچہ نہیں دوں گا، پھر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی جس میں کہا گیا کہ: معاف کردو، اللہ تعالیٰ معافی کو پسند کرتا ہے، کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؛ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خرچہ دینا شروع کردیا۔ کسی پر خرچ نہ کرنے کے مقابلہ میں اس پر خرچ کرنا اچھا کام

ہے، چناں چہ اس کو اختیار کرنے پر قسم کا کفارہ دیدیا۔

کسی دو آدمیوں کے اوپر بھی امیر مت بننا

۶۷۵:وعن أَبي ذرٍّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: يَا أَبَاذَرٍّ! إِنِّي أَرَاكَ ضَعِيفاً، وَإِنِّي أُحِبُّ لَكَ مَا أُحِبُّ لِنَفْسِي. لاَ تَأَمَّرَنَّ عَلَى اثْنَيْنِ، وَلاَ تَوَلَّيَنَّ مَالَ يَتِيمٍ.

ترجمہ:- حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ابوذر! میں تمھیں کمزور پاتا ہوں (یعنی تمہارا حال دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ تم میں ضعف و کمزوری ہے) اس لئے میں تمہارے لئے وہی بات پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں؛ لہٰذا دو آدمیوں پر بھی امیر مت بننا، اور کسی یتیم کے مال کا والی مت بننا۔

افادات:- امیر اور سربراہ بننا بڑی ذمہ داری کا کام ہے، چاہے کسی بھی شعبہ میں ہو، اس کی وجہ سے بہت بوجھ سر پر آجاتا ہے۔ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم کمزور ہو، لہٰذا دو آدمیوں کے اوپر بھی امیر اور سربراہ مت بننا۔ اور کسی یتیم کے مال کا والی مت بننا، اس لئے کہ یتیم کے مال کی ذمہ داریاں بھی بہت بڑی ہیں، ذرّہ برابر بھی اس میں اِدھر اُدھر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا سخت جواب دینا پڑے گا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ لوگوں میں بھی اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض وہ ہوتے ہیں کہ جن کو اس طرح کی ذمہ داری اگر سونپی جائے اور وہ اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کے پیشِ نظر یہ سمجھتا ہو کہ میں اپنی کمزوری کی وجہ سے اس ذمہ داری کو پورے طور پر کما حقہٗ ادا نہیں کرسکوں گا، تو پھر اس کو چاہیے کہ ایسی ذمہ داری قبول نہ کرے۔

امارت سببِ ندامت

۶۷۶:- وعنه، قَالَ: قُلْتُ: يَا رسول الله! أَلاَ تَسْتَعْمِلُنِي؟ فَضَرَبَ بِيَدِهِ

عَلَى مَنْكِبِي، ثُمَّ قَالَ: يَا أَبَا ذَرٍّ! إِنَّكَ ضَعِيفٌ، وإنها أمانةٌ، وَإِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ، إِلَّا مَنْ أَخَذَهَا بِحَقِّهَا، وَأَدَّى الَّذِي عَلَيْهِ فِيهَا. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں نے خود ہی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی: اے اللہ کے رسول! آپ مجھے کسی جگہ کا عامل (حکمران) نہیں بناتے؟ (فلاں کو آپ نے فلاں جگہ بھیجا، فلاں کو فلاں جگہ؛ مجھے بھی کسی جگہ کا امیر بنادو، حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میری اس درخواست پر) نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: اے ابوذر! تم کمزور ہو، اور کسی جگہ کا تم کو امیر بنادیا جانا (ایک طرح کا منصب وعہدہ ہے، جو) ایک طرح کی امانت ہے (یہ دنیا میں تو بہت اچھا لگتا ہے کہ بڑائی ملتی ہے، عہدہ ومنصب ملتا ہے) لیکن (اگر اس کا حق ادا نہیں کیا گیا تو) قیامت کے روز یہی چیز رسوائی اور ندامت کا سبب ہوگی۔ ہاں! جو اس کا حق ادا کرے اور اس ذمہ داری کو قبول کرنے پر جو جو کام سر پر آتے ہیں، ان کو پورے طور پر انجام دے؛ تب تو ٹھیک ہے۔

افادات:- اس روایت کو لاکر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اپنی طرف سے تو سوال کرنا ہی نہیں چاہیے؛ لیکن اگر سامنے سے کوئی ذمہ داری دی جارہی ہو تو اس کو چاہیے کہ برابر دیکھ لے کہ یہ ذمہ داری جو میرے حوالہ کی جارہی ہے اس کو میں پورے طور پر انجام دے سکتا ہوں یا نہیں؟ اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لئے جن وسائل اور اسباب، جن کمالات وخوبیوں، جس صلاحیت اور قابلیت کی ضرورت ہے وہ مجھ میں ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو پھر اس کو قبول نہ کرے، اس لئے کہ اس صورت میں اس کا حق ادا نہ ہو سکے گا، اور حق ادا نہ ہونے کی صورت میں ظاہر ہے کہ امانت میں خیانت ہوگی اور قیامت کے روز رسوائی ہوگی۔

۶۷۷:- وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ أن رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال: إِنَّكُمْ

سَتَحْرِصُونَ عَلَى الإِمَارَةِ، وَسَتَكُونُ نَدَامَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم لوگ امارت (حکمرانی، کرسی ومنصب) کی حرص ولالچ رکھو گے، آرزو رکھو گے اور تمنا کرو گے؛ لیکن یہی چیز قیامت کے روز ندامت اور پچھتاوے کا ذریعہ بنے گی۔

افادات:- فلاں عہدہ مجھے مل جائے، میں صدر بن جاؤں، میں سیکریٹری بن جاؤں، لیکن یہی چیز قیامت کے روز ندامت اور خسارہ کا ذریعہ بنے گی۔ اس روایت میں بھی وہی بات ارشاد فرمائی گئی جو اوپر گزر چکی ہے کہ مانگنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد نہیں ہوگی، اور مدد نہ ہونے کی صورت میں اس کے حقوق کی ادائیگی میں جو حق تلفی ہوگی اور کمی رہ جائے گی، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے روز سزا بھگتنی پڑے گی۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم حرص تو رکھتے ہو، لیکن یہی چیز قیامت میں ندامت کا ذریعہ بنے گی۔

حَثُّ السُّلْطَانِ وَالْقَاضِیْ وَغَیْرِهِمَا مِنْ وُلَاةِ الْأُمُوْرِ عَلٰی إِتِّخَاذِ وَزِیْرٍ صَالِحٍ وَتَحْذِیْرِهِمْ مِنْ قُرَنَاءِ السُّوْءِ

بادشاہ اور قاضی وغیرہ حکمرانوں کو اپنے لئے صالح مشیر رکھنے کی ترغیب اور برے ساتھیوں سے بچنے کی تاکید

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

صالح آدمی کو مشیر بناؤ

اس باب میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ حکمران جن کے ہاتھ میں کرسی کی وجہ سے کچھ پاورس اور اختیارات ہیں، چاہے حاکمِ اعلیٰ ہو، کسی جگہ کا گورنر یا کلکٹر ہو، قاضی ہو، یا جتنے بھی سربراہانِ مملکت ہیں؛ ان کو چاہیے کہ کسی صالح آدمی کو اپنا مشیر مقرر کرلیں۔ اس لیے کہ جتنے بھی ذمہ دار اور حکمران ہوتے ہیں ان کے پاورس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کے آس پاس بہت سارے لوگ جمع ہوجاتے ہیں جو ان کو مشورہ دینے کا کام کرتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں کو چاہیے کہ کسی صالح اور نیک آدمی کو- جو اس کام کی صلاحیت بھی رکھتا ہو- اپنے لیے مشیر مقرر کرلیں۔ اور بُرے رفقاء اور ساتھیوں سے اپنے آپ کو بچائیں اور ایسوں کی بات ماننے سے بچیں؛ ورنہ یہی لوگ ان کے لیے ہلاکت کا اور جہنم میں ڈھکیلے جانے کا ذریعہ بن جائیں گے۔

دنیا کی دوستیاں قیامت کی دشمنیاں

اس سلسلہ میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآنِ پاک کی ایک آیت پیش کی ہے جو اپنے عام مفہوم کے لحاظ سے یہاں بھی صادق آتی ہے: ﴿اَلۡاَخِلَّآءُ یَوۡمَئِذٍۭ بَعۡضُہُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الۡمُتَّقِیۡنَ﴾ (سورۂ زخرف:۶۷) دنیا کے اندر آپس میں جو دوستیاں کی جاتی ہیں، خاص کر وہ دوستیاں جو اپنی اغراض کی بنیاد پر ہوتی ہیں، ایسی سب دوستیاں قیامت کے روز دشمنیوں میں تبدیل ہوجائیں گی، اور جب وہاں اس کا نتیجہ ظاہر ہوگا تو یہ سب ایک دوسرے کے خلاف بارگاہِ الٰہی میں مقدمہ دائر کریں گے کہ اس نے میرا یوں کیا اور توں کیا ﴿اِلَّا الۡمُتَّقِیۡنَ﴾ البتہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں، اور

جن کا تعلق آپس میں اپنی اغراض کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی نسبت پر ہے، ایسی دوستی دنیا میں بھی کارآمد ہے اور آخرت میں بھی کام آئے گی کہ یہ دوستی دشمنی سے نہیں بدلے گی، بلکہ باقی رہے گی، اور اس سے ان شاء اللہ فائدہ بھی پہنچے گا۔

قاعدۂ کلیہ

۶۷۸:- وعن أَبي سعيدٍ وأَبي هريرة رضی اللہ عنہما أَنَّ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قالَ: مَا بَعَثَ اللهُ مِنْ نَبِيٍّ، وَلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِيفَةٍ إِلَّا كَانَتْ لَهُ بِطَانَتَانِ: بِطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالْمَعْرُوفِ وتَحُضُّهُ عَلَيْهِ، وَبِطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالشَّرِّ وَتَحُضُّهُ عَلَيْهِ، وَالْمَعْصُومُ مَنْ عَصَمَ اللهُ (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جو بھی نبی بھیجا، یا جس کو خلیفہ بنایا ہے، ان کے کچھ خصوصی مشورہ دینے والے ہوتے ہیں، جن میں کچھ لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں جو اس کو اچھا مشورہ دیتے ہیں اور بھلائی کے لیے آمادہ کرتے ہیں، اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو برا مشورہ دیتے ہیں اور برائی کے لئے آمادہ کرنے والے اور برائی کی ترغیب دینے والے ہوتے ہیں؛ لیکن معصوم تو وہی رہتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ بچالے۔

افادات:- "بِطَانَةٌ" ایسا آدمی جو بالکل اندر گھسا ہوا ہو، جس کا اس کے اوپر پورا پورا اثر ہوتا ہے، اور وہ مشورہ کے طور پر اپنی ہی بات منواتا ہے۔ اس روایت کے الفاظ پر غور کیجئے "مَا بَعَثَ اللهُ مِنْ نَبِيٍّ" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کے پاس بھی دونوں طرح کے لوگ ہوں گے۔

اس روایت میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اصول اور قاعدۂ کلیہ بتلادیا کہ اللہ

تعالیٰ کے یہاں یہی دستور ہے کہ اگر کسی کو کسی جگہ کی حکمرانی یا کسی جگہ کی کوئی ذمہ داری سونپی جاتی ہے- اور یہ حکم عام ہے، چاہے وہ سربراہِ اعلیٰ اور بادشاہِ وقت ہو، یا کسی صوبہ کی سربراہی ہو، یا اپنی قوم، اپنے خاندان، اپنے قبیلہ کی سرداری، ذمہ داری اور امارت ہو- تو اس امیر کے پاس اثرانداز جو حلقہ ہوتا ہے، اس میں دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اچھائی کا مشورہ دینے والے، بھلائی کی ترغیب دینے والے بھی ہوتے ہیں اور برائی کے لیے ابھارنے والے بھی ہوتے ہیں۔ جتنے بھی صاحبِ اختیار لوگ ہوں گے، جیسے: کسی کو کسی جماعت و برادری کا پریسیڈنٹ بنادیا گیا، کسی کو مدرسہ کا مہتمم بنادیا گیا، کسی کو مسجد کا متولی بنادیا گیا، ان سب کے لیے یہی قانون ہے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے خیر مقدر فرمائی ہے تو وہ اچھے مشورے دینے والوں ہی کی سنے گا، اس کی سمجھ میں انہی کی بات بیٹھے گی اور وہی کرے گا، دوسروں کی بات پر دھیان بھی نہیں دے گا، لہٰذا اچھا مشورہ دینے والوں کی وجہ سے اگر اچھا فیصلہ کرے گا وہ کام اچھے طریقے سے انجام پذیر ہوگا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق شاملِ حال نہیں ہے تو پھر غلط مشورے دینے والوں کی بات ہی اس کی کھوپڑی اور دماغ میں بیٹھے گی، اچھی راہ دکھانے والوں کی بات سمجھ میں ہی نہیں آئے گی اور ان کی نہیں مانے گا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی توفیق چھین رکھی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی آدمی ایسا ہے ہی نہیں جس کے پاس اچھی بات پہنچتی ہی نہ ہو۔

مصاحبین سے بدگمانیاں مت کرو

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کے آس پاس کے حلقہ کے بارے میں دوررہ کر بدگمانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہمارے سماج و معاشرہ میں صاحبِ

اختیار کے پاس بیٹھنے والوں کے متعلق بھی بہت زیادہ بدگمانیاں کی جاتی ہیں، اگر صاحبِ اختیار نے کوئی غلط فیصلہ اور اقدام کیا، تو کہیں نہ کہیں سے وہ بات اس کے کان میں پڑی ہوگی، لیکن ہم لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ متعین ہی کر دیتے ہیں کہ فلاں نے ہی ایسا کہا ہوگا، اس لیے اس نے ایسا کیا۔ ارے بھائی! کیا تم سننے گئے تھے کہ اس نے ہی یہ کہا ہے! ایسی بدگمانی بالکل غلط ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ دوسرا آدمی تو صرف بتلانے والا ہوتا ہے، کرنے والا تو خود وہی ہے، اور جب اس کی توفیق ہی چھین لی گئی ہے تو دوسرا کیا کرے گا۔ پھر بعض مرتبہ تو صرف بدگمانی کی بنیاد پر لوگ اس کے درپئے آزار ہو جاتے ہیں، حالاں کہ اس بات میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی، بعد میں جب حالات کا پتہ چلتا ہے اور حقیقت سامنے آتی ہے، تو پھر بدگمانی کرنے والے پچھتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہاں بھائی! دراصل اس نے تو بہت اچھے اچھے مشورے دئے تھے، لیکن اُسی نے نہیں مانے، ہم نے خواہ مخواہ ہی بدگمانیاں کیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی کے متعلق بدگمانیوں میں مبتلا نہ ہوا جائے، بلکہ اگر حکمران و ذمہ دار کی طرف سے غلط چیزیں ہو رہی ہیں تو اس کی خیر خواہی یہی ہے کہ اس کے لیے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھلائی کی توفیق دے، اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے گا تو وہ بھلی باتیں مانے گا اور اس کے مطابق فیصلے کرے گا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ قدرت کا یہ ایک نظام ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی کو اچھے مشورے دینے والے موجود ہی نہ ہوں، اس کے اردگرد ایسے لوگ ضرور ہوں گے۔ یہ اور بات رہی کہ توفیق نہ ہونے کی صورت میں وہ ان کی بات نہیں مانے گا اور جب توفیق ملے گی تو انہی کی مانے گا اور وہی کرے گا۔

اللہ تعالیٰ صاحبِ اختیار کے ساتھ جب بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں

۶۷۹:-وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: قَالَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: إِذَا أَرَادَ اللهُ بِالأَمِيرِ خَيْراً، جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ صدقٍ، إِنْ نَسِيَ ذَكَّرَهُ، وَإِنْ ذَكَرَ أَعَانَهُ، وَإِذَا أَرَادَ بِهِ غَيْرَ ذَلِكَ جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ سُوْءٍ، إِنْ نَسِيَ لَمْ يُذَكِّرْهُ، وَإِنْ ذَكَرَ لَمْ يُعِنْهُ.

(رواه أبو داود بإسنادٍ جيدٍ عَلَى شرط مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی امیر (حکمران اور سربراہ وذمہ دار، صاحبِ اختیار) کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو ایک مخلص اور خیرخواہ مشورہ دینے والا عطا فرماتے ہیں، اگر وہ بھلی بات کو بھولتا ہے تو یہ یاد دلاتا ہے، اور اگر اس کو یاد ہوتی ہے تو یہ مدد کرتا ہے، اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کسی امیر کے ساتھ دوسرا کوئی (یعنی برائی کا) ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے لیے برا مشورہ دینے والا ساتھی مقرر کر دیتے ہیں، وہ اگر اچھی بات بھولتا بھی ہے تو یہ اس کو یاد نہیں دلاتا ہے، اور اگر اس کو یاد ہوتا ہے تو اس کو انجام دینے میں ساتھ نہیں دیتا (مدد نہیں کرتا، سپورٹ نہیں کرتا)۔

افادات:- قدرت کے اُسی نظام و دستور کے متعلق- جو اوپر بیان کیا گیا تھا- اس روایت میں بالکل صاف صاف ارشاد فرما دیا ہے۔

النهي عن تولية الامارة والقضاء وغيرهما من الولايات لمن سألها أوحرص عليها فعرّض بها

امارت وقضاء وغیرہ عہدے، ان کا مطالبہ کرنے والوں یالالچ رکھنے والوں کودینے کی ممانعت

اس سلسلہ کا یہ آخری باب ہے۔ جوآدمی امارت ،عہدۂ قضاء، یاکسی بھی طرح کا عہدہ ومنصب مانگے ،اس کووہ عہدہ ومنصب دینے سے شریعت میں منع کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے بتایا جاچکا ہے کہ اسلام کا اصول تو یہی ہے کہ کوئی سامنے سے چل کر مانگے تومت دو، بلکہ زبان سے نہیں بولا لیکن اس کی حرص وطلب اورلالچ دل میں ہے، اوراپنے دل کی بات اشاروں میں ظاہر کررہاہے، تاکہ سامنے والاسمجھ جائے کہ وہ فلاں عہدہ ومنصب مانگ رہاہے؛ ایسے آدمی کوبھی وہ عہدہ ومنصب دینے سے منع کیا گیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ جس کے دل میں عہدہ کی خواہش پیداہوئی اس کواگر دوگے توخیر نہیں ہے۔ پہلے بھی یہ بات آچکی کہ تمہارے مانگنے پر اگردی گئی تواس کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مددنہیں ہوگی، اوراگر بغیر مانگے ملاتواس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری مدد کی جائے گی۔

جو کوئی عہدہ مانگے یا اس کی لالچ رکھے اس کو عہدہ نہیں دیتے

۶۸۰:-عن أَبی موسی الأشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: أَنَا وَرَجُلَانِ مِنْ بَنِي عَمِّي، فَقَالَ أَحَدُهُمَا: یارسول اللہ، أَمِّرْنَا عَلَی بَعْضِ مَا وَلَّاكَ اللہُ-عزوجل-. وقال الآخَرُ مِثْلَ ذَلِكَ. فَقَالَ: إِنَّا وَاللہِ لَا نُوَلِّي هَذَا الْعَمَلَ أَحَداً سَأَلَهُ، أَوْ أَحَداً حَرَصَ عَلَيْهِ.

ترجمہ:- حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، میرے ساتھ میرے دو چچازاد بھائی بھی تھے، ان دونوں میں سے ایک نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ: اے اللہ کے رسول! فلاں ذمہ داری کا کام اور عہدہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے اختیار میں دیا ہے؛ وہ میرے حوالے کیجیے۔ دوسرے نے بھی ایسی ہی بات کہی۔ اس پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کوئی عہدہ ہم سے مانگے، یا دل میں کسی عہدہ کی لالچ رکھے؛ ہم اس کو وہ عہدہ نہیں دیتے۔

افادات:- دوسری روایت میں ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: ابوموسیٰ! جاؤ! ہم تم کو مقرر کرتے ہیں، حالاں کہ ان کے دل میں اس کا خیال بھی نہیں تھا اور وہ اس مقصد کے لیے حاضر بھی نہیں ہوئے تھے، لیکن ان کو یمن کے ایک حصہ کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو آدمی خود عہدہ طلب کرے اسے نہیں دیا جائے۔ آج کل تو جمہوریت کا اصول ہی یہ ہے کہ الیکشن کے لیے آپ اپنا نام پیش کرو، جس میں پہلا کام ہی اپنی طرف سے مطالبہ پیش کرنے کا آتا ہے، حالاں کہ اوپر معلوم ہو چکا کہ جو عہدہ و منصب مانگنے سے ملا کرتا ہے اس میں سے اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد ہٹ جایا کرتی ہے، اور جو ذمہ داری بغیر مانگے ملا کرتی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوتی ہے، اس لیے ہمیں اسلام کی ان ساری تعلیمات کو مدِّ نظر رکھنی چاہئیں۔

كتاب الادب

باب الحياء وفضله

والحث على التخلق به

شرم کا بیان اور اس کی فضیلت

اور شرم اختیار کرنے کی ترغیب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حیاءاور شرم کسے کہتے ہیں؟

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب کے اخیر میں خود ہی حیاء کی وضاحت فرمائی ہے ویسے حیاء کی تشریح لغوی اعتبار سے یہ کی گئی ہے: "تَغَیُّرٌ وَإِنۡکِسَارٌ یَعۡتَرِی الۡاِنۡسَانُ مِنۡ خَوۡفِ مَا یُعَابُ بِہٖ وَیُلَامُ عَلَیۡہِ" ایسا کام جس کے کرنے کی وجہ سے آدمی پر کوئی داغ اور عیب آتا ہو، یا جس کے کرنے پر لوگ اس پر ملامت کرتے ہوں (کہ تم نے یہ کیا حرکت کی؟) ایسے ڈر سے آدمی کی طبیعت میں ایک طرح کی جو شکستگی پیدا ہوتی ہے اور پھر ایسے کام سے بچنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے؛ اسی کا نام حیاء ہے۔

جیسے: ایک آدمی کے دل میں سنیما دیکھنے کا خیال آیا لیکن وہ سوچتا ہے کہ اگر میں دیکھنے گیا تو لوگ کیا کہیں گے۔ جو بھی کام ایسا ہو جس کے کرنے پر لوگوں کی طرف سے اس پر نکتہ چینی اور ملامت ہوتی ہو، اس پر عیب لگتا ہو، اس خیال سے اس کام کے کرنے کا جذبہ اور حوصلہ ٹوٹے، طبیعت میں شکستگی پیدا ہو؛ اسی کا نام حیاء ہے۔

بعضوں نے اس کو انقباضی کیفیت کہا ہے: "إِنۡقِبَاضُ الۡاِنۡسَانِ عَنۡ اِرۡتِکَابِ مَا یُکۡرَہُ" ناپسندیدہ چیز جس کے کرنے سے آدمی کی طبیعت میں جو جھجک پیدا ہوتی ہے، جس کو گجراتی زبان میں (સંકોચ) کہتے ہیں، یعنی کسی برے کام کے کرنے سے طبیعت منقبض ہوتی ہے (સંકોચ) محسوس کرتی ہے؛ اسی کا نام حیاء ہے۔ یہ تو لغت اور ڈکشنری کے لحاظ سے حیاء کا معنیٰ ہوا۔

شریعت کے اعتبار سے بتایا ہے کہ یہ ایک وصف اور خُلُق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر جو وصف انسان کے دل میں پیدا کیے ہیں؛ ان کو خُلُق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تو جو وصف آدمی کو برے کام کے چھوڑنے پر آمادہ کرتا ہے، اور کسی بھی حق والے کے حق کی ادائیگی میں (حق کوئی بھی ہو، اللہ کا حق، بندوں کا حق) کوتاہی کرنے سے آدمی کو روکتا ہو؛ اس وصف کو شریعت کی اصطلاح میں ''حیاء اور شرم'' کہتے ہیں۔

شرم تو ایمان کا حصہ ہے

۶۸۱:-عن ابن عمرَ رضی اللہ عنہما أنَّ رسولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مَرَّ عَلَی رَجُلٍ مِنَ الأنْصَارِ وَهُوَ يَعِظُ أخَاهُ فِی الحَيَاءِ، فَقَالَ رسولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: دَعْهُ، فَإنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الإيْمَانِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گزر ایک انصاری کے پاس سے ہوا جو اپنے بھائی کو شرم کے سلسلہ میں نصیحت کر رہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نصیحت کرنے والے سے کہا: بھائی! چھوڑو بھی؛ (ایسی نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے) شرم والی خوبی بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔

افادات:- دوسری روایت میں موجود ہے کہ وہ کہہ رہا تھا کہ تو کتنی زیادہ شرم رکھتا ہے جس کی وجہ سے تجھے نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ جیسے: بعض آدمیوں کے مزاج میں اتنی حیاء ہوتی ہے کہ وہ اپنا حق جو دوسرے کے اوپر ہوتا ہے اس کے وصول کرنے میں بھی جھجھک محسوس کرتے ہیں، حیاء کی صفت ان کو سختی کرنے سے روکتی ہے اور سامنے والا اس کا حق نہیں دیتا تو یہ شرماتا اور سوچتا ہے کہ اس سے سختی کے ساتھ کیسے بات کروں۔ اس انصاری کا بھائی بھی ایسا ہی تھا، تو وہ اپنے بھائی کو نصیحت کر رہا تھا کہ اگر تو ایسا ہی کرتا رہے گا تو لوگ تجھے جینے نہیں دیں گے، ایسی شرم اچھی نہیں ہے، اتنا نرم بھی مت رہ، تھوڑا بہت پھُوں پھاں ([illegible]) کرنی چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نصیحت کرنے والے سے کہا: دَعْهُ! فَإنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الإيْمَانِ'' بھائی! ایسی نصیحت کرنے کی

ضرورت نہیں ہے، اس کو ایسا ہی رہنے دو؛ یہ شرم تو ایمان کا ایک حصہ ہے۔ گویا یہ بڑی قیمتی چیز ہے۔ یہ جو کر رہا ہے وہ کوئی برا کام نہیں ہے کہ اس پر آپ اس کو ڈانٹ رہے اور روک رہے ہیں! بلکہ یہ تو ایمان کا تقاضہ ہے، اور یہ وصف جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی اچھا ہے، اس میں کوئی برائی نہیں ہے، اس میں خیر ہی خیر اور بھلائی ہی بھلائی ہے۔ اگر چہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اس سے کچھ نقصان ہو رہا ہے لیکن حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

۶۸۲:-وعن عمران بن حصينٍ رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: الْحَيَآءُ لَايَأْتِي إِلاَّ بِخَيْرٍ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وفي روايةٍ لمسلمٍ: الحيآءُ خَيْرٌ كُلُّهُ. أَوْ قَالَ: الْحَيَآءُ كُلُّهُ خَيْرٌ.

ترجمہ:- حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے (اسی واقعہ میں یہ بھی آیا ہے کہ وہ بھائی جو نصیحت کر رہا تھا اس سے) نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: حیاء اور شرم تو پوری کی پوری بھلائی اور خیر ہی خیر ہے، اس میں کوئی بری چیز ہے ہی نہیں (اس لئے اس بارے میں کوئی نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔)

ایمان کی ایک شاخ

۶۸۳:-وعن أَبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ رسولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: الإيمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ أَوْ بِضْعٌ وَسِتُّونَ شُعْبَةً: فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ: لَآ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ، وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَالحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الإيمَانِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((البِضْعُ)) بكسر الباءِ ويجوز فتحها: وَهُوَ مِنَ الثَّلاَثَةِ إِلَى الْعَشَرَةِ. وَ((الشُّعْبَةُ)): القِطْعَةُ وَالْخَصْلَةُ. وَ((الإمَاطَةُ)): الإِزَالَةُ. وَ((الأَذَى

)): مَا يُؤْذِي كَحَجَرٍ وشوكٍ وَطِينٍ ورمادٍ وَقَذَرٍ وَنَحْوِ ذَلِكَ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایمان کی ستّر (۷۰) سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، اور ایک روایت میں ہے کہ ایمان کی ساٹھ (۶۰) سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، جس میں سب سے اعلیٰ درجہ ''لا الٰہ الا اللہ'' ہے، اور سب سے کم درجہ تکلیف دینے والی چیز (پتھر یا کانٹا، وغیرہ) کو راستہ سے ہٹانا ہے، اور حیاء بھی ایمان کی ایک بڑی شاخ ہے۔

افادات:- حیاء اور شرم کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کو الگ سے بیان کیا۔ ایمان کے نتیجہ میں آدمی کو جتنے بھی اچھائی کے کام کرنے ہیں، یا جن برائی کے کاموں سے اپنے آپ کو بچانا ہے، ان تمام اچھائی کے کاموں پر آمادہ کرنے والی اور تمام برائی کے کاموں سے آدمی کو روکنے والی چیز حیاء ہی ہے۔

حقیقی حیاء اور شرم

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابہ سے ارشاد فرمایا: اسْتَحْيُوا مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ. قَالَ: قُلْنَا يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّا لَنَسْتَحْيِي وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ. قَالَ: لَيْسَ ذَاكَ، وَلَكِنَّ الاِسْتِحْيَاءَ مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ أَنْ تَحْفَظَ الرَّأْسَ وَمَا وَعَى، وَتَحْفَظَ الْبَطْنَ وَمَا حَوَى، وَتَتَذَكَّرَ الْمَوْتَ وَالْبِلَى، وَمَنْ أَرَادَ الآخِرَةَ تَرَكَ زِينَةَ الدُّنْيَا. فَمَنْ فَعَلَ ذَلِكَ فَقَدِ اسْتَحْيَا مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ. (ترمذی شریف: ۲۴۶۶) اللہ تعالیٰ سے ایسی شرم رکھو جیسی شرم رکھنی چاہیے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم تو الحمد للہ شرم رکھتے ہیں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایسی بات نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے حقیقی شرم یہ ہے کہ آدمی اپنے سر کی اور جن چیزوں کو سر

لئے ہوئے ہے؛ ان سب کی حفاظت کرے۔ یعنی آنکھیں، زبان، کان، خیالات، عقائد، تصورات؛ یہ ساری چیزیں سر سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان سے کوئی ایسی بات نہ ہو جو شریعت کے تقاضہ اور حکم کے خلاف ہو۔ اور پیٹ کی اور جن چیزوں کو پیٹ اپنے اندر لئے ہوئے ہے؛ ان سب کی حفاظت کرے۔ یعنی حرام لقمہ سے پیٹ کو بچائے اور غلط طریقہ سے کسی کا مال ہڑپ کرنے سے اپنے آپ کو بچائے۔ اور آدمی موت کو اور موت کے بعد گل سڑ جانے کو یاد رکھے۔ اور جو آدمی آخرت چاہتا ہے وہ دنیا کی زینت کو چھوڑ دے یعنی آخرت کو دنیا کے مقابلہ میں ترجیح دے؛ اسی کا نام اللہ تعالیٰ سے حقیقی حیاء ہے

گویا آدمی اپنے پورے جسم کی اس طرح حفاظت کرے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں مبتلا ہونے کی نوبت نہ آئے، اور سارے حقوق ادا ہوں، دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دے، گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے؛ اسی کو استحضار کی کیفیت کہا جاتا ہے کہ ہر وقت آدمی یہ سوچے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے۔ اسی لئے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حدیثِ جبرئیل میں جس چیز کو احسان سے تعبیر کیا گیا ہے، ترمذی شریف کی اس روایت میں بھی وہی مقصود ہے۔ جب آدمی میں استحضار والی یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی؛ تو پھر ان شاء اللہ وہ کبھی گناہ نہیں کرے گا۔

اور ایک روایت میں یہ بھی ہے، حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَلْحَيَاءُ وَ الْإِيمَانُ قُرِنَا جَمِيعًا، فَإِذَا رُفِعَ أَحَدُهُمَا رُفِعَ الْآخَرُ (المستدرك على الصحيحين: ۸۵) حیاء اور ایمان دونوں جوڑی ہیں، ایک جاتا ہے تو دوسرا بھی جاتا ہے۔

بے حیائی کی منظّم سازش

اسی لئے اسلام کے دشمنوں نے خاص کر یہودیوں نے آج سے دو صدی پہلے

اٹھارہویں صدی میں پورے عالَم پر اپنا تسلط جمانے کے لئے کچھ فیصلے کئے تھے جو یہودیوں کا پروٹوکول (Protocol) کہلاتا ہے کہ آئندہ ہمیں اپنا نظام کس طرح کا چلانا ہے، ان فیصلوں میں انہوں نے ایک بات یہ طے کی تھی کہ بے حیائی کو ایسی عام کردو کہ آدمی کے مزاج میں سے حیاء اور شرم کا مادّہ ہی ختم ہوجائے۔ آج کل ٹی وی اور انٹرنیٹ پر جتنے بھی پروگرام آتے ہیں اور میڈیا کے مختلف میگزین کے ذریعہ جن کی تشہیر کی جاتی ہے، جو مستقل ایک فن بن چکا ہے، ان ساری چیزوں کی جڑ اور بنیاد شرم وحیاء کے مادّے کو ختم کرنا ہے۔ اسی لئے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُولَى، إِذَا لَمْ تَسْتَحِي فَافْعَلْ مَا شِئْتَ (صحیح البخاری:۶۱۲۰) تمہارے اندر سے جب شرم کا مادّہ ختم ہوجائے تو پھر جو چاہو کرو۔ یہ حیاء ہی ہے جو آدمی کو گناہوں سے روکتی ہے، ایک مرتبہ کسی نے حیاء والی دیوار کو ڈھادیا؛ تو پھر وہ کسی بھی طرح کی حرکت کرنے میں جھجھک محسوس نہیں کرتا۔

عام طور پر عورت کے مزاج میں حیاء اور شرم ہوا کرتی ہے، لیکن بعض عورتوں کو دیکھا ہوگا کہ جب ان کے اندر سے صفتِ حیاء ختم ہوجاتی ہے، تو پھر کوئی بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا، سب ان سے ڈرتے ہیں۔ کوئی عورت جب بے حیا ہوکر سامنے آتی ہے تو پھر وہ نہ باپ کی عزت کو خاطر میں لاتی ہے، اور نہ بیٹے اور شوہر کو خاطر میں لاتی ہے، پھر تو کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ حیاء اور شرم ایک بڑا پردہ اور آڑ ہے، اور ہر انسان کے مزاج میں اللہ تعالیٰ نے یہ وصف رکھا ہے، اگر یہ وصف ختم کردیا جائے، اور ایسی محنت کی جائے کہ مزاج میں سے یہ مادّہ ختم ہوجائے؛ تو پھر وہ ہر طرح کا اقدام کرنے کے لئے تیار ہوجائے گا اور کوئی طاقت اس کو روک سکتی نہیں ہے۔ ’’بے حیاء باش وہرچہ خواہی کُن‘‘ بے شرم بنو اور پھر جو چاہو کرو۔ گجراتی میں کہاوت ہے:

''નાંગા ને ન્હાવાનું અને નિચોડવાનુ શું''

یعنی ننگے بن گئے تو بس پھر سب کچھ ختم ہوگیا۔ جب آدمی میں سے حیاء ختم ہوجاتی ہے تو اس کا مزاج اسی قسم کا بن جاتا ہے۔ اسی لئے حیاء کی بڑی اہمیت ہے، اسلام نے اپنے اخلاقی نظام کی بنیاد جن چیزوں پر رکھی ہے اس میں عفت اور حیاء بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اسی لئے اخلاقی نظاموں کو برباد کرنے والے جتنے بھی لوگ ہیں ان کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ آدمی میں سے حیاء کے مادّہ کو ختم کردیا جائے، جب یہ مادّہ ختم ہوجائے گا تو پھر آدمی ساری برائیاں آسانی سے قبول کرتا چلا جائے گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شرم وحیاء

۶۸۴:-وعن أَبِي سعيدٍ الخدري رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: كَانَ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم أَشَدَّ حَيَاءً مِنَ العَذْرَاءِ فِي خِدْرِهَا، فَإِذَا رَأَى شَيْئاً يَكْرَهُهُ عَرَفْنَاهُ فِي وَجْهِهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

قَالَ العلماءُ: حَقِيقَةُ الحَيَاءِ خُلُقٌ يَبْعَثُ عَلَى تَرْكِ القَبِيحِ، وَيَمْنَعُ مِنَ التَّقْصِيرِ فِي حَقِّ ذِي الحَقِّ.

وَرَوَيْنَا عَنْ أَبِي القاسم الْجُنَيْدِ رَحِمَهُ اللهُ قَالَ: الحَيَاءُ: رُؤْيَةُ الآلاءِ- أَيِ النِّعَمِ- ورُؤْيَةُ التَّقْصِيرِ، فَيَتَوَلَّدُ بَيْنَهُمَا حَالَةٌ تُسَمَّى حَيَاءً. (والله أعلم)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شرم وحیاء میں کنواری لڑکی سے جو اپنے پردہ میں ہوکہیں زائد بڑھے ہوئے تھے، جب آپ کو کوئی بات ناگوار ہوتی تو ہم آپ کے چہرہ سے پہچان لیتے (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غایتِ شرم کی وجہ سے اظہارِ ناپسندیدگی بھی نہ فرماتے تھے)

افادات:- ''کنواری لڑکی اپنے پردہ میں ہو'' کے دو مطلب علماء نے

لکھے ہیں۔ایک جماعتِ علماء نے یہ فرمایا ہے کہ: اس سے پردہ نشین کنواری مراد ہے کہ وہ اس کنواری لڑکی سے جو باہر پھرتی ہو، بہت زیادہ شرمیلی ہوتی ہے، گو کنواری ہر ایک ہی شرم دار ہوتی ہے۔اسی لیے شریعت نے کنواری لڑکی کے نکاح کی اجازت کے لیے اس کے سکوت کو کافی بتایا ہے کہ کنواری کے لیے شرم طبعی چیز ہے، اور بالخصوص پردہ دار لڑکی۔

اور بعض علماء نے پردہ نشین سے وہ لڑکی مراد لی ہے جو پردہ میں تربیت دی گئی ہو کہ اس کو عورتوں سے بھی پردہ کرایا گیا ہو۔ چناں چہ باہر پھرنے والی عورتوں سے اس کا پردہ کرانا بہت سے خاندانوں میں آج بھی مروج ہے۔ یہ لڑکی جس قدر شرمیلی ہوگی ظاہر ہے۔

دوسرا مطلب بعض علماء نے اپنے پردہ میں ہونے سے کنایہ بتایا ہے شبِ عروس کا۔ کہ کنواری لڑکی پہلی شب میں جس قدر شرمیلی ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔

باب حفظ السر

کسی کے بھید کی حفاظت کرنا

راز داری سے کام لینا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

رازداری کے اصول

نیا عنوان قائم کیا ہے کہ کسی آدمی نے اپنے کسی معاملہ میں، اپنی کسی بات میں، یا آپ کے ساتھ کئے گئے کسی سلوک میں آپ سے یہ امید قائم کی کہ آپ اس کو راز میں رکھیں گے، کسی کے سامنے اس کا اظہار نہیں کریں گے؛ تو پھر آپ کی یہ ذمہ داری ہوجاتی ہے کہ اس راز کی حفاظت کریں، کسی کے سامنے اس کا اظہار نہ کریں، البتہ اگر وہ بات خلافِ شرع ہے اور اس کی وجہ سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے، تو پھر اس کے راز کا لحاظ رکھنا لازم نہیں ہے۔ مثلاً: کسی نے آپ کو بتلایا کہ میں فلاں کے گھر میں چوری کرنے والا ہوں، اور دیکھو! یہ راز کی بات ہے، تم کسی کو بتلانا مت۔ اب آپ بھی یہ سوچیں کہ شریعت میں رازداری کی تاکید آئی ہے، اس کا لحاظ کرتے ہوئے آپ کسی کو واقف نہ کریں؛ تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ آدمی جو حرکت کرنے والا ہے وہ تو گناہ کا کام ہے، اس کے نتیجہ میں خدا کے دوسرے بندے کو نقصان پہنچنے والا ہے، اس کو نقصان سے بچانے کے لیے اس کے اس راز سے آگاہ کردیا جائے تو یہ عمل شریعت کے رازداری والے حکم کے خلاف شمار نہیں ہوگا۔

صریح راز

اب یہ راز کی جو بات ہوتی ہے اس میں کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بات کرنے والا خود ہی زبان سے صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ یہ بات میں آپ کو راز کے طور پر بتارہا ہوں؛ تب تو بات صاف ہے، اور اس صورت میں اس کو راز ہی سمجھا جائے گا، اس کی حفاظت کرنا ضروری ہوجائے گا، اس کا کسی کے سامنے اظہار کرنا غلط کام ہوجائے گا،

اس میں اپنی طرف سے کوئی دوسرا مطلب نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

راز کا انداز

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے اس بات کا اظہار تو نہیں کرتا کہ یہ راز ہے، لیکن وہ انداز ایسا اختیار کرتا ہے جس کی وجہ سے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اپنی بات کو راز میں رکھنا چاہتا ہے، جیسے: آپ کو اپنے پاس بلا کر وہاں موجود دوسرے لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ ذرا ہٹ جائیے، مَیں ان سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ یا آپ سے بات شروع کرنے سے پہلے اِدھر اُدھر برابر دیکھا کہ کوئی سن تو نہیں رہا ہے، اور اطمینان کرنے کے بعد آپ سے بات کی؛ تو اس صورت میں اگر چہ اس نے اپنی زبان سے یہ نہیں کہا ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ راز کے طور پر ہے، لیکن جو انداز اختیار کیا گیا وہ خود بتلا رہا ہے کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ بطورِ راز اور بھید کے ہے، آپ کو اس کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرنا ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بات کرنے سے پہلے کوئی آدمی اگر دائیں بائیں دیکھے اور پھر وہ کوئی بات آپ سے کہے؛ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ راز کی بات ہے، اب آپ کو اس بات کی حفاظت کرنی ضروری ہے۔

یہ بھی راز ہے

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپس کے کچھ معاملات رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں ایک فریق کے دوسرے فریق کے ساتھ کچھ مخصوص تعلقات ہوتے ہیں جن کی شریعت کی طرف سے اجازت بھی دی گئی ہے، ان کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ساتھ کوئی سلوک کرتے ہیں، مثلاً: میاں بیوی کا تعلق و رشتہ ہے جن کی بنیاد پر آپس میں

کچھ معاملات اور باتیں ایسی ہوتی ہیں جو سب کے سامنے انجام نہیں دی جاتیں؛ وہ بھی راز ہیں۔ شریعت اس کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی، جیسا کہ حدیث میں صراحتاً موجود ہے، اور اس کے اظہار پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ اس لیے آدمی یہ نہ سمجھے کہ مرد اپنے دوستوں کے سامنے، یا عورت اپنی سہیلیوں کے سامنے ان باتوں کو ظاہر کر سکتی ہے۔ شریعت نے اس کو سخت گناہ قرار دیا ہے۔

یا کاروباری اعتبار سے دو آدمی شریک اور پارٹنر ہیں، اپنے کاروبار سے تعلق رکھنے والے کچھ معاملات اور چیزیں ہیں جن سے کسی اور کو کوئی نقصان بھی نہیں ہے، تو وہاں پر بھی ان راز اور بھیدوں کا لحاظ کیا جائے گا، اگرچہ بعد یہ شراکت باقی نہ بھی رہے تب بھی ان کو ایک دوسرے کی ان چیزوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راز دار کی راز داری

بہر حال! شریعت نے جن آداب اور حسنِ اخلاق کی تعلیم دی ہے، ان میں سے یہ بھی ہے کہ راز اور بھید سے تعلق رکھنے والی چیزوں کا کسی کے سامنے اظہار نہ کیا جائے۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک راز کی بات بتلائی تھی۔ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر بعض منافقین جو ساتھ میں آئے تھے انہوں نے سازش اور اسکیم تیار کی تھی کہ تبوک جانے کا راستہ بڑا طویل ہے اور راستہ میں پہاڑیاں اور بڑی سخت گھاٹیاں آتی ہیں، ان میں سے ایک پہاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے (نعوذ باللہ) اندھیرے میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ کر کے آپ کا کام تمام کر دیا جائے، وہ منافقین لشکر میں شامل تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سازش سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگاہ کر دیا اور ان منافقین کے نام بھی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتلا دیئے تھے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ناموں کا تذکرہ

بطورِ راز کے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیا اور ان منافقین کے نام بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو بتلائے جن کے متعلق بذریعۂ وحی اللہ تعالیٰ نے یہ بتلادیا تھا ان کی موت نفاق پر ہی آنے والی ہے، جن کو توبہ نصیب ہونے والی تھی ان کے نام نہیں بتلائے تھے، اس لیے کہ منافقین کی بڑی تعداد ایسی تھی جن کو موقع بموقع اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق عطا فرمائی تھی اور ان کی موت ایمان پر آئی تھی، لیکن بعض ایسے بھی تھے جن کی نفاق کی حالت ہی میں موت آئی، اور اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے بھی منع فرمادیا تھا، انہی میں سے منافقین کا سردار عبداللہ بن اُبی بھی تھا۔ اس کے جو بیٹے تھے جن کا نام بھی عبداللہ تھا، وہ مخلص مؤمن تھے۔ اور چوں کہ عبداللہ بن اُبی ظاہری طور پر اپنے آپ کو مسلمان بتلاتا تھا، جتنے بھی منافقین تھے وہ سب اپنی زبان سے تو ایمان ہی ظاہر کرتے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے بھی ان کے ساتھ اہلِ ایمان والا ہی معاملہ کیا جاتا تھا، یعنی جیسے ایک مسلمان کی جان و مال محفوظ ہے اسی طرح ان کی بھی جان و مال محفوظ سمجھی جاتی تھی، اس کے علاوہ اور معاملات کا بھی حال تھا، ان کے ساتھ کافروں جیسا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ عبداللہ بن اُبی کی طرف سے بہت سے مواقع پر ایسے کام رونما ہوئے تھے کہ جن کی وجہ سے اس کا منافق ہونا سب کے سامنے واضح ہو چکا تھا، بہت سے مواقع پر اس نے مسلمانوں کو اور خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کی تھیں۔ جب عبداللہ بن اُبی کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے حضرت عبداللہ نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے باپ کا انتقال ہو گیا ہے، آپ تشریف لاکر اس کے جنازہ کی نماز پڑھائیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے، جب جنازہ رکھا گیا اور آپ نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھے اور نماز شروع کرانا ہی چاہتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آگے بڑھے اور حضور کا کرتہ پکڑلیا اور کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! آپ اس کی نمازِ جنازہ

پڑھارہے ہیں؟ اس نے فلاں وقت یہ حرکت کی تھی، فلاں وقت یہ حرکت کی تھی۔ اسلام کے خلاف اس نے جو جو حرکتیں تھیں وہ سب گنوائیں اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق خود فرمایا ہے کہ اگر آپ ستّر مرتبہ بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کریں، تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے؛ پھر بھی آپ اس کی نمازِ جنازہ پڑھائیں گے؟ حضورِ اکرم ﷺ سب سنتے رہے، جب وہ خاموش ہو گئے تو حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان کی جنازہ کی نماز پڑھانے سے مجھے صاف صاف منع نہیں فرمایا ہے۔ خیر! آپ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور ابھی آپ وہاں سے ہٹے بھی نہیں تھے کہ آیت ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ﴾ نازل ہوئی، اور اس طرح آئندہ ان کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا، اور آپ کو یہ بھی بتادیا کہ منافقین میں کون کون ہیں جن کی موت نفاق پر آنے والی ہے، اور پھر آپ ﷺ نے ان کے نام حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی بتلا دیئے تھے، لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کبھی کسی صحابی کے سامنے ان کے ناموں کا اظہار نہیں کیا اسی لیے ان کا لقب ''صاحبُ سرِّ رسولِ اللہ'' یعنی ''حضورِ اکرم ﷺ کے راز دار'' تھا، البتہ چوں کہ ان کو معلوم تھا کہ فلاں فلاں کی موت نفاق پر آنے والی ہے اس لئے حضور ﷺ کی وفات کے بعد جب کسی کا انتقال ہوتا تو بعض محتاط صحابہ جیسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس بات کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے اور خبر نکلواتے تھے کہ دیکھو! جنازہ کی نماز میں حضرت حذیفہ موجود ہیں یا نہیں؟ اگر وہ حاضر ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شریک ہوجاتے، ورنہ نہیں جاتے تھے۔ اور ان کا کسی کے جنازہ میں حاضر نہ ہونا اس بات کا قرینہ اور علامت سمجھی جاتی تھی کہ یہ منافق تھا۔ بہرحال! یہ تو دوسرے دیکھتے تھے اور اندازہ لگا لیتے تھے، لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ اور یہ حضورِ اکرم ﷺ کی وفات کے بعد ایسا کرتے تھے، اس لیے کہ جب تک نبیٔ

کریم ﷺ موجود تھے وہاں تک تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، آپ ﷺ جس کی جنازہ کی نماز پڑھیں، اس سے معلوم ہوجاتا تھا کہ یہ مؤمن ہے، تو سب لوگ بھی پڑھ لیتے تھے۔

راز امانت ہوتے ہیں

میں یہ عرض کررہا تھا کہ کسی نے بھی کوئی چیز بطورِ راز اور بھید کے بتلائی ہو، اس کا لحاظ کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ راز ایک طرح کی امانت ہے، اور جس طرح امانت کی پاسداری ضروری ہے؛ اسی طرح راز اور بھید کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ چوں کہ اس نے آپ پر اعتماد و بھروسہ کیا ہے اس لئے اس کے خلاف کوئی کام نہیں کیا جاسکتا؛ ورنہ وہ خیانت قرار دیا جائے گا۔

عہد کے بارے میں سوال ہوگا

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُولًا﴾ جو عہد و پیمان اور ایگریمنٹ ہیں ان کو پورا کرو، اس لیے کہ قیامت کے روز آپس کے عہد و پیمان کے متعلق پوچھ ہوگی کہ ان کو پورا کیا یا نہیں؟ ان کے حقوق کو ادا کیا یا نہیں؟ جو راز اور بھید ہوتے ہیں وہ بھی ایک طرح کے عہد ہی ہوتے ہیں، اس لیے ان کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں بدترین شخص

۶۸۵:- عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: إِنَّ مِنْ أَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ الرَّجُلَ يُفْضِي إِلَى الْمَرْأَةِ وَتُفْضِي إِلَيْهِ، ثُمَّ يَنْشُرُ سِرَّهَا. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے برے مرتبہ والا اور سب سے بدترین آدمی وہ ہے کہ جو تنہائی میں اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کے لیے بے پردہ ہوا، اور بیوی بھی شوہر کے لیے بے پردہ ہوئی (میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے، ان کا اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے اور صحبت کے لیے ستر کھولا جائے گا) پھر وہ آدمی اپنی بیوی کا بھید لوگوں کے سامنے ظاہر کرتا پھرے۔

افادات:- یعنی شوہر ہونے کی حیثیت سے تنہائی میں جو معاملہ اپنی بیوی کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے، اور میاں بیوی کے تعلقات کے نتیجہ میں آپس جو کچھ بھی ہو رہا ہے؛ ظاہر ہے کہ وہ سب ایک طرح کا بھید اور راز ہے، اس لیے اگر شوہر کسی کے بھی سامنے- چاہے وہ جگری دوست ہی کیوں نہ ہو- اس کا اظہار کرتا ہے؛ تو قیامت کے روز ایسا آدمی اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں بدترین شخص ہوگا۔ یہی حکم عورت کا بھی ہے کہ اگر عورت اپنی سہیلیوں کے سامنے ایسی چیزوں کا اظہار کرتی ہے۔

چوں کہ عام طور پر یہ چیزیں مردوں کی طرف سے زیادہ پیش آتی ہیں، اس لیے مردوں کا تذکرہ کیا گیا، لیکن آج ایسا زمانہ آگیا ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلہ میں ایسی باتیں زیادہ کہنے لگی ہیں۔ بہر حال! یہ حکم دونوں کے لیے ہے کہ میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ایک طرح کا راز ہے جس کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کیا جا سکتا۔

راز داری کا ایک واقعہ

۶۸۶:- **وعن عبد اللہ بن عمر** رضی اللہ عنہما: أَنَّ عمرَ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حِيْنَ تَأَيَّمَتْ بِنْتُهُ حَفْصَةُ، قَالَ: لَقِيتُ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فَعَرَضْتُ عَلَيْهِ حَفْصَةَ، فَقُلْتُ: إِنْ شِئْتَ أَنْكَحْتُكَ حَفْصَةَ بِنْتَ عُمَرَ؟ قَالَ: سَأَنْظُرُ فِي أَمْرِي. فَلَبِثْتُ لَيَالِيَ ثُمَّ

لَقِيَنِي، فَقَالَ: قَدْ بَدَا لِي أَنْ لاَ أَتَزَوَّجَ يَوْمِي هَذَا. فَلَقِيتُ أَبَا بَكْرٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فقلتُ: إِنْ شِئْتَ أَنْكَحْتُكَ حَفْصَةَ بِنْتَ عُمَرَ؟ فَصَمَتَ أَبُو بَكْرٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فَلَمْ يَرْجِعْ إِلَيَّ شَيْئاً! فَكُنْتُ عَلَيْهِ أَوْجَدَ مِنِّي عَلَى عُثْمَانَ. فَلَبِثَ لَيَالِيَ ثُمَّ خَطَبَهَا النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فَأَنْكَحْتُهَا إِيَّاهُ. فَلَقِيَنِي أَبُو بَكْرٍ، فَقَالَ: لَعَلَّكَ وَجَدْتَ عَلَيَّ حِينَ عَرَضْتَ عَلَيَّ حَفْصَةَ فَلَمْ أَرْجِعْ إِلَيْكَ شَيْئاً؟ فَقُلْتُ: نَعَمْ. قَالَ: فَإِنَّهُ لَمْ يَمْنَعْنِي أَنْ أَرْجِعَ إِلَيْكَ فِيمَا عَرَضْتَ عَلَيَّ إِلاَّ أَنِّي كُنْتُ عَلِمْتُ أَنَّ النبيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذَكَرَهَا، فَلَمْ أَكُنْ لأُفْشِيَ سِرَّ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، وَلَوْ تَرَكَهَا النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لَقَبِلْتُهَا. (رواه البخاري)

((تَأَيَّمَتْ)) أيْ: صَارَتْ بِلاَ زَوْجٍ، وَكَانَ زَوْجُهَا تُوُفِّيَ. ((وَجَدْتَ)): غَضِبْتَ

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (راز سے تعلق رکھنے والا ایک واقعہ) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا (جو بعد میں اُم المؤمنین بنیں) کے پہلے شوہر کا جب انتقال ہوا (جن کا نام خُنَیس بن حذافہ سہمی تھا، غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے، غزوۂ اُحد میں زخمی ہوئے اور اسی میں ان کا انتقال ہوا) تو وہ بیوہ ہوئیں۔ جب عدت پوری ہوگئی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملا اور ان سے کہا: اگر تم چاہو اور تمہارے دل میں رغبت ہو تو میں اپنی بیٹی حفصہ کو تمہارے نکاح میں دیدوں (گویا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی صاحبزادی کا پیغامِ نکاح لے کر بذاتِ خود گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بات کی) حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں اس وقت تو یہ کہا کہ میں سوچوں گا، پھر چند دن گزرنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھ سے ملے اور کہا: سوچنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں آپ کی صاحبزادی سے نکاح کرنا نہیں چاہتا (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں) اس کے بعد میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملا اور

ان سے کہا: اگر تم چاہو تو مَیں اپنی بیٹی حفصہ کو تمہارے نکاح میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ میری اس پیشکش اور درخواست پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا (نہ ہاں کہا اور نہ منع کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں) مجھے ان پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں زیادہ ناراضگی ہوئی (اس لیے کہ انہوں اگرچہ "نا" کہا، لیکن جواب تو دیا، اور یہ تو کچھ بولتے ہی نہیں) خیر! پھر چند دن گزرے تھے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حفصہ کے لیے پیغامِ نکاح بھیجا، تو مَیں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکاح کرادیا۔ جب نکاح ہوگیا اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرے پاس ملاقات کے لیے آئے اور کہا: فلاں موقع پر تم نے مجھے اپنی صاحبزادی کے ساتھ نکاح کے لیے پیشکش کی تھی اور مَیں خاموش رہا تھا، شاید اس کی وجہ سے تم کو برا معلوم ہوا ہے، اور تم مجھ سے ناراض ہو؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: جی ہاں۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: بات دراصل یہ ہے کہ میں نے جواب اس لیے نہیں دیا تھا کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے سامنے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ کیا تھا (اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اندازِ تذکرہ سے مَیں یہ سمجھا تھا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارادہ ان کے ساتھ نکاح کرنے کا ہے۔ اگرچہ یہ بات آپ کو معلوم نہیں تھی لیکن مجھے تو معلوم تھی، اس لیے جب آپ نے میرے سامنے ان کے نکاح والی بات پیش کی تو چوں کہ وہ بات میرے علم میں تھی، اس لیے میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور یہ سوچا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو تذکرہ کیا ہے جس سے آپ کا ارادہ معلوم ہو رہا ہے) لیکن آئندہ چل کر اگر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے نکاح نہیں کریں گے، اور مجھے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارادہ نکاح کرنے کا نہیں ہے، تو مَیں آپ کی پیشکش قبول کرلوں گا (اس لیے جواب میں مَیں نے نہ "نا" کہا، اور نہ "ہاں" کہا۔ اگر "نا" کا جواب دیتا تو دروازہ بند ہو جاتا، اور اگر ہاں کہتا تو جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بات ارشاد فرمائی تھی اس کا لحاظ نہ رہتا۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ: پھر آپ مجھے بتا دیتے نا

کہ ایسی ایسی بات ہے۔ اس وقت کیوں نہیں بتایا؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا) میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھید کیسے کھول سکتا ہوں (یعنی جو خلاصہ میں ابھی کررہا ہوں۔ یہی خلاصہ اگر میں اس وقت کرتا تو چوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے سامنے تذکرہ کیا تھا اس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح کرنے کا ادارہ ہے، اور یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے سامنے ایک راز کے طور پر کہی تھی، اگر میں تمہارے سامنے وہ راز بتلا دیتا تو مطلب یہ ہوتا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راز کو تمہارے سامنے کھول رہا ہوں، اب جبکہ وہ معاملہ ہو چکا ہے تو آپ کی ناراضگی دور کرنے کی غرض سے میں اس بات کی وضاحت کررہا ہوں)

نکاح کا پیغام لڑکے والے بھیجیں یا لڑکی والے؟

افادات:- یہاں ایک مسئلہ اور آ گیا کہ نکاح کا پیغام لڑکے والے بھیجیں یا لڑکی والے؟ ویسے عورت کے احترام کا تقاضہ یہی ہے کہ لڑکے والوں کی طرف سے پیغام بھیجا جائے اور رشتہ کے لیے مطالبہ کیا جائے کہ ہم اپنے لڑکے کا تمہاری لڑکی سے رشتہ چاہتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے برعکس دوسری شکل جائز ہی نہیں، بلکہ اگر کسی موقع پر دیکھا کہ کوئی لڑکا نیک ہے اور جگہ بھی اچھی ہے اور ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ ہے، تو اس صورت میں لڑکی والے سامنے چل کر درخواست کریں اور مطالبہ کریں کہ اگر تم اپنے لڑکے کا ہماری لڑکی سے نکاح کرانا چاہو، تو ہم رشتہ دینے کے لیے تیار ہیں؛ یہ بھی شریعت سے ثابت ہے۔ دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے رشتہ کے لیے خود حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ اگر تم چاہو تو میں اپنی بیٹی حفصہ کا نکاح تم سے کردوں۔

ایک اور روایت بخاری شریف میں موجود ہے۔ اُم المؤمنین حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا

نے حضورِ اکرم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ میری بہن سے نکاح کر لیجیے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے پوچھا: کیا تم ایسا چاہتی ہو؟ اس لیے کہ کسی کے شوہر کے نکاح میں کوئی دوسری عورت آئے یہ تو عام طور پر عورت کا مزاج نہیں ہے، اس لیے حضور ﷺ نے ان کا امتحان لینے کے لیے پوچھا۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ کے نکاح ہوں، اور آپ کسی اور سے بھی نکاح تو کر ہی رہے ہیں، اور کسی بھی عورت کا آپ کے نکاح میں آنا اس کے لیے دنیا و آخرت میں بڑی سعادت کی بات ہے، تو میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ سعادت میری بہن کو نصیب ہو جائے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ میرے لیے حلال نہیں ہے، اس لیے کہ کسی عورت کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بہن سے نکاح کرنا حرام ہے۔ بہرحال! امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الجامع الصحیح'' میں مستقل ایک عنوان قائم کیا ہے: باب عَرْضِ الإِنْسَانِ ابْنَتَهُ أَوْ أُخْتَهُ عَلَى أَهْلِ الْخَيْرِ ''اس کے تحت اس روایت کو لائے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی والوں کی طرف سے پیشکش کی جا سکتی ہے۔ (بخاری شریف: رقم الحدیث: ۵۱۲۳)

آج ہمارے سماج میں اس کو معیوب سمجھ کر لڑکی والے بیٹھے رہتے ہیں یہاں تک کہ لڑکی کی عمر بڑی ہو جاتی ہے اور پھر زندگی بھر اس کا نکاح نہیں ہو پاتا۔ اس لیے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اگرچہ بہتر شکل تو وہی تھی کہ انتظار کیا جاتا، لیکن جب دیکھ رہے ہیں کہ وہ شکل نہیں بن رہی ہے تو پھر اپنی طرف سے پیش قدمی کر کے معاملہ کو نمٹانے کی ضرورت ہے، اس انتظار میں بیٹھے رہنا کہ سامنے سے رشتہ آئے تو شادی کریں گے اور رشتہ نہ آئے تو لڑکیوں کے نکاح نہ کرنا، یہاں تک کہ ساری زندگی اسی طرح گزر جائے، یہ پسندیدہ نہیں ہے، اس کے نتیجہ میں پھر بہت ساری برائیاں پھیلتی ہیں۔

فوائدِ حدیث

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر آپ کے کسی طرزِ عمل سے کسی کو ناراضگی ہوئی ہو، اور اسی وقت اس بات کا خلاصہ کرنے میں دوسری کوئی خرابی لازم آتی ہوتو آپ اس وقت خاموشی اختیار کر سکتے ہیں، بعد میں جب وہ خرابی نہ رہے، تو پھر آپ اس بات کا خلاصہ کر کے اس ناراضگی کو دور کرلیں۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے تذکرہ کیا تو انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارادہ ان سے نکاح کرنے کا ہے، تو آپ پیغام بھیجیں گے ہی! اس لیے اگر میں ابھی سے کہہ دوں تو اس میں کیا حرج ہے! اس لیے کہ اس وقت تو صرف آپ کا ارادہ معلوم ہوا تھا، اب معلوم نہیں کہ اس ارادہ میں پختگی آ کر آپ اس کو عملی جامہ پہناتے ہیں یا نہیں؟ اس لیے یہ چیز راز ہی کی تھی، اور انہوں نے اس کا لحاظ کیا۔ لیکن ہم لوگ ایسے معاملات میں ذرا فاسٹ (Fast) چل جاتے ہیں، اور یہی سوچنے لگ جاتے ہیں کہ جب ارادہ کا اظہار کیا ہے تو اگر میں ابھی کہہ دوں تو اس میں کیا حرج ہے! اگر سامنے والے نے کہا ہو کہ آپ کہہ دینا تب تو ٹھیک ہے، لیکن جب اس نے کہا نہیں ہے، بلکہ صرف اپنے ارادہ کا اظہار کیا ہے تو ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ اس بات کا کسی کے سامنے اظہار کریں۔

اور یہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ یہ بات راز کی ہے، بلکہ جس انداز سے تذکرہ کیا تھا اس سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سمجھ گئے تھے کہ میرے سامنے اس کا تذکرہ فرما رہے ہیں، کسی اور کے سامنے اس کا تذکرہ نہیں فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی اپنے کسی ارادہ کا اظہار صرف ہمارے ہی

سامنے کرے، کسی اور کے سامنے نہ کرے، جس سے پتہ چلے کہ وہ آئندہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے، تو یہ بھی اس کا راز ہے جس کا کسی دوسرے کے سامنے اظہار ہونا نہیں چاہیے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرض الوفات کا واقعہ

۶۸۷:- وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: كُنَّ أَزْوَاجُ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عِنْدَهُ، فَأَقْبَلَتْ فَاطِمَةُ رضی اللہ عنہا تَمْشِي، مَا تُخْطِئُ مِشْيَتُها مِنْ مِشْيَةِ رسولِ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شَيْئاً، فَلَمَّا رَآهَا رَحَّبَ بِهَا، وقال: مَرْحَباً بِابْنَتِي. ثُمَّ أَجْلَسَهَا عَنْ يَمِينِهِ أَوْ عَنْ شِمَالِهِ، ثُمَّ سَارَّهَا، فَبَكَتْ بُكَاءً شَدِيداً. فَلَمَّا رَأَى جَزَعَهَا، سَارَّهَا الثَّانِيَةَ، فَضَحِكَتْ. فقلتُ لَهَا: خَصَّكِ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مِنْ بَيْنِ نِسَائِهِ بِالسِّرَارِ، ثُمَّ أَنْتِ تَبْكِينَ! فَلَمَّا قَامَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سَأَلْتُهَا: مَا قَالَ لَكِ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟ قالت: مَا كُنْتُ لأُفْشِي عَلَى رسولِ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سِرَّهُ. فَلَمَّا تُوُفِّيَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قُلْتُ: عَزَمْتُ عَلَيْكِ بِمَا لِي عَلَيْكِ مِنَ الحَقِّ لَمَا حَدَّثْتِنِي مَا قَالَ لَكِ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟ فقالت: أَمَّا الآنَ فَنَعَمْ. أَمَّا حِينَ سَارَّنِي فِي المَرَّةِ الأُولَى، فَأَخْبَرَنِي أَنَّ جِبْرِيلَ كَانَ يُعَارِضُهُ القُرآنَ فِي كُلِّ سَنَةٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ، وَأَنَّهُ عَارَضَهُ الآنَ مَرَّتَيْنِ، وَإِنِّي لا أُرَى الأَجَلَ إِلَّا قَدِ اقْتَرَبَ، فَاتَّقِي اللهَ وَاصْبِرِي، فَإِنَّهُ نِعْمَ السَّلَفُ أَنَا لَكِ، فَبَكَيْتُ بُكَائِي الَّذِي رَأَيْتِ. فَلَمَّا رَأَى جَزَعِي سَارَّنِي الثَّانِيَةَ فَقَالَ: يَا فَاطِمَةُ! أَمَا تَرْضَيْنَ أَنْ تَكُونِي سَيِّدَةَ نِسَاءِ المُؤْمِنِينَ أَوْ سَيِّدَةَ نِسَاءِ هٰذِهِ الأُمَّةِ؟ فَضَحِكْتُ ضَحِكِي الَّذِي رَأَيْتِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام ازواجِ مطہرات مرض الوفات میں آپ کے پاس بیٹھیں ہوئی تھیں، اسی درمیان حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا

تشریف لائیں، ان کی چال حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چال سے ذرّہ برابر بھی فرق نہیں رکھتی تھی (جس طرح حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چلتے تھے، ہو بہو اسی انداز سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا چلتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اس بیماری میں اپنی چار پائی پر لیٹے ہوئے تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آتے ہوئے دیکھا) تو ان کو مرحبا اور خوش آمدید کہا (معلوم ہوا کہ آنے والے کا ''We l Come'' کرنا چاہیے، تاکہ وہ یہ سمجھے کہ میری آمد پر ان کو مسرت ہے، یہ بھی آنے والے کا ایک طرح کا اکرام ہے کہ اس کا استقبال اس انداز سے کیا جائے جس سے اس کا جی خوش ہو جائے۔ مہمان کے ساتھ جو آداب برتے جاتے ہیں ان میں پہلا ادب یہی ہے۔ اس معاملہ میں بھی ہمارے یہاں بڑی کوتاہیاں ہوتی ہیں دیکھو! حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی آمد پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:) ''مَرْحَبًا بِإِبْنَتِيْ'' پیاری بیٹی! آؤ، تمہارا آنا باعثِ مسرت ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اپنے پاس بٹھایا، اور ان کے کان میں رازدارانہ انداز میں کوئی بات ارشاد فرمائی، جس کو سن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بہت روئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب ان کی اس بے صبری اور تکلیف کو دیکھا تو پھر دوبارہ ان کے کان میں رازدارانہ طور پر کوئی بات ارشاد فرمائی جس کو سن کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہنس پڑیں اور خوش ہو گئیں، ان کا غم دور ہو گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: یہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام ازواجِ مطہرات بیٹھی ہوئی ہیں ان کو چھوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہارے کان میں ایک بات کہی، جو تمہارے لیے بڑے فخر کی چیز تھی؛ پھر بھی تم رونے لگیں؟ پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں سے ہٹے۔ اور بعض روایتوں میں ہے کہ جب وہ خود وہاں سے اُٹھیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے پوچھا: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہارے کان میں کیا بات کہی تھی؟ ذرا مجھے بھی بتاؤ۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھید کو کھولوں گی نہیں (جب کہ سب موجود تھیں اور میرے کان میں یہ بات کہی، اس کا مطلب ہی یہ تھا کہ وہ بات ان سب کے سامنے ظاہر کرنے جیسی نہیں

ہے، اگر سب کو بتانی ہوتی تو حضور ﷺ میرے کان میں کیوں فرماتے؟ اس لیے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے انکار کر دیا اور نہیں بتلایا) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب حضور ﷺ کا انتقال ہوگیا اس کے بعد میں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو قسم دے کر کہا: میرا تم پر ماں ہونے کی حیثیت سے حق ہے، اس کا واسطہ دے کر میں تم کو تاکید کرتی ہوں کہ حضور ﷺ نے تم سے جو کہا تھا وہ مجھے بتاؤ۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ہاں! اب وہ بات بھید نہیں رہی، اس لیے اب بتانے میں بھی کوئی اشکال نہیں، لہٰذا میں بتاتی ہوں۔ پہلی مرتبہ حضور ﷺ نے رازدارانہ انداز میں میرے کان میں جو بات ارشاد فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ: حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر سال رمضان المبارک میں میرے ساتھ قرآنِ پاک کا دَور ایک مرتبہ کرتے تھے، لیکن اس سال دو مرتبہ دَور کیا (حضور ﷺ نے حضرت جبرئیل کو سنایا اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو سنایا) اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کی میری موت کا وقت قریب آ گیا ہے، اور اس بیماری میں ہی میری موت آنے والی ہے، اس لیے تم اللہ سے ڈرتی رہنا اور صبر سے کام لینا، اس لیے کہ میں تمہارے لیے بڑا اچھا پیش رو ہوں۔ اس پر میں رو پڑی تھی جیسا کہ آپ نے دیکھا تھا کہ بڑا سخت رونا آیا تھا۔ جب حضور ﷺ نے میری تکلیف کو دیکھا تو پھر دوبارہ رازدارانہ انداز میں مجھ سے ایک بات ارشاد فرمائی: اے فاطمہ! کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ تم ایمان والی عورتوں کی سردار بنائی جاؤ گی، یا اس امت کی عورتوں کی تم سردار ہوگی؟ (گویا اتنا بڑا اشرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جائے گا) تو میں خوشی میں ہنس پڑی جیسا آپ نے دیکھا۔

افادات:- یہاں یہ روایت اسی لیے لائے ہیں کہ دیکھئے! حضور ﷺ نے ایک بات بطورِ راز کے ان کے کان میں ارشاد فرمائی تھی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس کا اتنا لحاظ کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو حضور ﷺ کی بڑی لاڈلی زوجۂ مطہرہ ہیں، ان کے پوچھنے پر بھی ان کو نہیں بتلایا۔

''فَرَطٌ'' یعنی پیش رو۔ جیسے اگر ہمیں بمبئی جانا ہو، تو ہمارا کوئی آدمی ہم سے پہلے بمبئی پہنچ جائے اور ہمارے لیے وہاں قیام کی سہولت کا نظم کرلے؛ اسی کو ''فَرَطٌ'' یعنی پیش رو سے تعبیر کرتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں ایسا ہوتا تھا کہ کسی قافلہ کو سفر کر کے جہاں جانا ہوتا تھا، تو کچھ لوگ پہلے ہی وہاں پہنچ جاتے تھے، اور قیام کی تیاریاں کر لیتے تھے، خیمے لگا دیتے تھے، پانی وغیرہ کا انتظام کر لیتے تھے، تاکہ بعد میں آنے والوں کو دشواری پیش نہ آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: مَیں بھی پہلے جارہا ہوں، تاکہ تم بعد میں آؤ تو وہاں تیاریاں ہو جائے۔

بہر حال! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنی وفات کی اطلاع دی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام ازواجِ مطہرات وہاں بیٹھی ہوئی تھیں، اور کسی بھی عورت کے لیے اپنے شوہر کی موت کا تصور سوہانِ روح ہوتا ہے، اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس چیز کو ان کے سامنے ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے، اور یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رازدارانہ انداز میں صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بتلائی۔ اور ظاہر ہے وہ بیٹی تھی اور ایک بیٹی کے لیے بھی اپنے باپ کی جدائی بڑی تکلیف دہ ہوا کرتی ہے، تو اس پر وہ رو پڑیں، ان کی تسلی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسری بات ارشاد فرما کر اپنی وفات کی اطلاع دینے سے ان کو جو رنج و تکلیف ہوئی تھی اس کی تلافی فرما دی۔

بعض بھید ہمیشہ کے لیے بھید ہوتے ہیں

۶۸۸:- وعن ثَابِتٍ عن أنس رضی اللہ تعالی عنہ قَالَ: أَتَی عَلَيَّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَأنَا أَلْعَبُ مَعَ الغِلْمَانِ، فَسَلمَ عَلَيْنَا، فَبَعَثَنِي إِلَى حاجَةٍ، فَأَبْطَأتُ عَلَى أُمِّي. فَلَمَّا جِئْتُ، قالت: مَا حَبَسَكَ؟ فقلتُ: بَعَثَنِي رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لِحَاجَةٍ، قالت: مَا

حَاجَتُهُ؟ قُلْتُ: إِنَّهَا سِرٌّ. قَالَتْ: لَا تُخْبِرَنَّ بِسِرِّ رَسُولِ اللهِ ﷺ أَحَدًا. قَالَ أَنَسٌ: وَاللهِ لَوْ حَدَّثْتُ بِهِ أَحَدًا لَحَدَّثْتُكَ بِهِ يَا ثَابِتُ. (رواہ مسلم وروی البخاری بعضہ مختصراً)

ترجمہ:- (حضرت ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت اُنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاص شاگرد اور خادمِ خاص تھے اور حضرت اُنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضورِ اکرم ﷺ کے خادمِ خاص تھے) تو حضرت اُنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ جب کہ میں بچہ تھا اور بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا، نبیٔ کریم ﷺ میرے پاس تشریف لائے، سلام کیا اور مجھے ایک کام کے لیے بھیجا۔ چوں کہ میں ایک کام سے گیا تھا اس وجہ سے گھر پر والدہ کے پاس دیر سے پہنچا، تو میری والدہ نے پوچھا: دیر سے کیوں آئے؟ میں نے کہا: حضور ﷺ نے ایک کام کے لیے بھیجا تھا۔ کہا: کس کام کے لیے بھیجا تھا؟ مَیں نے کہا: وہ راز کی بات ہے، حضور ﷺ کا ایک بھید ہے، اس لیے مَیں نہیں بتاؤں گا۔ اس پر والدہ نے بھی کہا: ٹھیک ہے، حضور ﷺ کا بھید کسی کو بھی مت بتانا۔ بعد میں جب اس واقعہ کو حضرت ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرما رہے تھے اس وقت کہا کہ حضرت اُنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھ سے فرمایا: اے ثابت! اگر وہ بات مَیں کسی سے کہتا تو تم سے کہتا (لیکن میں نے کسی سے نہیں کہی، اور نہ کبھی کسی کو کہوں گا)۔

افادات:- اس روایت کو لا کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بعض بھید اور راز ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو کبھی بھی کسی کو نہیں بتائے جاتے۔ دیکھو! اوپر آیا کہ حضورِ اکرم ﷺ نے اپنی وفات کی خبر دی تھی، تو حضور ﷺ کی وفات کے بعد وہ بات بھید نہیں رہی اس لیے اگر اس کا اظہار کیا جاتا ہے کہ فلاں وقت حضور ﷺ نے یہ فرمایا تھا تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بھید کھولا۔ یا جیسے حضور ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا ارادہ فرمایا تھا تو جب تک کہ نکاح نہیں ہوا تھا وہاں تک وہ بھید کی بات تھی، لیکن جب نکاح ہو گیا تو اب وہ بات بھید کی نہیں رہی، بلکہ ساری دنیا کے سامنے آ گئی۔ اب اگر کوئی کہے کہ پہلے

مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کہا تھا تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔لیکن بعض بھید اور راز ایسے ہوتے ہیں کہ جو ہمیشہ کے لیے ہی بھید ہوتے ہیں۔اس روایت کو یہاں لاکر یہی بتانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ کہتے ہیں کہ اگر وہ بات کسی سے کہتا تو وہ تم سے کہتا،لیکن میں کسی کو نہیں کہوں گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض راز ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے راز اور بھید کی ہی حیثیت رکھتے ہیں۔اب وہ کون سے بھید ہوتے ہیں؟ تو یہ ہر آدمی کی اپنی اپنی سمجھداری کی بات ہے،آدمی اپنی عقل سے اس کا فیصلہ کرسکتا ہے۔

الوفاء بالعهد وَإنجاز الوَعد

عہد و پیمان اور وعدہ پورا کرنا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قال اللہ تعالیٰ:﴿وَأَوۡفُوا بِالۡعَهۡدِ إِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡئُولاً . (الاسراء:۳۴)﴾

قال اللہ تعالیٰ:﴿وَأَوۡفُوا بِعَهۡدِ اللّٰهِ إِذَا عَاهَدۡتُمۡ . (النحل:۹۱)﴾

وقال تعالیٰ:﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوۡفُوا بِالۡعُقُودِ . (المائدۃ:۱)﴾

وقال تعالیٰ:﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لاَ تَفۡعَلُونَ كَبُرَ مَقۡتاً عِنۡدَ اللّٰهِ أَنۡ تَقُولُوا مَا لاَ تَفۡعَلُونَ . (الصف:۲،۳)﴾

عہد و پیمان کو پورا کرنے کا اہتمام

عنوان قائم کیا ہے: عہد و پیمان (جس کو گجراتی میں قرار (કરાર) اور انگریزی میں ایگریمنٹ (Agreemant) کہتے ہیں) اور کسی بھی طرح کے وعدہ کو پورا کرنے کا اہتمام کرنا۔

اسلام نے جن اخلاق اور اعمالِ صالحہ کی تعلیم دی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی کسی کے ساتھ جو بھی عہد و پیمان اور وعدہ کرے اس کو پورا کرنے کا اہتمام کرے، یہ ایک ضروری چیز ہے اور قرآنِ کریم اور نبیٔ کریم ﷺ کے ارشادات میں اس کی بڑی تاکید ہے۔ اس سلسلہ میں چند آیتیں پیش کی ہیں:-

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَأَوۡفُوا بِالۡعَهۡدِ إِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡئُولاً﴾ (الاسراء:۳۴) جو عہد و پیمان، قرار (કરાર) اور ایگریمنٹ (Agreemant) تم کسی کے ساتھ کرو؛ اس کو پورا کرو۔ اس لئے کہ جو عہد و پیمان کیا جاتا ہے، اس کے متعلق کل کو قیامت میں سوال ہوگا اور پوچھا جائے گا کہ جو عہد و پیمان تم نے کیا تھا اس کو پورا کیا یا نہیں؟ مطلب یہ ہے کہ اگر اس کو پورا کرنے میں کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے یا اس کو پورا

نہیں کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر سزا دی جائے گی۔

کامیاب اہلِ ایمان کی نشانیوں میں سے یہ ہے

قرآنِ پاک میں ایک اور جگہ ارشاد ہے: ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ﴾ (المؤمنون:۱) کامیاب ہونے والے اہلِ ایمان کے کچھ اوصاف، نشانیاں اور علامتیں بتلائی گئی ہیں، ان میں ایک وصف یہ بھی بیان کیا ہے: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ(۸)﴾ جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی رعایت کرتے ہیں، اس کا خیال رکھتے ہیں۔ جو عہد و پیمان کسی کے ساتھ کیا گیا ہے اس کو نبھانے کی کوشش کرتے ہیں، اس میں اپنی طرف سے ذرّہ برابر بھی کوتاہی کا ارتکاب نہیں کرتے۔ جب یہ ایسی چیز ٹھہری کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق سوال ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس کا اہتمام کرنا بھی ضروری ٹھہرا۔

اسی کو دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ (النحل:۹۱)﴾ جب تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد و پیمان کرلیا تو اس کو پورا کرنے کا اہتمام کرو۔

قرآنی ایک اصول

فقہاء نے لکھا ہے کہ قرآنِ پاک اور احادیث سے جو احکام ثابت ہوتے ہیں ان کی اصولی چیزوں میں سے یہ بھی ہے کہ جس چیز کا حکم امر کے صیغہ کے ساتھ دیا جائے اس کا کرنا ضروری ہوتا ہے، الّا یہ کہ اگر اسی کلام میں کوئی ایسا قرینہ، یا دلیل موجود ہو جس سے وجوب کے علاوہ دوسرا کوئی حکم ثابت ہوتا ہو۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو اس صورت میں اس پر عمل کرنا ضروری اور واجب ہوتا ہے۔

یہاں بھی امر کا صیغہ استعمال کیا گیا یعنی حکم دیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر

جوتم عہد و پیمان کرتے ہو؛اس کو پورا کرو،اس میں تمہاری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔لہٰذاان احکام پرعمل کرنا ضروری اورلازم ہے۔

زندگی کے معاملات عہد و پیمان ہیں

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ(المائدۃ:۱)﴾اے ایمان والو! وہ عقد جو آپس میں کرتے ہو؛ان کو پورا کرو۔آپس میں جوعقداورمعاملات کئے جاتے ہیں وہ بھی ایک طرح کا عہد و پیمان ہے۔جیسے: آدمی کسی کے ساتھ اجارہ کا معاملہ کرتا ہے،بیع وشراء یعنی خرید وفروخت کا معاملہ کرتا ہے؛یہ بھی ایک طرح کا عہد و پیمان ہے۔خرید و فروخت میں جب سب باتیں طے ہوگئیں،اس کے بعدان میں سے کوئی ایک آدمی اپنے اس کئے گئے وعدہ اورعہد و پیمان سے پھر جائے،جیسے: دیکھا کہ دوسرا آدمی زیادہ پیسے دے رہا ہے،توپہلے والے کوانکارکردیا کہ اب میں تیرے ساتھ معاملہ نہیں کرنا چاہتا، حالاں کہ شرائط کے خلاف کوئی ایسی بات پائی نہیں گئی ہے،محض اس لئے کہ اس کو قیمت زیادہ مل رہی ہےاوردنیوی اعتبار سے کچھ زیادہ فائدہ نظر آرہا ہے،یااس سودے کومکمل کرنے کی صورت میں بظاہراپنا کچھ نقصان نظر آرہا ہے،جیسے:اس مال کا بھاؤ گھٹ گیا اس لئےسودے سے پھررہا ہے؛ایسی بہت ساری صورتیں ہیں جواس حکم میں داخل ہیں۔

اس آیت ''أَوْفُوا بِالْعُقُودِ'' میں باری تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ وہ عقد جو آپس میں کرتے ہو؛ان کو پورا کرو۔خرید وفروخت اوراجارہ وغیرہ کے بھی جتنے معاملات آپس میں کئے جاتے ہیں وہ سب اس حکم میں داخل ہیں،یہاں تک کہ نکاح کا معاملہ بھی اس میں داخل ہے۔ایک مرد جب کسی عورت کے ساتھ نکاح کرتا ہے،تو عقدِ نکاح کے ذریعہ گویاوہ اس بات کی گارنٹی (Guarantee) دیتا ہے کہ میں بیوی کے حقوق کوادا

کروں گا۔اب اگر شوہر کی طرف سے اس کے حقوق کی ادائیگی میں کمی آئے گی تو اِس عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے کا جو حکم اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دیا گیا تھا اس میں اس کی طرف سے کوتاہی پائی گئی، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی پوچھ ہوگی۔

اس آیت میں گویا آدمی کی پوری زندگی کو سمیٹ لیا گیا ہے، اس لئے آدمی یہ نہ سمجھے کہ زندگی کا میرا کوئی حصہ اور پارٹ (Part) ایسا ہے جو اس میں داخل نہیں ہے؛ بلکہ زندگی کی تقریباً ساری چیزیں اس حکم میں آجاتی ہیں۔

یہ بڑی خطرناک چیز ہے

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جس کو کرتے نہیں؟ یعنی آپ نے جب کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کیا، عہد و پیمان، عقد اور وعدہ کیا، اب اگر اس کو آپ پورا نہیں کرتے تو اسی حکم میں آ گئے کہ ایک بات جو تم نہیں کرتے تو پھر کہتے ہی کیوں ہو! اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ بات بڑی ناراضگی کی اور اللہ کے غضب کو جوش میں لانے والی ہے۔ تم نے کسی سے وعدہ کیا اور اس کو پورا نہیں کیا تو یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ نے جن چیزوں کی خاص طور پر تعلیم دی ہے، جو اخلاق اپنی اُمت کو سکھلائے ہیں، جن چیزوں کی طرف متوجہ کیا ہے، اس میں ایک یہ بھی ہے کہ وعدہ کو پورا کرو، عہد و پیمان کو بجالاؤ، اس عہد و پیمان کے خلاف کوئی چیز نہ کرو۔

معاشرہ میں ہونے والی کوتاہیاں

جیسے: ایک آدمی کسی کے یہاں ملازم ہوا، تو ملازمت اور سروس کے لئے جو ایگریمنٹ کیا جاتا ہے، اس میں دونوں طرف سے معاملات کئے جاتے ہیں اور ساری

باتیں طے ہوتی ہیں، مثلاً: آپ کو اپنا اتنا وقت دینا ہے، اور سامنے والے کی طرف سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اتنی تنخواہ دی جائے گی۔ اِس کو یوں کرنا ہے، اور اس کے بدلہ میں اُس کو یوں کرنا ہے۔ یہ ایک معاملہ اور معاہدہ ہوا، اب دونوں کے لئے اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔

آج کل عام طور پر ہمارے معاشرہ میں ایسا مزاج بنتا جارہا ہے کہ دونوں طرف سے کوتاہیاں برتی جارہی ہیں، اِدھر جس کے ذمہ کچھ کام دیئے گئے وہ بھی اپنے کام کو انجام دینے میں کوتاہی کا ارتکاب کرتا ہے، اس کو جو وقت دینا چاہیے وہ پورا وقت نہیں دیتا، اس میں کمی کرتا ہے، تو یہ اس کے عہد و پیمان کے خلاف ہو جائے گا۔ اُدھر سامنے والی جو پارٹی (Party) اور فریق ہے اس کی طرف سے یہ ہوتا ہے کہ اس نے اگر کام پورا کردیا، تو وہ پورا (Paymant) نہیں کرتا، پوری تنخواہ نہیں دیتا، اس میں سے کچھ کاٹ لیتا ہے، یا وقت پر نہیں دیتا۔ جب آپ نے کسی ٹھیکیدار کو کوئی کام سونپا اور پورا معاملہ طے کرلیا اور کام پورا ہو گیا؛ تو پھر اسے پیسے کیوں نہیں دیے جارہے ہیں؟ ٹال مٹول کی جارہی ہے کہ کل دیں گے، بعد میں دیں گے، لیٹ (Late) کرتے جارہے ہیں، تاخیر ہوتی جارہی ہے، یہاں تک کہ اگر کسی مزدور سے کوئی مزدوری کروائی جاتی ہے تو اس کی مزدوری ادا کرنے تک میں سخت کوتاہی اور حق تلفی کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ اس کی داستانیں ہیں کہ جب ہم سنتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ اور ایسا بھی نہیں کہ آدمی کے پاس پیسے نہ ہوں، بلکہ پیسے موجود ہوتے ہوئے بھی مزدور کی مزدوری نہیں دیتے، حالاں کہ حضور اکرم ﷺ نے تاکید فرمائی ہے کہ مزدور کا پسینہ سوکھے اس سے پہلے اس کی مزدوری ادا کردو۔ اور حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جس نے کسی

مزدور کی مزدوری ادا نہیں کی، تو کل کو قیامت میں مَیں اس کی طرف سے دعویٰ دائر کروں گا اور مدعی بنوں گا۔ قیامت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کے وکیل بن کر آجائیں اور اس کی طرف سے دعویٰ دائر کر دیں؛ تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتنا اہم معاملہ ہے!

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ چند آیتیں نمونہ کے طور پر پیش کی ہیں، ورنہ قرآنِ پاک میں اس سلسلہ میں بہت ساری آیتیں ہیں۔ آگے روایتیں پیش کر رہے ہیں۔

منافق کی نشانی اور ہمارا معاشرہ

۶۸۹:- وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ أن رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال: آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

زَادَ فِي روايةٍ لمسلم: وإِنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: منافق کی نشانیاں تین ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، جب اس کے پاس کوئی چیز امانت کے طور پر رکھی جائے تو اس میں خیانت کا ارتکاب کرے

مسلم شریف کی روایت میں ہے:- وہ آدمی چاہے نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو، اور یہ سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں۔

افادات:- جس آدمی میں یہ علامتیں پائی جائیں گویا اس کو خالص مؤمن نہیں کہہ سکتے، اس میں نفاق والی صفات پائی جاتی ہیں۔ مؤمن کی شان یہ ہے کہ اپنے آپ کو ایسی چیزوں سے بچانے کا پورا اہتمام کرے۔ ہمارے اس عنوان اور موضوع سے تعلق رکھنے والی چیز دوسری ہے: "وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ" جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے۔

''وعدہ'' میں یک طرفہ معاملہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی سامنے والے سے کہے۔

اور ’’عہد و پیمان‘‘ میں دونوں طرف سے وعدے ہوتے ہیں۔تو جہاں دونوں طرف سے وعدہ ہو؛اس کو’’عہد‘‘ سے تعبیر کرتے ہیں،اور جہاں ایک طرف سے عہد ہوتا ہے اس کو ’’وعدہ‘‘ کہا جاتا ہے،دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔جہاں دونوں طرف سے وعدہ کیا گیا ہے وہاں دونوں کے لئے ضروری ہے کہ اس کی پابندی کریں،اور جہاں ایک طرف سے وعدہ کیا گیا ہوتو وہاں اس ایک کے لئے ضروری ہے کہ اس کی پابندی کرے، تو وعدہ کرنے کے بعد وعدہ خلافی کرنا منافق کی علامت قرار دی گئی ہے،ایک مؤمن کے لئے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو ایسی بری باتوں سے بچانے کا اہتمام کرے۔

اب وعدہ کے سلسلہ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر آدمی نے وعدہ کیا،اس وقت تو دل میں پختہ ارادہ تھا کہ میں اس کو پورا کروں گا،لیکن اس کے بعد حالات کچھ ایسے بدلے کہ اب اُس وعدہ میں جو چیز کی ذمہ داری لی تھی اس کو ادا کرنے کی اس میں طاقت نہیں رہی،اس کے خلاف صورتیں پیدا ہو گئیں،تو اس صورت کے اندر شرعاً اس کو معذور سمجھا جا سکتا ہے۔لیکن اگر ایسی صورت نہیں ہے، یا یہ ہے کہ جس وقت وعدہ کیا تھا اسی وقت دل میں چور تھا، جیسے بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسی وعدہ خلافی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا جس میں وعدہ کرتے وقت ہی آدمی کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ اس وعدہ کو پورا نہیں کرنا ہے؟

آج کل یہ چیزیں عام ہوتی جا رہی ہیں کہ جب کہہ رہا ہوتا ہے اسی وقت دل میں خیال ہوتا ہے کہ یہ بات پوری نہیں کرنی ہے۔بعض مرتبہ کہتے ہیں کہ سوچو! کیا کہہ رہے ہو؟ تو وہ کہتا ہے: مولوی صاحب! آپ کیوں فکر کرتے ہو، یہ تو ایسے ہی کہنے کی باتیں ہیں، جو کہہ رہا ہوں اس کو کرنا کہاں ہے؟ تو یہ پورے نفاق کی علامت ہے جس پر نبیٔ کریم ﷺ نے بڑی سخت وعیدیں اشاد فرمائی ہیں۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے: "وإنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ أنَّهُ مُسْلِمٌ" وہ آدمی چاہے نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں، پھر بھی حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جس میں یہ تین باتیں پائی جاتی ہیں تو وہ منافق ہے۔ کتنی سخت وعید ہے! اس لیے ایسی بری باتیں جن کو نبیٔ کریم ﷺ نے نفاق کہا ہے، ان سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

باطن کچھ، اور ظاہر کچھ

نفاق کیا ہے؟ نبیٔ کریم ﷺ کے زمانہ میں ایک گروہ اور جماعت تھی جو اپنے آپ کو اپنی زبان سے مؤمن اور مسلمان ظاہر کرتے تھے، لیکن دل میں وہ بات نہیں تھی دل میں ان کا عقیدہ اس کے خلاف تھا۔ گویا باطن کچھ تھا اور ظاہر کچھ اور کرتے تھے؛ ایسے لوگ منافق کہے جاتے تھے۔ تو یہ آدمی بھی جب اپنے آپ کو کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں تو اس کو چاہیے کہ ایمان کے تقاضوں کو پورا کرتا رہے، اور ایمان کے تقاضوں میں سے یہ ہے کہ آدمی جو وعدہ اور عہد و پیمان کرے؛ اس کو پورا کرے۔ جب وہ وعدہ کو پورا نہیں کر رہا ہے تو گویا مؤمن والی شان اور مؤمن والی بات نہیں ہے، بلکہ منافقوں والا عمل اور خصلت ہوگئی۔ اسی لئے حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ آدمی منافق ہے؛ گویا ایسا آدمی مخلص مؤمن نہیں کہا جائے گا۔

منافق کی چار علامتیں

۶۹۰:- وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما: أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: أرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقاً خَالِصاً، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا: إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ،

وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس آدمی میں چار باتیں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا، اور جس میں ان میں سے کوئی ایک بات ہوگی گویا اس میں نفاق کی ایک بات پائی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کو چھوڑ دے (جب تک کہ چھوڑے گا نہیں وہاں تک گویا یہ برائی اس میں موجود ہے) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب کوئی عہد و پیمان کرے تو اس کو توڑ دے، اس کی خلاف ورزی کرے۔ اور جب کسی کے ساتھ جھگڑا کرے تو گالی گلوچ پر اتر آئے۔

افادات:- گویا منافق کی چار علامتیں بتلائی ہیں۔ اس روایت کو یہاں اس جزو "وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ" کی وجہ سے لائے ہیں، کہ جب کوئی عہد و پیمان کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، اس کو توڑ دے؛ یہ نفاق کی ایک علامت ہے۔

وعدہ پورا کرنے کا عجیب وغریب واقعہ

دیکھو! وعدہ کو پورا کرنے کا نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتنا زیادہ اہتمام فرمایا۔ غزوۂ بدر کا واقعہ ہے۔ حضرت حذیفہ بن یمان اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہما دونوں اپنے گھر پر مسلمان ہوئے، اسلام لانے کے بعد ہجرت کر کے وہ مدینہ منورہ جا رہے تھے، ابوجہل مشرکین کا لشکر لے کر مسلمانوں کے مقابلہ اور اپنے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے جا رہا تھا۔ غزوۂ بدر اسی لئے تو پیش آیا تھا۔ راستہ میں یہ دونوں باپ بیٹا حضرت حذیفہ اور حضرت یمان رضی اللہ عنہما کو ابوجہل کے لشکر نے گرفتار کر لیا، ان کو ابوجہل کے پاس لایا گیا۔ اس نے پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ کہا: مدینہ منورہ جا رہے ہیں۔ پوچھا: کیوں؟ کہا: نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات وزیارت اور ان کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے۔ اس

نے کہا: وہ تو لشکر لے کر ہمارے مقابلہ کے واسطہ نکلے ہیں، اس لئے تم دونوں کو ہم نہیں چھوڑیں گے، اپنی تحویل ہی میں رکھیں گے، اس لئے کہ اگر ہم نے تم کو چھوڑ دیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے دشمن کے لشکر میں ہم نے دو سپاہیوں اور لڑنے والوں کا اضافہ کر دیا، اس لئے ہم تم کو جانے نہیں دیں گے۔ ان دونوں باپ بیٹوں نے وعدہ کیا کہ ہم کو چھوڑ و، تمہارے مقابلہ میں لڑنے کے لئے ہم نہیں آئیں گے، ہم تو خالص ملاقات اور زیارت کرنے جارہے ہیں، چناں چہ اس وعدہ پر ان دونوں کو چھوڑ دیا گیا۔

اب یہ دونوں حضرات نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جا کر ملے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لشکر لے کر نکل رہے تھے، انہوں نے اپنا پورا قصہ سنایا کہ ایسی صورت پیش آئی۔ اس کے بعد انہوں عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ مشرکین اور کفار کے مقابلہ کے لئے تشریف لے جارہے ہیں؛ ہمیں بھی ساتھ چلنے کی اجازت دیجئے۔

اس وقت حالات یہ تھے کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان یہ پہلی جنگ تھی جس کو قرآنِ پاک نے یوم الفرقان، فیصلہ کے دن سے تعبیر کیا گیا۔ گو یا یہ وہ جنگ ہے جس نے کفر اور اسلام کے درمیان امتیازی خط کھینچ دیا اور فیصلہ کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسی جنگ کے لئے تشریف لے جارہے ہیں، اور پھر حالات ایسے تھے کہ اُدھر مشرکین کا لشکر ہر طرح کے ساز و سامان سے لیس تھا، تمام ہتھیار ان کے پاس موجود تھے، تعداد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک ہزار کی تعداد تھی۔ اور اِدھر مسلمان صرف تین سو تیرہ تھے اور ساز و سامان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو صرف ستر (۷۰) اونٹ، دو (۲) گھوڑے اور آٹھ (۸) تلواریں تھیں۔ تلواریں بھی سب کے پاس نہیں تھیں، کسی کے پاس ڈنڈا تھا، کسی کے پاس نیزہ تھا، تو کسی کے پاس اور کچھ تھا۔ ایسے موقع پر ظاہر ہے کہ جتنے آدمی زیادہ بڑھیں؛ اتنی ہی قوت اور طاقت بڑھے گی۔ جنگی حکمتِ عملی اور وقتی مصلحت کا

تقاضہ بھی یہی تھا کہ اپنے کسی ایک آدمی کو بھی کھو یا نہ جائے، بلکہ اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اور ادھر یہ باپ بیٹے دونوں نبی کریم ﷺ سے درخواست کرر ہے ہیں کہ اللہ کے رسول! ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم بھی آپ کے ساتھ شریک ہوں۔ لیکن حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں! تم ان سے وعدہ کر چکے ہو۔ انہوں نے کہا: اللہ کے رسول! وہ تو گردن پر تلوار رکھ کر لیا گیا وعدہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! جب تم نے وعدہ کرلیا ہے، تو اب تم کو ہم شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔

دیکھو! آدمی کے عمل کی پختگی کا پتہ ایسے موقع پر ہی چلتا ہے جب حالات ناسازگار اور ناموافق ہوں، ایسے حالات میں کوئی آدمی شریعت پر عمل کر کے بتلائے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ شریعت پر عمل کے معاملہ میں پختہ ہے۔ حالات کی سازگاری کے موقع پر تو ہر آدمی آسانی سے عمل کر لیتا ہے۔ یہاں ان کی طرف سے اصرار ہو رہا تھا لیکن نبی کریم ﷺ نے عملی طور پر ان کے وعدہ کو پورا کر کے بتلا دیا۔ ہم اور آپ ہوتے تو تاویلیں کر لیتے کہ دشمن کے مقابلہ کا وقت ہے، اسلام اور کفر کا سوال ہے، اسلام کو قوت پہنچانا ضروری ہے، ایسے موقع پر یہ سب تھوڑا ہی دیکھا جاتا ہے، اور معلوم نہیں کیا کیا تاویلیں کی جاتیں، لیکن نبی کریم ﷺ نے ان کو اجازت نہیں دی اور وہ شریک نہ ہو پائے۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام میں وعدہ اور عہد و پیمان کو پورا کرنے کا کتنا زیادہ اہتمام اور کتنی سخت تاکید ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسے موقع پر بھی ان کو اپنے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی۔

عہد پورا کرنے کا بے مثال نمونہ

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق بعض حضرات اعتراض کی باتیں کرتے ہیں،

اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے زمانۂ خلافت میں چوں کہ ان کا پایۂ تخت شام میں تھا اور رومی سلطنت کی سرحدیں اس وقت شام کے ساتھ ملی ہوئی تھیں، تو رومیوں کے ساتھ ان کا مقابلہ ہوتا رہتا تھا۔ ایک موقع پر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رومی بادشاہ کے ساتھ ایک مدت تک کے لئے صلح کر لی کہ اتنی مدت تک ہم اور آپ آپس میں جنگ اور لڑائی نہیں کریں گے۔ جب صلح کی وہ مدت ختم ہونے جا رہی تھی اور کچھ دن باقی تھے، تو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوچا کہ ابھی کچھ دن باقی ہیں، مَیں اپنے لشکر کو لے جا کر سرحدوں (Boarder) پر بٹھا دوں، ان کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوگا کہ صلح کی مدت پوری ہوتے ہی یہ لوگ حملہ کر دیں گے، وہ تو سمجھ رہے ہوں گے کہ صلح کی مدت پوری ہوگی اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوتا ہے؟ اس لئے انہوں نے ایک تدبیر سوچی کہ اپنا لشکر وہاں لے جا کر لگا دوں، چناں چہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سرحد پر اپنا لشکر لگا دیا۔ ابھی صلح کا زمانہ چل رہا تھا اور صلح کے زمانہ کے درمیان لڑائی شروع کرنے کا ارادہ بھی نہیں تھا، بلکہ ارادہ یہ تھا کہ جہاں صلح کی مدت پوری ہوگی۔ جیسے آج بارہ بجے ٹائم ختم ہوگا اور بارہ بج کر ایک منٹ پر۔ فوراً حملہ کر دیں گے۔ چناں چہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پہلے سے وہاں لشکر بٹھا دیا گیا تھا اور اچانک ایسا کیا گیا جس کا رومیوں کو وہم و گمان اور خیال بھی نہیں تھا اس لیے انہوں نے دفاع کی کوئی تدبیر بھی نہیں کی تھی۔ جب اس طرح حملہ کیا گیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لشکر دشمن کے علاقہ میں آگے بڑھتا ہی چلا گیا اور بہت سارا علاقہ فتح کر لیا، اور برابر آگے بڑھ رہے تھے کہ دیکھا پیچھے سے ایک گھوڑے سوار آ رہا ہے اور کہہ رہا ہے:

"أَللّٰہُ أَکْبَر، أَللّٰہُ أَکْبَر! وَفَآءً لَاغَدَرًا، وَفَآءً لَاغَدَرًا" اے ایمان والو! ٹھہر جاؤ، مؤمن کا شیوہ عہد و پیمان کو پورا کرنا ہے، اس کی خلاف ورزی کرنا نہیں ہے۔

یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رک گئے۔ جب وہ قریب آئے تو دیکھا وہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد سنا ہے: مَنْ کَانَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ قَوْمٍ عَھْدٌ، فَلَا یُحُلَّنَّ عُقْدَۃً، وَلَا یَشُدَّنَّھَا، حَتّٰی یَنْقَضِیَ أَمَدُھَا أَوْ یَنْبِذَ إِلَیْھِمْ عَلٰی سَوَاءٍ. (تفسیر ابن کثیر، الانفال، آیت نمبر: ۵۸) جب کسی قوم کے ساتھ صلح کے لئے کوئی عہد و پیمان کیا ہو، تو نہ اس کی گرہ کو کھولے، اور نہ اس کو سخت مضبوط کرے، جب تک کہ اس کی مدت پوری نہ ہو، یا یہ ہے کہ ان کو پہلے سے کھلم کھلا بتلا دیا جائے کہ ہمارا اور آپ کے درمیان عہد و پیمان باقی نہیں ہے۔

ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب صلح کا زمانہ چل رہا ہے اس میں آپ کا اپنے لشکر کو لے جا کر سرحدوں کے اوپر بٹھا دینا، جب کہ وہ یوں سمجھ رہے ہیں کہ ابھی کوئی ایسی تدبیر کی نہیں جائے گی، یہ آپس کی صلح کے تقاضہ کے خلاف ہے، یہ کاروائی بھی آپ کو صلح کی مدت کے پوری ہونے کے بعد کرنی چاہیے تھی، صلح کی مدت چل رہی ہے اور آپ یہ کاروائی کر رہے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے، اس لئے آپ نے یہ جو کیا ہے وہ ایک طرح کی عہد شکنی ہے۔ یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لشکر کو واپسی کا حکم دیا اور دشمن کا وہ پورا علاقہ جو فتح کر لیا گیا تھا خالی کر دیا اور اپنے لشکروں کو واپس بلا لیا گیا۔

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے اور علماء فرماتے ہیں کہ مذاہب کی تاریخ میں کوئی دوسرا مذہب ایسا نمونہ پیش نہیں کر سکتا جس میں فتح شدہ علاقہ اس طرح واپس کر دیا گیا ہو۔

آج کے حالات کا موازنہ

دشمن کے معاملہ میں تو آج کی تہذیب یافتہ دنیا جو اپنے آپ کو حقوقِ انسانی کی

علم بردار کہتی ہے، وہ کیا کچھ دھندے نہیں کرتی ہے؛ وہ ہم اور آپ سب جانتے ہیں۔ آپ لوگ بھی اخبارات پڑھتے ہیں اس میں دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کیسی کیسی حرکتیں کرتے ہیں۔ لیکن یہاں دیکھئے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ماننے والے، آپ پر ایمان لانے والے، آپ کے گرویدہ لوگوں نے دنیا کو یہ نمونہ بتادیا کہ فتح کیا ہوا علاقہ بھی محض اس شک کی وجہ سے واپس کردیا کہ کہیں ہمارا یہ عمل حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس ارشاد کے خلاف نہ ہوجائے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انصاف کی ایک جھلک

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس زمانہ میں بیت المقدس کو فتح کیا تو وہاں جو غیر مسلم یہود و نصاریٰ وغیرہ آباد تھے، ان کے ساتھ عقدِ جزیہ کا معاملہ کیا گیا، یعنی ان کو معاہِد بنایا گیا اور ان کے ساتھ عہد کیا گیا۔ اسلامی حکومت میں رہنے والے غیر مسلم جن کو اس بات کی گارنٹی دی جاتی ہے کہ تمہاری جان و مال کی ہماری طرف سے حفاظت کی جائے گی، لیکن اس کے معاوضہ میں تم سے ایک مخصوص مقدار رقم جزیہ اور ٹیکس کے طور پر لی جائے گی، جن کے ساتھ اس طرح کا معاہدہ ہوتا ہے اس کو عربی زبان میں "مُعَاهِدٌ" کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ عہد اور عقدِ ذمہ کیا گیا ہے، اسی لیے ان کو ذمی بھی کہا جاتا ہے

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں دشمن کے مقابلہ کے لئے ایک موقع پر زیادہ لشکر کی ضرورت پیش آئی، تو مشورہ میں یہ بات آئی کہ وہ لشکر جو بیت المقدس والے علاقہ کی حفاظت کے لئے رکھا گیا ہے، اس کو وہاں سے ہٹا کر سرحد (Boarder) پر بھیج دیا جائے، اس لئے کہ وہاں اس وقت شدید ضرورت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ٹھیک ہے، اس لشکر کو وہاں سے بلا کر اس جگہ بھیجا تو جائے گا، لیکن چوں کہ یہ لشکر ہم

نے وہاں غیر مسلموں کی جان و مال کی حفاظت کے لئے رکھا تھا، اور ہم نے ان سے حفاظت کا عہد کیا ہے اور اسی پر ہم جزیہ بھی لیتے ہیں، اس لئے اس سال کا جو جزیہ ان سے لیا ہے وہ ہم واپس کریں گے۔ چناں چہ اعلان کیا گیا اور جو رقم ان سے جزیہ کے طور پر وصول کی گئی تھی ان کو واپس کی گئی کہ ہم اپنے اس لشکر کو یہاں سے ہٹا رہے ہیں اور ہم نے تم سے تمہارے تحفظ کا وعدہ کیا تھا، اسی تحفظ کے لئے یہ لشکر یہاں رکھا تھا، لیکن جب اس لشکر کو یہاں سے ہٹا رہے ہیں تو تمہاری وہ رقم بھی واپس کی جا رہی ہے۔ یہی وہ اخلاق تھے جن کو دیکھ کر غیر مسلم اسلام قبول کرتے تھے۔

آج ضرورت ہے اس بات کی......

آج اس زمانہ میں بھی کوئی مسلمان اگر نبی کریم ﷺ کی انہی ساری تعلیمات کو اپنا کر زندگی گزارے گا، تو اس گئے گزرے دور میں بھی اس کا وہ عمل لوگوں کے لئے ایمان کی دعوت کا ذریعہ بنے گا۔ دعوت صرف زبانی چیز نہیں ہے، بلکہ اصل دعوت تو عمل کی ہے۔ آپ دیکھئے کہ جاوا سُماترا اور چین کے علاقہ میں اسلام کہاں سے پہنچا! وہاں کیا کوئی داعی پہنچے تھے؟ نہیں! بلکہ وہاں تجارت کرنے والے پہنچے تھے، لیکن انہوں نے نبی کریم ﷺ کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق تجارت کی، تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں اپنائیں۔

آج ہمارا اسلام مسجدوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، ہم یوں سمجھتے ہیں کہ پانچ وقت نماز پڑھ لی، بس کافی ہے۔ نماز اپنی جگہ پر بہت اہم چیز ہے، بلکہ ساری ہی عبادتیں اہم ہیں، لیکن اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ میں بار بار بتلا چکا ہوں

کہ اسلام کئی شعبوں کا نام ہے، اس میں اخلاق بھی ہیں، معاملات بھی ہیں، معاشرت بھی ہے، اور عبادات بھی ہیں۔ اس لئے ہمیں ہر چیز کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ لوگوں کے ساتھ جن چیزوں کا واسطہ پڑتا ہے وہ تو معاشرت، معاملات اور اخلاق ہے۔ آپ بازار میں جائیں گے تو بازار والوں کو معلوم نہیں ہے کہ آپ نماز کیسی خشوع و خضوع والی پڑھتے ہیں۔ جس کے ساتھ آپ سودا اور خرید و فروخت کر رہے ہیں اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ آپ کتنی لمبی نماز پڑھتے ہیں، اور نماز میں کتنی تلاوت کرتے ہیں، یہ سب وہ نہیں جانتا، وہ آپ کی نماز نہیں دیکھتا، بلکہ آپ اس کے ساتھ جو سودا کریں گے اور اس میں امانت کے تقاضوں کو جب پورا کریں گے؛ تو یہی چیز اس پر اثر انداز ہوگی۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان چیزوں کا اہتمام کریں۔

وعدہ پورا کرنے کا ایک اور نمونہ

۶۹۱:- وعن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ لِی النبیُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لَوْ قَدْ جَاءَ مَالُ الْبَحْرَيْنِ أَعْطَيْتُكَ هكَذَا وَهَكَذَا وهكَذَا. فَلَمْ يَجِئْ مَالُ الْبَحْرَينِ حَتَّى قُبِضَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم. فَلَمَّا جَاءَ مَالُ الْبَحْرَيْنِ أَمَرَ أَبُو بَكْرٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ. فَنَادَى: مَنْ كَانَ لَهُ عِنْدَ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عِدَةٌ أَوْ دَيْنٌ؛ فَلْيَأْتِنَا. فَأَتَيْتُهُ وَقُلْتُ لَهُ: إِنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ لِي كَذَا وَكَذَا. فَحَثَى لِي حَثْيَةً فَعَدَدْتُهَا، فَإِذَا هِيَ خَمْسُمِئَةٍ. فَقَالَ لِي: خُذْ مِثْلَيْهَا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے وعدہ فرمایا کہ اگر بحرین کا مال آ گیا تو میں تمہیں اتنا دوں گا، اتنا دوں گا، اتنا دوں گا (لپ بھر کر تین مرتبہ فرمایا کہ اتنا دوں گا۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں سب سے زیادہ خراج بحرین

کے علاقہ سے آتا تھا اسی کے متعلق آپ ﷺ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب آئے گا تو تم کو میں اتنا دوں گا) اب بحرین کا وہ خراج والا مال آئے اس سے پہلے حضورِ اکرم ﷺ کی وفات ہوگئی۔ پھر جب بحرین کا مال آیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے۔ جو نبیٔ کریم ﷺ کے جانشین بنائے گئے تھے۔ اعلان کرایا کہ حضورِ اکرم ﷺ نے کسی سے وعدہ فرمایا ہو، یا حضورِ اکرم ﷺ پر کسی کا کوئی مطالبہ باقی ہو تو وہ آئے اور اپنا مطالبہ، یا نبیٔ کریم ﷺ نے ان سے جو وعدہ کیا ہو تو وہ میرے پاس سے وصول کر کے لے جائے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں گیا اور عرض کیا کہ مجھے نبیٔ کریم ﷺ نے تین لپیں بھر کر یہ فرمایا تھا (کہ اگر بحرین کا مال آیا تو مَیں تمہیں اتنا اتنا اتنا دوں گا) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک لپ بھر کر مجھے درہم دیئے، میں نے جب وہ گنے تو پانچ سو (۵۰۰) تھے، پھر مجھ سے کہا کہ ایسے ڈبل یعنی ایک ہزار اور لے لو (آپ ﷺ نے تین لپوں کا وعدہ فرمایا تھا تو اس طرح حضورِ اکرم ﷺ کے وعدہ کے مطابق کل پندرہ سو (۱۵۰۰) درہم دیئے۔)

افادات:- دیکھو! اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضورِ اکرم ﷺ نے ایک حکمران ہونے کی حیثیت سے وعدہ فرمایا تھا، تو جب آپ ﷺ کے انتقال فرما جانے کے بعد آپ کی جگہ پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقرر کئے گئے تو انہوں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ مجھ سے پہلے اس جگہ پر حضورِ اکرم ﷺ تھے، اور آپ ﷺ نے بحیثیت حکمران کے جو جو وعدے کئے تھے وہ مجھے پورے کرنے ہیں۔

آج کل ہمارے یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ کوئی پیڑھی (Party) چل رہی ہے، اس کے ذمہ دار نے کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کیا، اب وہ نہیں رہا اور اس کی جگہ پر کوئی دوسرا آیا، جیسے بیٹا آیا، تو وہ کہتا ہے کہ انہوں نے کہا تھا، ہم نہیں جانتے۔ ارے بھائی! یہ کوئی بات ہوئی؟ اس طرح دنیا میں زندگی گزاری جاتی ہے؟ یہ غلط طریقہ ہے، اسلام اس کی

اجازت نہیں دیتا۔ آپ جب اس کے ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے آئے ہیں تو آپ اسی طرح کا معاملہ کیجئے۔ بہر حال! یہ عہد و پیمان بہت اہم چیز ہے۔

یہ عملی عہد و پیمان ہے

اب عہد و پیمان اور وعدہ کے متعلق ایک اہم چیز یاد رکھیے۔ وعدہ اور عہد و پیمان کبھی صرف زبان سے ہوتا ہے، کبھی تحریر سے ہوتا ہے، اور کبھی زبان سے تو نہیں بولا جاتا، لیکن عملی طور پر عہد و پیمان ہوتا ہے، جیسا کہ ہم اس ملک میں اس ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے رہتے ہیں تو گویا ہم نے اس ملک کے ساتھ یہ عہد و پیمان کر رکھا ہے کہ یہاں کے قوانین کی ہم پابندی کریں گے، الّا یہ کہ کوئی قانون ایسا ہو جو شریعت کے خلاف ہو، اور جس پر عمل کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آئے؛ تو وہاں پھر قاعدہ یہ ہے: لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ" خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی بات مانی نہیں جائے گی۔ اگر کوئی مسلمان حکمران ہوتا اور وہ کوئی حکم شریعت کے خلاف دیتا تو اس کو بھی ہم بجا نہیں لاتے، گناہ کے کام میں کسی کی بھی فرمانبرداری نہیں کی جاتی، یا ظلم کی کوئی بات ہے تو ظلم کی بات میں تو اپنے بچاؤ کے لئے کچھ کیا جا سکتا ہے، لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے تو پھر ان قوانین کی پابندی ضرور کرنی چاہیے، اُس میں اپنی طرف سے کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، مثلاً ٹرافک (Traffic) کے قانون ہیں، تو ان کا بھی لحاظ کرنا چاہیے، جو لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ وہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں، اس لئے اس کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے، تمام قوانین کی رعایت ہونی چاہیے۔ اگر آپ یوں سمجھ کر کریں گے کہ میں اکیلا کروں گا تو اس سے کیا نقصان ہو جائے گا؟ تو آپ کا یہ سوچنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ

جب آپ نے خلاف ورزی کی تو اس کو دیکھ کر دوسرے نے بھی کی، اس طرح یہی چیز قانون شکنی اور لوگوں کی جان و مال کے غیر محفوظ ہونے کا ذریعہ بنے گی۔ اس لئے ایسے تمام امور میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر ٹرین (Train) میں سفر کر رہے ہیں تو یہ صحیح نہیں ہے کہ بغیر ٹکٹ کے سفر کریں، ہر حال میں ٹکٹ (Ticket) لے کر ہی سفر کرنا چاہیے۔

اسی طرح آپ نے جب الیکٹرسٹی والوں کے پاس سے لائن لی ہے تو آپ کے یہاں اس کا میٹر بھی لگایا گیا ہے، اب اس میں ذرّہ برابر بھی کمی نہ کیجئے، بلکہ اس کا بل پورا پورا ادا کیجئے اور اس عہد و پیمان کی حفاظت کیجئے، ورنہ اس حکم کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔ اور بھی بہت سی چیزیں اس حکم میں آجاتی ہیں۔

الامر فی المحافظة علیٰ ما اعتادہ من الخیر

نیک کاموں کی عادت کو باقی رکھنا

۲۱/ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۱۷/مارچ ۲۰۰۱ء

معمولات کی پابندی کیجئے

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب قائم کیا ہے اس میں بتلانا چاہتے ہیں کہ شریعت نے جن آداب کی ہمیں تعلیم دی ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ کسی آدمی نیکی کے نیکی کے جو کام شروع کئے ہیں اور جن کاموں کا اپنے آپ کو عادی بنایا ہے، جو اچھے معمولات اور نیکی کے مختلف کام اپنا رکھے ہیں؛ تو اب اس کو چاہیے کہ ان پر پابندی سے عمل کرتا رہے۔ شریعت یہ چاہتی ہے کہ اس سلسلہ کو باقی رکھو، بلا وجہ اس کو چھوڑ مت دو۔

مطلب یہ ہے کہ فرائض اور واجبات تو وہ ہیں کہ جو شریعت نے آدمی کے اوپر ضروری قرار دیئے ہیں، ان کو تو کرنا ہی کرنا ہے، اگر نہیں کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کا نافرمان اور گنہگار قرار دیا جائے گا۔ ان کے علاوہ ایسے اچھے کام جو اس نے اپنے طور پر اپنا رکھے ہیں، مثلاً: ہر مہینہ، یا ہر سال میں ایک مرتبہ، یا عید کے موقع پر یا رمضان میں دوسو، پانچ سو، ہزار روپے کسی کو دینے کا معمول بنایا ہے، تو اب شریعت یہ تعلیم دیتی ہے کہ یہ سلسلہ ختم نہ کرو، بلکہ جاری رکھو۔ کسی بھی نیکی کے کام کو شروع کرنے کے بعد چھوڑ دینا شریعت کو پسند نہیں ہے، شریعت یہ چاہتی ہے کہ وہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ یہ تو گویا ایک پودا ہے جو آپ نے لگایا ہے، اب جب لگا ہی چکے ہیں تو اس کو پانی دیتے رہو، اس کی حفاظت کرتے رہو، تاکہ وہ پلے اور بڑھے، پھل پھول لائے، اور اس سے آپ کو بھی اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو معمول چھوڑنے نہیں دیا

پہلے بھی کئی مرتبہ یہ قصہ گزر چکا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ایک

عزیز اور رشتہ دار حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ - جو ان کی خالہ زاد بہن کے بیٹے تھے اور غریب تھے، مہاجر تھے اور نیک آدمی تھے، اصحابِ بدر میں سے تھے ان - کی مدد کرتے تھے اور یہ سلسلہ انہوں نے جاری رکھا تھا۔ ایک موقعہ ایسا آیا کہ منافقین کی طرف سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی گئی، تو یہ بھی منافقین کے جھانسے میں آگئے، اور آزمائش میں پھنس گئے، ان کی زبان سے بھی وہی چیزیں نکل گئیں۔ بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت نازل ہوئی، معاملہ صاف اور واضح ہو گیا کہ ان پر جو تہمت لگائی گئی تھی وہ غلط تھی۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے - بلا وجہ نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر والوں پر لگائی گئی تہمت والے معاملہ میں حصہ لیا تھا - یوں سوچا کہ میں ان کی جو مدد کیا کرتا تھا وہ نہیں کروں گا۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی کا کوئی سلوک کرتا رہتا ہے، پھر کبھی موقع آتا ہے کہ اسی رشتہ دار نے کوئی نادانی کر لی، کوئی غلط کام کر لیا، تو اب یہ سوچتا ہے کہ اس نے ایسا کام کر لیا؟ اب اس کو نہیں دیں گے۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی قسم کھالی کہ اب ان کو نہیں دوں گا اور وہ سلسلہ بند کر دیا، اس پر باری تعالیٰ نے مستقل آیت نازل فرمائی: ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ ایسی قسم کوئی کھاتا ہے کہ میں نیکی کا کام نہیں کروں گا؟ اللہ تعالیٰ نے تعلیم دی کہ ایسی قسمیں نہیں کھانی چاہئیں۔ بھائی! نیکی کے یہی کام تو تمہاری نجات کا ذریعہ ہیں۔ کون سا نیکی کا کام اللہ تعالیٰ کو پسند آجائے، اور کل قیامت میں ہماری نجات کا ذریعہ بن جائے؛ یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام ہی ہماری نجات اور ہمارے

گناہوں کو بخشوانے کا ذریعہ بن جائے، اسی کو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؟ فوراً حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بات سے رجوع کرلیا۔

بتلانا یہ ہے کہ ہر نیکی کے کام کے لیے یہی طرز ہے، حالاں کہ وہ کام کوئی فرض اور واجب نہیں تھا، لیکن شریعت یہ کہتی ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو جب ایک بھلائی کے اوپر ڈالا ہے، تو سیدھی سادی بات یہ ہے کہ اب اس راستہ سے اپنے آپ کو ہٹانے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں ہے۔

اس سے نقصان پہنچتا ہے

کسی کے ساتھ آپ نے دوستی کی، اس کے پاس آتے جاتے ہیں، اُٹھتے بیٹھتے ہیں، ایک زمانہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا، اور پھر ایک دم سے جانا بند کردیا؛ تو صحیح نہیں ہے۔ ارے بھائی! پہلے سے دوستی ہی نہ کرتے تو کوئی بات نہیں تھی، لیکن جب دوستی کی اور تعلقات بڑھائے، پھر اچانک سے کٹ کردئے؛ تو یہ کوئی اچھی بات ہے؟ یہ ناپسندیدہ ہے، اور اس سے نقصان پہنچتا ہے۔

معمولات کا ایک ادب یہ بھی ہے

تو نیکی اور بھلائی کے جتنے بھی کام ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے اور رشتہ استوار کرنے کا ذریعہ ہیں، اور ایسے تمام کاموں سے متعلق یہ ایک ادب ہے کہ کوئی بھی معمول ہو، اس کو بلا وجہ نہ چھوڑیئے، مثلاً: روزانہ قرآنِ پاک کے ایک پارہ کی تلاوت کا آپ نے معمول بنایا، تو اب بلا وجہ اس کو نہ چھوڑیئے۔ یا آپ کسی کلمہ کی تسبیح پڑھتے ہیں، تو اب پڑھتے رہیے، یا کوئی نیکی کا کام کرتے ہیں، تو کرتے رہیے۔ چوں کہ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ آداب سکھلا رہے ہیں تو نیکی کے معمولات کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ آپ اس کی محافظت اور پابندی کیجئے، اگرچہ کوئی فرض اور واجب نہیں ہے لیکن آپ نے بھلائی کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے تو اس کو جاری رکھیے، نیکی اور بھلائی کا کوئی بھی سلسلہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو شروع کرنے کے بعد چھوڑ دیا جائے بلکہ اس کو ترقی دینی چاہیے۔

اس آیت کے ساتھ ایک ظلم ہوا

چناں چہ پہلی آیت پیش کی ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ اس آیت کے ساتھ ایک ظلم یہ ہوا کہ لوگ اس کو علامہ اقبال کے ایک شعر کے ساتھ جوڑ کر- جو انہوں نے اپنی جگہ کہا ہے- اس آیت کا مطلب بھی وہی بیان کرتے ہیں، حالاں کہ وہ مطلب بیان کرنا بالکل غلط ہے۔ اس آیت کی تفسیر اپنی جگہ پر ہے۔ وہ شعر یہ ہے:-

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
جسے نہ ہو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

پھر اس کے ساتھ یہ آیت بھی اٹیچڈ (Atteched) کر دیتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ اس آیت کا مطلب الگ ہے، آپ قرآنِ پاک کی کسی بھی تفسیر کو اُٹھا کر دیکھ لیجئے اس میں وہ مطلب نہیں ملے گا۔

اس آیت صحیح مطلب

اس آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ کوئی قوم و خاندان، کوئی جماعت و کمیونٹی نے نیکی کا راستہ اپنے لیے چن لیا اور اس راہ پر وہ چل رہی ہے، اور اس نیکی کے راستہ پر چلنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر اپنی نعمتوں کا سلسلہ جاری کر دیا ہے۔ اس لیے

کہ ظاہر ہے کہ کوئی خاندان کسی نیکی کا سلسلہ شروع کردے، مثلاً: نمازوں کا اہتمام، زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام، غریبوں کی مدد، مسکینوں اور بیواؤں کے حال پر توجہ، لوگوں کے ساتھ سخاوت وغیرہ، اور بھی نیکی کے جتنے سلسلے ہیں، ان کو اگر کوئی خاندان اپنالے، ان پر عمل شروع کردے؛ تو ظاہر ہے کہ اس کی برکتیں بھی تو ظاہر ہوں گی۔ نیکی کے ان کاموں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان کے ساتھ اسی جیسا معاملہ کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی برکتوں کے سلسلے شروع ہوں گے۔

اسی کو اس آیت میں بتلایا گیا ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ کسی قوم کے نیک راہ پر چلنے کی وجہ سے، بھلائی کے راستہ پر لگنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے انعامات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کبھی ختم نہیں کریں گے جب تک کہ وہ قوم خود اپنا راستہ نہ بدل دے، اور نیکی کا وہ راستہ نہ چھوڑ دے۔ جیسے نیکی کے کاموں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو تندرستی دے رکھی ہے، عزت و دولت بھی دے رکھی ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنی یہ نعمتیں اس وقت تک نہیں چھینیں گے جب تک کہ نیکی کا اختیار کردہ راستہ وہ خود نہ بدلے گی، لیکن جہاں اس نے اپنا راستہ بدل دیا تو اب وہ نعمتیں بھی باقی نہیں رہتیں۔

نعمتوں کے سلسلے اس وقت تک بند نہیں ہوتے

عام طور پر ہوتا ایسا ہی ہے کہ کسی خاندان اور قوم کے بڑوں نے، اسلاف اور (ancestors) نے کوئی نیک سلسلہ شروع کیا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتیں بھی اس خاندان کو شاملِ حال ہوتی ہیں، اور وہ خاندان ترقی پر آتا ہے، وہ جماعت و کمیونٹی ایک طرح کی ترقی پر آتی ہے، لیکن اس خاندان و قوم کی اور اس جماعت و کمیونٹی کی بعد

میں آنے والی نسل کو یہ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمتیں ہمارے بڑوں کی کن نیکیوں اور اچھے کاموں کی وجہ سے ملی ہیں، وہ اچھے کام جوان کے بڑے کرتے تھے اور وہ سلسلہ جو اس خاندان میں جاری تھا، جیسے: نمازوں کا اہتمام، زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام، نیکی کے کاموں کا اہتمام، غریبوں کے ساتھ بھلائی؛ یہ سارے سلسلے جاری تھے، انہیں کی وجہ سے یہ نعمتیں بھی اللہ تعالیٰ نے جاری کر رکھی تھیں۔ تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ہم نے نعمتوں کے یہ سلسلے جوان کے ساتھ جاری کئے ہیں وہ ہم بند نہیں کریں گے ﴿لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ﴾ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو جو نعمتیں دیتا ہے وہ ان سے ہٹاتا نہیں ہے، واپس لیتا نہیں ہے۔ کب تک؟ ﴿حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ یہاں تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے۔ ان کی نیکی والی حالت بدل گئی، تو پھر نعمتوں والی حالت بھی بدل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے نیکی کی وجہ سے عزت دی تھی، اب دوسری پیڑھی (نسل) آئی اور نیکی و بھلائی کے راستہ پر قائم نہیں رہی، انہوں نے دیکھا کہ دولت کی ریل پیل ہے، تو یہ نہیں سوچا کہ یہ ریل پیل اللہ تعالیٰ نے کیوں دی تھی (وہ تو بڑوں کی نیکی کی وجہ سے دی تھی) اب دولت کی ریل پیل میں آکر وہ گناہوں میں مبتلا ہو گئے، نیکی کا راستہ چھوڑ دیا، بھلائی کے وہ کام جوان کے بڑوں کی طرف سے کئے جاتے تھے اور ایک سلسلہ جاری تھا وہ سلسلہ باقی نہیں رہا، تو پھر دھیرے دھیرے نعمتیں بھی ان سے چھنتی جائے گی اور ایک دن آئے گا کہ وہ سب ختم ہو جائے گا۔ اس آیت کا صحیح مطلب یہی ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ کسی آدمی نے کسی نیکی کا راستہ اختیار کیا ہو تو اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے، چوں کہ نیکی کے راستہ کو اختیار کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی نعمتوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اگر نیکی کا راستہ چھوڑ دو گا تو نعمتوں کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ باقی اس کا وہ جو مطلب لیتے ہیں کہ ”خدا نے آج تک اس قوم کی حالت

نہیں بدلی'' وہ بالکل صحیح نہیں ہے، اس آیت کی صحیح تفسیر تو وہی ہے جو ابھی میں نے آپ کے سامنے بیان کی۔

حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سوال

ایک بات لطیفہ کے طور پر سناتا ہوں، ہمارے اکابر میں حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کا قیام ایک طویل مدت تک مدینہ منورہ میں رہا اور حضرت وہاں جانے والے حجاج کے ساتھ بڑی شفقتیں فرمایا کرتے تھے، جنھوں نے ان کی وہ شفقتیں دیکھی ہیں وہ جانتے ہیں۔ میرا جب بھی جانا ہوتا تھا تو حضرت کے پاس جا کر بیٹھا کرتا تھا، حضرت ہماری دعوت بھی کیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا کی عادت یہ تھی کہ کوئی مولوی اور عالم ملاقات کے لیے آتے تو کچھ سوالات بھی فرماتے تھے ان سوالات میں ایک سوال اس آیت کی تفسیر کے متعلق بھی فرماتے تھے ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ مولوی صاحب! اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ عام طور پر مولوی صاحبان وہی ''خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی'' والی بات چلا دیتے تھے، حالاں کہ اس آیت کی وہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔ وہ ایک الگ بات ہے جو کہی گئی ہے، اور اس آیت کا مطلب تو یہی ہے جو میں نے ابھی بیان کیا۔ آپ کسی بھی تفسیر کی کتاب کو اُٹھا کر دیکھ لیجئے، اس میں یہی وضاحت ملے گی، اور اسی مطلب کی بنیاد پر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کو اس عنوان کے تحت ذکر کیا ہے۔

تم اس پگلی بوڑھیا کی طرح نہ بنو

دوسری آیت پیش کی ہے: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا﴾ اے لوگو! تم اس پگلی بڑھیا کی طرح نہ بنو، جو محنت سے سوت کاتتی، پھر اس کو

ٹکڑے ٹکرے کر ڈالتی۔

مکہ مکرمہ کے اندر ایک مجنونہ عورت تھی، اس کی عادت یہ تھی کہ دن بھر سوت کاتتی تھی، اور دن پورا ہونے پر اپنا کاتا ہوا سوت توڑ پھوڑ کر ختم کر دیتی تھی، پھر دوسرے دن پھر سے سوت کاتتی تھی۔ گویا دن بھر جو محنت کرتی وہ ضائع کر دیتی۔ اسی کو باری تعالیٰ نے مثال کے طور پر پیش فرما کر ایک نصیحت کی کہ: تم اپنے اعمال کے معاملہ میں ایسا مت کرنا کہ نیکی کے کام کرو اور پھر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھو کہ تمہارے وہ سارے کام ضائع و برباد ہو جائیں۔

معمولات چھوڑنے سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے

﴿وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے، اس سے پہلے یہ ہے ﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ ایمان والوں کے لیے کیا وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد کی طرف جھکیں؟ اور اللہ تعالیٰ نے جو احکام اتارے ہیں ان کی اطاعت و ادائیگی کے لیے اور ان پر عمل کرنے کے لیے متوجہ ہوں؟ اور ایمان والوں کو چاہیے کہ ان لوگوں کی طرح نہ بنیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی یعنی امتِ محمدیہ سے پہلے جو اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) آئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو چھوڑ دیا اور ایک زمانہ تک نافرمانیوں میں مبتلا رہے، توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوئی اور نافرمانیوں کا زمانہ ان پر طویل ہو گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل سخت ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اگر طویل زمانہ تک نیکیوں کا سلسلہ چھوڑے رہتا ہے تو اس کی وجہ سے دل میں سختی آجاتی ہے، پھر اس نیکی کا دوبارہ شروع کرنا بھاری اور مشکل ہو جاتا ہے۔

رہبانیت کیسے شروع ہوئی؟

﴿وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَّرَحْمَةً وَّرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کے متعلق باری تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے دلوں میں ہم نے شفقت اور رحمت کا مادہ بھر دیا، اور رہبانیت (یعنی دنیا کو چھوڑ چھاڑ کر اللہ کی عبادت میں مشغولی) والا طریقہ ان لوگوں نے اختیار کیا (باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) وہ طریقہ ہم نے ان پر لازم نہیں کیا تھا۔ ''رُہبان'' کا اصلی ترجمہ تو ''اللہ کا ڈر اور خوف'' ہے۔

بنی اسرائیل کے اندر ہوا یہ تھا کہ جب ایسے بادشاہ آئے جو دنیا کے اندر ایسے منہمک ہوئے جس کے نتیجہ میں انہوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات کو توڑنا شروع کیا، تو دین دار طبقہ جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنے والا تھا انہوں نے ان کو ان غلط حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن چوں کہ ان کے پاس حکومت کی طاقت تھی، حکومت و پیسے کی طاقت ہی کی وجہ سے وہ نافرمانی میں مبتلا ہوئے تھے، تو انہوں نے ان روکنے والوں کو قتل کر دیا۔ پھر دوسرا طبقہ آیا، انہوں نے دیکھا کہ اگر ہم ان کو روکنے جائیں گے تو یہ ہمیں بھی قتل کر دیں گے۔ گویا انہوں نے اپنے اندر ان کو روکنے کی طاقت نہیں پائی اور ان کو یہ بھی ڈر لگا کہ اگر ہم ان کے ساتھ رہیں گے تو ہم بھی ایسے ہی بن جائیں گے، تو اپنے دین کی حفاظت کی نیت سے انہوں لوگوں سے علاحدگی اختیار کر لی اور جنگلوں میں اور ایسے علاقوں میں چلے گئے جہاں زیادہ لوگ نہ بستے ہوں تا کہ وہاں رہ کر اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنا ان کے لیے آسان ہو جائے اور سنسان علاقوں میں بند مکان بنا کر عبادتوں میں مشغول ہو گئے اور لوگوں سے میل جول بالکل ختم کر لیا۔ یہی رہبانیت والا

طریقہ کہلایا۔ اللہ تعالیٰ کے ڈر سے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس طرح آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے احکام پر باقی اور قائم رکھ سکے۔

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے

ویسے شریعتِ محمدیہ میں رہبانیت نہیں ہے، بلکہ اصل تو یہ ہے کہ آدمی لوگوں میں مل جل کر رہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرے، لیکن اگر کسی آدمی کے لیے اپنے دین کو بچانا سوائے اس کے ممکن ہی نہ ہو کہ لوگوں سے علاحدگی اختیار کر لے، تو جیسا کہ حدیث کی کتابوں میں ہے اور بخاری شریف میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس پر مستقل باب قائم کیا ہے: ''إِنَّ مِنَ الدِّيْنِ اَلْفِرَارُ مِنَ الْفِتَنِ'' فتنوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے لوگوں سے دوری اختیار کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ فتنے ایسے عام ہو جائیں گے کہ لوگوں کے درمیان میں رہتے ہوئے آدمی کے لیے اپنے دین کی حفاظت مشکل ہو جائے گی، اس وقت بعض لوگ ایسے ہوں گے جو بکریاں وغیرہ مویشی لے کر پہاڑ کی ایسی چوٹیوں پر چلے جائیں گے کہ جہاں گھاس پانی ملتا ہوگا، وہاں بکریاں چَراتے رہیں گے اور اپنے دین کی حفاظت کریں گے۔

دینداروں کے لیے بھی یہی وقت آزمائش کا ہوتا ہے

بہر حال! ان لوگوں نے بھی رہبانیت والا طریقہ اختیار کر لیا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کو ایسا طریقہ اختیار کرنے کے لیے کہا نہیں تھا، بلکہ انہوں نے اپنے طور پر اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اور دین پر قائم رہنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ جب اس نیت سے یہ طریقہ اختیار کیا تھا تو پھر چاہیے تھا کہ اس کا اہتمام کرتے رہتے اور اس کو نہ چھوڑتے، لیکن جب ان کی توجہ الی اللہ، دینداری، تقویٰ و

پرہیزگاری، ان کی نیکوکاری کو دیکھ کر لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے- اور عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ آدمی جب تقویٰ اختیار کرتا ہے تو پھر لوگوں کا رجحان و میلان بھی ادھر ہوتا ہے- تو پھر یہ لوگ اپنے دین پر اور جس احتیاط پر ان کو قائم رہنا چاہیے تھا اس پر قائم نہیں رہے اور دنیا کی طلب میں پڑ گئے۔ تو رہبانیت والا طریقہ اصل میں تو اپنے آپ کو بے دینی اور دنیا طلبی سے بچانے کے لیے شروع کیا تھا، لیکن اسی کے نتیجہ میں جب لوگوں کا اُدھر رجوع ہوا تو دنیا طلبی میں پڑ گئے۔

آج بھی جب آدمی دین کی محنت کرتا ہے اور دین کے لیے قربانیاں دیتا ہے، تو لوگ اس کی نیکی اور تقویٰ کی وجہ سے عقیدت مندی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور یہی اس کے لیے زیادہ آزمائش کا وقت ہوتا ہے، اگر لالچ میں آکر شریعت والے طریقہ کو چھوڑ کر دنیا طلبی میں پڑ جائے گا تو پھر ناس مار لے گا اور اپنا نقصان ہی نقصان کرلے گا۔ اسی کو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ جو طریقہ اختیار کیا تھا اس کی پوری حفاظت اور رعایت نہیں کرسکے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تو واجب نہیں کیا تھا لیکن جب انہوں نے اس طریقہ کو اپنے دین کی حفاظت کے لیے شروع کیا تھا تو پھر چاہیے تھا کہ اس کی پابندی کرتے، لیکن انہوں نے پابندی نہیں کی۔

اس آیت میں ان کی جو مذمت اور برائی کی گئی ہے، وہ ان کے اس طریقہ کو اختیار کرنے پر نہیں کی گئی ہے، بلکہ اس راہ کو اختیار کرنے کے بعد چھوڑ دینے پر کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر وہ عمل جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب نہیں کیا گیا، لیکن کوئی آدمی اپنے طور پر نیکی اور بھلائی کا کام سمجھ کر اس کو شروع کر رہا ہے تو پھر اس کو چاہیے کہ اس کو نہ چھوڑے، بلکہ اس کی پوری پابندی کرے؛ یہی شریعت کی نگاہوں میں مطلوب ہے۔ اس آیت کو یہاں لاکر یہی بتلایا چاہتے ہیں۔

اے عبداللہ! فلاں جیسے مت بنیو

۶۹۲:-وعن عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: یَا عَبْدَ اللہ، لَا تَکُنْ مِثْلَ فُلانٍ، کَانَ یَقُوْمُ اللَّیْلَ فَتَرَکَ قِیَامَ اللَّیْلِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (کسی کی طرف اشارہ فرما کر) مجھ سے فرمایا: اے عبداللہ! فلاں جیسے مت بنیو کہ وہ راتوں کو اُٹھا کرتا تھا (تہجد پڑھتا تھا) پھر اس نے رات کو اُٹھنا چھوڑ دیا۔

افادات:- دیکھئے! تہجد پڑھنا فرض اور واجب نہیں ہے، لیکن جب کسی نے یہ عمل شروع کیا تو شریعت یہ چاہتی ہے کہ اس کو چھوڑا نہ جائے، اب تو ہر حال میں اس کو باقی رکھنا ہی چاہیے۔

آج کل ہمارے طبقہ میں یہ مزاج عام ہو گیا ہے کہ جوش میں آ کر ایک دو مہینہ تک کچھ معمولات: تہجد، اوابین یا چاشت شروع کرتے ہیں، اور یہ صرف عبادتوں کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، بلکہ نیکی کا کوئی بھی کام ہو، جیسے: کسی کے ساتھ بھلائی کرنے کا سلسلہ شروع کیا؛ پھر اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ گویا ہماری طبیعتوں میں تلوُّن مزاجی ہے یعنی ہماری طبیعت ایک طرح کی نہیں ہے بلکہ رنگ بدلتی رہتی ہے۔ اگر نیک بن گئے تو جنید بغدادی کو بھی شکست دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ پھر برائی پر آتے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو بھی ہرا دیں گے۔ بھائی! ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ کوئی بھی طریقہ ہو، اس میں اعتدال و میانہ روی سے چلئے۔ شریعت یہ چاہتی ہے کہ آپ اعتدال کو اختیار کریں، جیسا کہ پہلے بھی آ چکا کہ نیکی کے جس کام پر مداومت کی جائے وہی اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے، چاہے وہ چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو۔

پانی کا صرف ایک قطرہ اگر ایک زمانہ تک برابر ٹپکتا رہتا ہے تو پتھر کے اندر بھی سوراخ کر دیتا ہے، لیکن اگر پانی کا ایک ٹینک بھی ایک ساتھ بہا ڈالو، تو اس سے کچھ فرق پڑنے والا نہیں ہے۔

مداومت کا نتیجہ

انگلینڈ میں ہمارے ایک ملنے والے دوست ہیں، انہوں نے ایک مولوی صاحب کا مقولہ میرے سامنے نقل کیا۔ پاکستان کے ایک مولانا صاحب آئے ہوئے تھے، انہوں نے ایک پتھریلی زمین میں جہاں صرف پتھر ہی ہوتے ہیں، اس میں کسی جگہ کچھ سبزہ نکلا ہوا دیکھ کر مجھ سے بہت اچھی بات کہی کہ: دیکھو! پتھر بھی جب ایک جگہ پڑا رہا اور اس نے جگہ نہیں بدلی اور اس کے آس پاس تھوڑی سی مٹی تھی تو اس پر بھی سبزہ نکل آیا۔ لیکن اگر کسی جگہ مٹی ہی مٹی ہو اور اس کی بار بار کھدائی کرتے رہو، الٹ پلٹ کرتے رہو؛ تو کبھی اس میں گھاس کا ایک تنکا بھی اُگنے والا نہیں ہے۔ حالاں کہ پتھر کی خاصیت یہ ہے اس میں کچھ بھی نہیں اُگتا، لیکن وہ بھی جب ایک جگہ پڑا رہا تو اس میں نمو اور اُگانے کی کچھ صلاحیت آ گئی، اور مٹی میں نمو کی خاصیت ہے لیکن اس میں جب الٹ پلٹ ہوتی رہی تو اس میں کچھ بھی نہیں اُگتا۔ معلوم ہوا کہ درحقیقت کسی بھی عمل کو اثر انداز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر مداومت ہو۔

ساری خرابی یہیں سے آتی ہے

ہمارا مزاج تو ایسا ہے کہ ہم دو روز تہجد پڑھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ تیسرے دن جبرئیل آنے ہی چاہئیں، تب کچھ بات بنے گی۔ نہیں بھائی! ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ کرتے رہو، کرتے رہو، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس نیکی کے کام کی توفیق دی

ہے، یہی بہت بڑی بات ہے، اب آپ اور کیا چاہتے ہیں؟ دوسرا کوئی بدلہ چاہو ہی مت۔ دراصل ساری خرابی یہیں سے آتی ہے کہ ہم دوسرے بدلے چاہنے لگتے ہیں۔ ارے بھائی! یوں سوچو کہ ہم اپنی زبان سے ''اللہ'' کا جو نام لے رہے ہیں؛ یہی اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کا مقابلہ اور کوئی چیز نہیں کر سکتی، اگر اس پر جنت نہ بھی ملے تب بھی ''اللہ'' کا نام لینا خود جنت سے بڑی نعمت ہے؟ پھر اس پر ہی کیوں خوش نہ ہوؤں؟ دوسرا کوئی بدلہ کیوں چاہوں؟

ہم لوگ ذکر اسی لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ ہم اپنے جی میں ایسا سوچتے ہیں کہ جب ہم نے ذکر شروع کیا تو پھر ہمارے کاروبار میں برکت کیوں نہیں ہوتی؟ ہماری آمدنی (Income) بڑھ کیوں نہیں گئی؟ ابھی تک تین ہزار کا نفع ہوتا تھا، اب چار ہزار کا نفع کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ میں کئی سال سے چلّہ دے رہا ہوں، برابر نماز پڑھ رہا ہوں، اب تو تہجد، اشراق و چاشت بھی شروع کر دی ہے، پابندی سے درس میں حاضری دیتا ہوں، اتنا سب کر رہا ہوں، لیکن کوئی ''Response'' نہیں مل رہا ہے۔ گویا یہ سب کر کے کیا ہم اللہ تعالیٰ پر احسان کر رہے ہیں؟ ارے بھائی! اللہ تعالیٰ نے اس سب کی توفیق دی اور ہم نے اپنی زبان سے اس کا نام لیا؛ یہی بہت بڑی اور اصل نعمت ہے، اب اس کے بدلہ میں اور کیا مانگتے ہو!

ذکر میں دل نہیں لگتا، پریشان کیوں ہوتے ہو؟

سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا: حضرت! میں ذکر کرتا ہوں لیکن اس میں جی نہیں لگتا؟ حضرت نے فرمایا: بھائی! اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے ایک عضو یعنی زبان کو اپنی یاد میں لگا یا ہے۔ درحقیقت یہ

بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس لیے کہ ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ یہی زبان اللہ کا نام لینے کے بجائے گالیاں بکتی، یا اور کوئی گناہ کا کام کرتی، اللہ تعالیٰ نے اس کو گناہ سے بچا کر اپنی یاد میں لگایا؛ یہی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اب اس پر اس کا شکر ادا کرو، تو قاعدہ ہے ﴿لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَأَزِيۡدَنَّكُمۡ﴾ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر تم شکر ادا کروگے تو میں نعمتوں میں اضافہ کروں گا، اس لیے اگر اس پر شکر کروگے تو پھر آگے چل کر دل بھی لگے گا۔ پریشان کیوں ہوتے ہو کہ دل نہیں لگتا، زبان سے ذکر کرنے پر بھی ثواب تو ملتا ہے۔

خلاصۂ باب

اگر آپ نماز پابندی سے پڑھتے ہیں، تو بس! پڑھتے رہیے، یہ نہ سوچئے کہ میں پابندی سے نماز پڑھتا ہوں، پھر بھی مجھے بخار کیوں آیا؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی یہ اس کی بہت بڑی نعمت ہے۔ کسی کو کروڑہا کروڑ روپے مل جائیں اور وہ نماز سے محروم ہے، اس کے مقابلہ میں آپ جو پنج وقتہ نماز پڑھتے ہیں؛ یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کے کروڑ ہا کروڑ روپے اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اگر آپ کا ایمان یہ ہے تو پھر آپ دوسرے کسی چکّر میں کیوں پڑتے ہیں؟ اس لیے اس کا اہتمام کرتے رہیں۔

یہ ساری باتیں ہیں، ان کو ذہن میں بٹھا لیجئے، اور دوسرے کسی چکّر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

استحباب طیب الکلام وطلاقة الوَجه عند اللقاء

خوش کلامی اور ملاقات کے وقت چہرے کو مسکراتا ہوا رکھنے کا پسندیدہ ہونا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ (الحجر:۸۸)

وقال تعالیٰ: ﴿وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

ہر کس و ناکس کو مسخر کرنے والا نسخہ

آداب کا بیان چل رہا ہے، اسی سلسلہ میں ایک عنوان قائم کیا ہے: خوش کلامی اور ملاقات کے وقت چہرے کو مسکراتا ہوا رکھنے کے پسندیدہ ہونے کا بیان۔

یہ بھی ایک ادب ہے کہ آدمی جب کسی کے ساتھ ملاقات کرے، اس وقت اپنا چہرہ ہنستا ہوا رکھے، اور جب بات کرے تو اچھے طریقہ سے بات کرے۔ بھائی! اس میں تو جیب میں سے کچھ پیسے بھی خرچ نہیں ہوتے ہیں۔ یہ ایسا عجیب وغریب نسخہ اور عمل ہے جو ہر کس و ناکس، دشمنوں اور دوستوں، اپنوں اور پرایوں کو مسخر کرنے والا ہے جو لوگ اس قسم کا مزاج رکھتے ہیں ان سے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اور آج کل تو تجارت میں یہ بہت ہی بنیادی اصول سمجھا جاتا ہے کہ لوگوں کا بڑی خوش دلی کے ساتھ چہرہ ہنستا رکھتے ہوئے استقبال کیا جائے، بلکہ اب تو یہ ایک مستقل فن ہو چکا ہے جس کی تربیت دی جاتی ہے، لوگ اس طرز کو سیکھ کر سلیس مین شپ (Sales Man Ship) کرتے ہیں اور اسی پر سروس اور ملازمتیں ملتی ہیں۔ حالاں کہ شریعت نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ جب بھی آپ کسی سے ملیں تو ملاقات کے وقت دو چیزوں کا خیال رکھئے، ایک یہ کہ بات چیت اچھے انداز سے کیجئے، جس کو خوش کلامی کہا جاتا ہے، اور دوسرا یہ کہ چہرہ ہنستا ہوا رکھئے۔ اور کمال تو یہ ہے کہ اس کو نیکی کا کام قرار دیا، گویا آپ اس عمل کو کریں گے تو اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوگا اور نبی کریم ﷺ کی سنت بھی ادا ہوگی۔

یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ ہے

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ تو یہ تھا کہ ایسے لوگ جو واقعتاً اپنے غلط رویے اور اپنی بدعملی کی وجہ سے لوگوں کے ساتھ اچھی طرح سے پیش نہیں آتے تھے، اور ان کا معاملہ ٹھیک نہیں ہوتا تھا، جس کی وجہ سے وہ اس قابل نہیں ہوتے تھے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے؛ اس کے باوجود بھی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جب ایسے لوگ حاضر ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے بھی نرم گفتگو فرماتے اور ہنس کر بات فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ یہی تھا۔

مدارات؛ جس کو دل جوئی کرنا کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے ساتھ خوش خُلقی سے اور ظاہری طور پر اچھے انداز سے پیش آنا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف میں ایک عنوان قائم کیا ہے: "بَابُ الْمُدَارَاةِ مَعَ النَّاسِ"، اس میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ نقل کیا ہے کہ: بہت سے لوگوں کے سامنے ہم مسکراتے ہیں، حالاں کہ ہمارے دل ان پر لعنت کر رہے ہوتے ہیں (۱) یعنی ان کے اعمال کی وجہ سے دل ان سے خوش نہیں ہوتے، لیکن اس کے باوجود جب ہم ان سے ملتے ہیں تو ہم ان کے ساتھ ہنستے ہوئے چہرہ سے ملاقات کرتے ہیں۔

اسلام نے جو آداب سکھائے ہیں ان میں سے یہ بھی ہے: "إِدْخَالُ السُّرُوْرِ" کسی کے دل میں مسرت داخل کرنا۔ کوئی بھی ہو، جب آپ اس سے ہنس کر ملاقات کریں گے، اور نرم طریقہ سے اچھی بات کریں گے، تو اس کا دل خوش ہوگا، یہ بھی بہت بڑی نیکی کا کام ہے۔ یہ ایک ایسا ادب اور شریعت کی ایسی تعلیم ہے کہ آج ہم اس کی طرف سے بہت

(۱) عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ: إِنَّا لَنَكْشِرُ فِي وُجُوهِ أَقْوَامٍ وَإِنَّ قُلُوبَنَا لَتَلْعَنُهُمْ.

غفلت اور بے پرواہی سے کام لیتے ہیں۔

آدمی کے لئے بڑی بری چیز ہے

ایک مرتبہ ایک صاحب نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے آپ کے گھر کے باہر سے اجازت مانگی کہ میں اندر آسکتا ہوں۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب ان کی آواز سنی تو ان کو پہچان لیا اور فرمایا: ’’بِئْسَ ابْنُ الْعَشِيرَةِ‘‘ یہ آدمی اپنے قبیلہ کا بڑا برا آدمی ہے، اس کے بعد ان کو آنے کی اجازت دی۔ جب وہ آکر بیٹھے تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ بہت ہی نرمی سے گفتگو کی۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے ان کے متعلق تو یہ فرمایا تھا، لیکن جب وہ آپ کے پاس آئے تو آپ نے ان کے ساتھ بڑے نرم انداز میں گفتگو فرمائی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! آدمی کے لئے یہ بات بڑی بری ہے کہ اس کی بدخلقی کی وجہ سے لوگ اسے چھوڑ دیں (بخاری شریف: باب الْمُدَارَاةِ مَعَ النَّاسِ) مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کے متعلق جو کہا تھا کہ یہ اپنے قبیلہ کا بڑا برا آدمی ہے، وہ ان حالات کی وجہ سے کہا تھا جو اس میں تھے، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں بھی اس کے ساتھ برائی سے ہی پیش آؤں؟ مجھے تو اپنے اخلاق کو باقی رکھنا ہیں۔

میں اپنے اخلاق کیوں خراب کروں!

قاضی یحییٰ بن اکثم رحمۃ اللہ علیہ بڑے قاضی گزرے ہیں، ایک مرتبہ ان کو ہارون الرشید کے یہاں رات گزارنے کا موقع ملا۔ ہارون الرشید اپنے وقت کا بہت بڑا بادشاہ تھا۔ پہلے بھی کسی موقع پر میں بتلا چکا ہوں کہ ان کی سلطنت اور حکومت اتنی بڑی تھی کہ ایک مرتبہ ایک بادل جارہا تھا جس کو خطاب کرتے ہوئے ہارون الرشید نے کہا تھا: اے

بادل! تو کہیں بھی جا کر برس، تیرے پانی سے جو غلہ پیدا ہوگا، اس کا خراج میرے ہی خزانہ میں آنے والا ہے۔ خیر! قاضی یحییٰ بن اکثم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ رات میں بادشاہ سلامت کو پانی کی ضرورت پیش آئی تو کسی خادم کو آواز دی کہ ذرا پانی پلاؤ۔ تو وہ نیند میں سے اُٹھا اور کہنے لگا: دن میں بھی چین نہیں، رات میں بھی چین نہیں لینے دیتے، اور اس طرح بڑبڑاتے ہوئے پانی لا کر دیا، اپنے وقت کے اتنے بڑے بادشاہ کو اس طرح کہہ رہا تھا، وہ تو اس کی گردن کٹوا سکتا تھا، لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ قاضی یحییٰ بن اُکثم رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے کہا: امیر المؤمنین! ایک زرخرید غلام (یعنی کوئی نوکر نہیں تھا بلکہ غلام تھا جس کو آقا اپنی ملکیت میں رکھتا ہے) نے آپ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا اور آپ نے اس کو کچھ بھی تنبیہ نہیں کی؟ اس پر کوئی ایکشن بھی نہیں لیا؟ تو ہارون الرشید نے کہا: بھائی! وہ بد خُلُقی سے پیش آیا تو اس کی وجہ سے میں اپنے اخلاق کیوں خراب کروں؟ جیسے: کتے کی عادت کاٹنے کی ہے، تو اگر وہ آپ کو کاٹ لے؛ تو کیا آپ بھی اس کو کاٹ لیں گے؟ نہیں نا! سیدھی سی بات ہے۔ اس لئے حقیقت تو یہ ہے کہ کسی کی بد خلقی کی وجہ سے ہمیں اپنے اخلاق خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شریعت ہمیں یہی تعلیم دیتی ہے، اور سمجھ لیجئے کہ شریعت کی تعلیم کا خلاصہ یہی ہے۔

اندازہ لگائیے کہ کتنا اچھا ادب سکھایا ہے! آج اسی تعلیم کو اگر ہم اپنا لیں تو ہمارے سماج و معاشرہ کے بہت سارے مسئلے حل ہو سکتے ہیں، لیکن ہمارا حال تو یہ ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر دوسروں سے بدگمان ہو جاتے ہیں اور اسی بدگمانی کی بنیاد پر بد خلقی کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، تعلقات میں کشیدگیاں آتی ہیں اور پھر بہت سارے لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر شریعت کی اس تعلیم پر ہم عمل کر لیں تو معاملہ بہت ہی آسان ہو جائے۔

یہ ہمارا مزاج ہے

پھر اپنے گھر کے لوگوں کے ساتھ تو اور زیادہ اس کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ آج کل معاملہ الٹ گیا ہے، آدمی پرایوں کے ساتھ تو بہت ہنس بول کر باتیں کرتا ہے، لیکن جب گھر میں جاتا ہے تو اس کا موڈ ہی چینج (Change) ہوجاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ آدمی ہے ہی نہیں۔ چہرہ بھی بڑا بھیانک بنا کر جاتا ہے، گھر والے بھی اس کو دیکھ کر سہم جاتے ہیں کہ پتہ نہیں آج کیا بلا اور اُفتاد ہم پر آنے والی ہے، وہ بھی "یَارَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ" کا وظیفہ پڑھتے ہیں۔ ہمارا مزاج ایسا ہے، حالاں کہ آدمی کے اخلاق تو گھر والوں کے ساتھ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی پرایا آدمی آگیا اور اس کے ساتھ آپ نے ہنس بول کر باتیں کرلیں؛ تو یہ اخلاق نہیں ہیں۔ اخلاق تو یہ ہیں کہ ۲۴؍ گھنٹے جن کو آپ سے واسطہ پڑتا ہے، وہ آپ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ آپ کے متعلق ان کا (Opinion) کیا ہے؟

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک عورت کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ: وہ نماز بھی خوب پڑھتی ہے، روزے بھی خوب رکھتی ہے، اور بڑی عبادت گزار ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: اس کا معاملہ پڑوسیوں کے ساتھ کیسا ہے؟ عرض کیا: ٹھیک نہیں ہے؛ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ جہنمی ہے۔ دوسری عورت کے متعلق عرض کیا: وہ فرض نماز تو پڑھ لیتی ہے، لیکن نوافل کا اہتمام نہیں کرتی۔ پوچھا: پڑوسیوں کے ساتھ معاملہ کیسا ہے؟ کہا: بہت اچھا ہے؛ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ جنتی ہے۔ (مسند احمد۔ حدیث نمبر: ۹۶۷۳)

وہ اخلاق کس کام کے!

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ آدمی کے

اخلاق کا ساری دنیا میں خوب چرچہ ہو، اور اس کے گھر والے ہی اس سے خوش نہ ہوں؛ تو وہ اخلاق کس کام کے! جیسے: آپ کی سخاوت سے پوری دنیا فیض اُٹھا رہی ہو، اور گھر والے ہی بھوکے مرتے ہوں؛ تو ایسے آدمی کو کوئی سخی کہے گا؟ آپ کے اخلاق کی ساری دنیا تعریف کرتی ہو، اور گھر والوں کو شکایت ہو کہ وہ تو گھر میں آکر کبھی ہمارے ساتھ ہنس کر بات ہی نہیں کرتے۔ عام طور پر بیویوں کو شوہروں سے یہی شکایت رہتی ہے کہ ابھی باہر تو خوب ہنس بول رہے تھے، اور گھر میں جب آئے تو ان کا چہرہ ہی بدل گیا، گھر میں آکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالکل ہی بدل گئے۔ یہ مناسب طریقہ نہیں ہے۔ اگر کسی چیز پر تنبیہ کی تھی وہ اپنی جگہ پر ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب ۲۴ر گھنٹے آپ منہ بسورے ہوئے، لیجیو دیجیو، اپنے آپ کو لئے دئے رہتے ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ آدمی ہنس بول کر رہے۔ حدیثِ پاک میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ آدمی گھر والوں کے ساتھ کس طرح رہے، ان کے ساتھ بالکل بے تکلّف رہے، ان کے اوپر بوجھ بن کر نہ رہے کہ آپ جب گھر میں جائیں تو وہ یہی دعا کرتے رہیں کہ یہ مصیبت یہاں سے کب ٹلے، بلکہ گھر کے اندر ایسے بن کر رہیے کہ وہ یہ چاہیں کہ یہ گھر میں سے نہ جائیں؛ تب کوئی بات ہے۔

بہر حال! بوقتِ ملاقات لوگوں سے ہنستے ہوئے ملنا اور اچھے طریقہ سے بات کرنا مستحب ہے، یہ شریعت کی نگاہوں میں پسندیدہ اور کارِ ثواب ہے، اور یہ نیکی ہم مفت میں حاصل کر سکتے ہیں، اس کے لئے پیسے خرچ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، اور بہت ہی آسان بھی ہے۔

اپنے بازوؤں کو جھکائے رکھنا

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کوتاکید کی گئی: ﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ﴾ دنیا کے مختلف گروہوں (کفار اور مشرکین، یہود ونصاریٰ) کو دنیا کی نعمتیں ہم نے برتنے کے لئے دی ہیں، ان کے پاس دولت کتنے دنوں تک رہے گی؟ جب تک دنیا میں ہیں وہاں تک ہے، پھر ان کے ہاتھ سے چھین لی جائے گی، اور پھر ان کے ساتھ جو معاملہ ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا، اس لیے ان کی طرف آپ اپنی آنکھیں بھی نہ اُٹھائیے۔ اور اپنے لوگوں کے ساتھ کیا کرنا ہے؟ ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ ایمان والوں کے سامنے اپنے بازوؤں کو جھکائے رکھیے۔

دیکھو! صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق قرآنِ پاک میں کہا گیا ہے: ﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ آپس میں رحمدل اور کفار کے معاملہ میں سخت تھے۔ آدمی کے دل میں ایمان جتنا زیادہ سرایت کرتا جاتا ہے، اتنا ہی یہ وصف آدمی کے اندر پیدا ہوتا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اپنوں کے ساتھ شفقت کا معاملہ ہونا چاہیے۔

اگر آپ بدخُلق اور سخت دل ہوتے

باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ دیکھو! باری تعالیٰ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کر کے یہ فرمارہے ہیں کہ اگر آپ بدخلق اور سخت دل ہوتے؛ تو یہ لوگ (یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم) آپ کے پاس سے بکھر جاتے۔ حالاں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جو محبت تھی وہ سب جانتے ہیں، اس کے باوجود باری تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہیں کہ: اے ہمارے رسول! اگر آپ ایسے ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے کب سے بکھر جاتے، کوئی آپ کے پاس نہ ٹھہرتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اچھے اخلاق اور اچھا سلوک، لوگوں سے ہنس کر ملنا، اچھی طرح سے باتیں کرنا اور اچھے طریقہ سے پیش آنا؛ یہ لوگوں کو آدمی سے قریب کرتا ہے، اگر یہ طریقہ اپنایا جائے گا تو غیر بھی آپ سے قریب ہو جائیں گے، اور اگر اس کے برخلاف معاملہ کیا جائے گا تو اپنے بھی دور ہو جائیں گے۔ اس لئے شریعت نے ہمیں اس ادب کی تعلیم دی ہے۔

کم از کم اسی کی عادت ڈال لی جائے

۶۹۳:-عن عدی بن أبي حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ **قال: قال رسول الله** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:
اتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ، فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَبِكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عدی بن اَبی حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ؛ چاہے کھجور کے آدھے حصہ کے ذریعہ سے ہی ہو۔ اگر کسی کے پاس صدقہ کرنے کے لئے آدھی کھجور بھی نہیں ہے؛ تو اچھی بات کسی کو کہہ کر ہی سہی۔

افادات:- یعنی اگر آپ کے پاس کھجور کا آدھا دانہ ہے اور اس کا آپ نے صدقہ کر دیا تو اس سے اللہ تعالیٰ کی جو خوشنودی حاصل کی جائے گی، وہ بھی آپ کو جہنم کے عذاب سے بچانے کا ذریعہ بنے گی۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کے ساتھ اچھی طریقہ سے بات کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی ایسی خوشنودی اور رضامندی عطا کرتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں آدمی جہنم سے بچ جاتا ہے۔ کتنا آسان نسخہ ہے! دوسرے اعمال کے مقابلہ میں یہ بہت آسان عمل ہے، اگر کوئی آدمی کم از کم اسی کی عادت ڈال لے، تو دن بھر میں جتنے آدمیوں سے ہنس کر ملے گا اور اچھی طرح بات کرے گا، اتنی ہی نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں بڑھتی جائیں گی۔

اس پر بھی صدقہ کا ثواب

۶۹۴:-وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ أن النبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ **ترجمہ**:-حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: اچھی بات بھی صدقہ ہے۔

افادات:-یعنی صدقہ کرنے سے جس طرح ثواب ملتا ہے، اسی طرح اگر آپ لوگوں سے اچھی طرح بات کریں گے، اس پر بھی اتنا ہی ثواب ملے گا۔ بھائی! صدقہ میں آپ نے پیسے خرچ کر کے ظاہری بھلائی کا معاملہ کیا، اور اس میں آپ نے اپنے اخلاق کے ذریعہ معنوی طور پر بھلائی کا معاملہ کیا، تو جو ثواب اس میں ملتا ہے، وہی ثواب اس میں بھی ملے گا۔ اس لئے اگر کسی کے پاس روپیہ پیسے نہیں ہیں کہ وہ خرچ کر کے صدقہ کا ثواب حاصل کر سکتا ہو، تو بھلی باتیں کہہ کر اور لوگوں سے اچھے طریقہ سے پیش آ کر بھی صدقہ کا ثواب حاصل کر سکتا ہے۔

ہنستے چہرے سے ملاقات بھی نیکی ہے

۶۹۵:-وعن أَبِي ذَرٍّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ لِي رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ شَيْئاً، وَلَوْ أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ.

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی بھی نیکی کے کام کو معمولی مت سمجھو، چاہے تم اپنے بھائی سے ہنستا ہوا چہرہ رکھ کر ملاقات کرو۔

افادات:-اس روایت میں ایک تعلیم تو یہ ہے کہ نیکی کا کام چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں ہو، اس کو معمولی نہ سمجھو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی گنہگار رہے، برائیوں میں پھنسا ہوا ہے، نیکی کے کام نہیں کرتا، پھر کبھی اس کو چھوٹی سی نیکی کا کام کرنے کا موقع

مل گیا، تو شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ تیری تو ساری زندگی گناہوں میں گزر رہی ہے، تو نماز تو پڑھتا نہیں، روزے تو رکھتا نہیں، دوسرے فرائض بھی ادا نہیں کرتا؛ اب یہ چھوٹی سی نیکی کرنے سے تجھے کیا فائدہ ملے گا؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ ایسا مت سوچو، کسی بھی نیکی کے کام کو حقیر نہ سمجھو۔ اس لئے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی چھوٹا سا نیکی کا کام خلوصِ دل سے کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسا مقبول ہوجاتا ہے اور اس کام سے اللہ تعالیٰ ایسا خوش ہوجاتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں پھر نیکی کے بڑے بڑے کام کرنے کی بھی توفیق دی جاتی ہے۔ وہاں تو شاہی معاملہ ہے، کبھی چھوٹی سی بات پر خوش ہوجائیں تو بخش دیں۔ اس لئے کسی بھی نیکی کے کام کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، اور اسی طرح کسی بھی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر کرنا بھی نہیں چاہیے۔

دوسری تعلیم یہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے ہنستا ہوا چہرہ رکھ کر ملاقات کرو، یہ بھی ایک نیکی ہے، اس کی اپنے اندر عادت ڈالو، اس کو معمولی مت سمجھو، اگر اسی کا اہتمام کروگے؛ تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دوسری نیکیوں کی توفیق دے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہنستے ہوئے چہرہ کے ساتھ ملاقات کرنا، چاہے اندرونی طور پر حالات اور معاملات جو کچھ بھی ہوں، لیکن کسی کے ساتھ جب ملاقات کرو تو اس طرح سے ملو کہ اس کی طبیعت پر کوئی کدورت نہ آئے۔ ایسا نہ ہو کہ ہر وقت اپنا منہ ایسا رکھتے ہیں جیسا کہ (اَرنڈی کا تیل) دِیوِیل (દીવેલ) پیا ہوا ہو۔ نہیں بھائی! اپنا چہرہ ہمیشہ ہنستا ہوا رکھنا بھی ایک ادب و نیکی ہے۔

استحباب بیان الكلام وإيضاحه للمخاطب وتكريره ليفهم إذا لم يفهم إلا بذلك

بات کو مخاطب کے سامنے صاف اور واضح انداز میں کرنا

اور اگر بغیر تکرار کے نہ سمجھتا ہو؛ تو مکرر کرنا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

گفتگو کے آداب

ایک اور عنوان قائم کیا ہے کہ: جو آپ کا مخاطب ہے یعنی جس سے آپ گفتگو کر رہے ہیں اس کے سامنے آپ کا اپنی بات کو ایسے انداز سے واضح طور پر کرنا کہ وہ آپ کی بات سمجھ جائے۔ اور اگر آپ کا خیال یہ ہو کہ ایک مرتبہ کہنے سے آپ کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہے تو دوسری مرتبہ کہہ دیجئے، اور دوسری مرتبہ سے بھی وہ نہیں سمجھا تو تیسری مرتبہ کہئے۔ آپ کی طرف سے کوشش یہ ہو کہ اس کو سمجھانے کا اہتمام کریں، خاص کر کہ جب استاذ پڑھاتا ہے اور شاگرد کی طرف سے مطالبہ ہو تو اس میں اس چیز کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے۔ دین کی کوئی بات آپ کسی کو بتلا رہے ہیں اور اسے سمجھ میں نہیں آئی تو دوبارہ بتلایئے، تیسری مرتبہ بھی سمجھایئے، جب تک کہ اس کی سمجھ میں نہ آئے آپ اس کو سمجھانے کی کوشش کیجئے۔ اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے دو یا تین مرتبہ بولنے سے وہ سمجھ جائے گا تو پھر آپ کی طرف سے اس میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس چیز کا اہتمام فرماتے تھے۔

کلام کا ایک ادب

۶۹۶:-عن أنسٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم كَانَ إِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَعَادَهَا ثَلَاثاً حَتَّى تُفْهَمَ عَنْهُ، وَإِذَا أَتَى عَلَى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلَاثاً.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی بات ارشاد فرماتے تھے تو تین مرتبہ اس کو دوہراتے تھے تا کہ لوگ سمجھ جائیں۔ اور جب سلام فرماتے تھے تو وہ بھی تین مرتبہ فرماتے تھے۔

افادات:- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ بولنے میں سب تک آواز نہیں پہنچتی، اس لئے دوسری مرتبہ بولنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یا کوئی جملہ کسی کے کانوں میں پورا نہیں پہنچ پایا، بولنے والا تو پورا بولا لیکن سامنے والے کے کانوں تک آواز نہیں پہنچی اس لئے دوسری مرتبہ بولنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو سمجھانے کے لئے اور ان کے کانوں تک پوری بات پہنچانے کے لئے دوسری مرتبہ کہنا پڑے گا؛ تو پھر دوسری مرتبہ بولئے۔ یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ مخاطب کے انداز اور اس کے چہرے سے یہ سمجھ جاتے ہیں کہ اس نے پوری بات سنی نہیں ہے اور آپ کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دوبارہ بولوں گا تو وہ سمجھ جائے گا؛ تو پھر آپ کو اعادہ کرنا چاہیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی معمول تھا۔ اسی طرح جب کوئی اہم بات ہوتی تھی تب بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں تک پہنچانے کے لئے تین مرتبہ ارشاد فرماتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ دوسری یا تیسری مرتبہ بولنے سے سامنے والے تک آواز پہنچ جائے گی اور وہ سمجھ جائے گا تو پھر آپ کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ایسے موقع پر یہ نہ سوچئے کہ دوبارہ کون بولتا ہے، خواہ مخواہ زحمت اٹھانی پڑے گی۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب سلام فرماتے تھے تب بھی تین مرتبہ فرماتے تھے۔ اس کی تشریح علماء نے یہ لکھی ہے کہ کبھی بڑا مجمع ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ میں آواز سب تک نہیں پہنچتی تو تین مرتبہ سلام فرماتے کہ پہلے سامنے سلام کیا، پھر دائیں کیا، پھر بائیں کیا، تاکہ تمام لوگوں تک آواز پہنچ جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام بھی ایسا ہی ہوتا تھا

۶۹۷:- وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: كَانَ كَلَامُ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم كَلاماً

فَصْلاً، يَفْهَمُهُ كُلُّ مَنْ يَسْمَعُهُ. (رواه أبو داود.)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گفتگو بالکل واضح اور الگ الگ ہوتی تھی، ہر سننے والا اس کو سمجھ جاتا تھا۔

افادات:- یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنا جلدی نہیں بولتے تھے کہ ایک کلمہ دوسرے میں اس طرح جڑ جائے کہ سننے والے کو سمجھنے میں دشواری پیش آئے، جیسے بعض لوگ جلدی جلدی بولتے ہیں تو اس میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک کلمہ دوسرے میں مل جانے کی وجہ سے سننے والوں کو سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح گفتگو فرماتے کہ ہر حرف آپ کی زبانِ مبارک سے اچھی طرح سے ادا ہوتا تھا۔ یہ بھی بولنے کے آداب میں سے ہے۔ متکبر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بات پوری نہیں بولتے، ایک آدھ بات ادھوری چھوڑ دیتے ہیں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادتِ شریفہ ایسی نہیں تھی، آپ اطمینان سے ہر کلمہ اور ہر لفظ الگ الگ کر کے ارشاد فرمایا کرتے تھے تاکہ ہر سننے والا اس کو سمجھ جائے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مضمون ہی دقیق اور باریک ہوتا ہے، بولنے والا الفاظ تو پورے بولتا ہے اور بات بھی پوری پہنچ جاتی ہے، لیکن سامنے والے کی عقل اس کو حل نہیں کر پاتی؛ وہ ایک الگ چیز ہے۔ اور ایک یہ ہوتا ہے کہ بات پورے طور پر کانوں تک نہ پہنچنے کی وجہ سے آدمی وہ بات سمجھ نہیں سکتا، یہاں اسی کو بتلانا مقصود ہے کہ آپ اس طرح بولو کہ بات ہر ایک تک پورے طور پر پہنچ جائے تاکہ کسی کو دشواری نہ ہو۔ یہ بھی زندگی گزارنے کے آداب میں سے ایک ادب ہے۔

باب إصغاء الجليس لحديث جليسه الذي ليس بحرام وإستنصات العالم والواعظ حاضري مجلسه

اپنے ہم نشین کی بات کی طرف دھیان دینا اور عالم وواعظ کا حاضرین کو اپنی بات سنانے کے لئے خاموش کرنا

مجلس کے آداب

ایک اور عنوان قائم کیا ہے کہ ایک ہم نشین کا اپنے دوسرے ہم نشین کی ایسی بات کی طرف کان دھرنا اور دھیان سے سننا جو بری نہیں ہے؛ یہ بھی آداب میں سے ہے۔ یعنی کوئی آدمی جب کوئی بات کہتا ہے تو آپ اس بات کو دھیان سے سنیں۔

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس کا جو حال حدیثِ پاک میں بیان کیا جاتا ہے وہ شمائل میں موجود ہے کہ آپ کی مجلس میں جب کوئی آدمی بات کرتا تھا تو سب لوگ خاموشی سے اس کو سنتے تھے اور دھیان دیتے تھے، ایسا نہیں ہوتا تھا کہ سب ہی بول رہے ہیں۔ اس لیے ایک آدمی جب اپنی بات سے فارغ ہو جائے، پھر دوسرا بولے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ایک کا کلام چل رہا ہے، اسی درمیان میں دوسرا اور تیسرا بھی بولنا شروع کر دے کہ اب کوئی بھی کسی کی بات صحیح طریقہ سے سن ہی نہیں پا رہا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ ہم نشین اور ایک ہی مجلس میں پاس بیٹھنے والا آپ سے کوئی بات کرتا ہے تو اس کی بات کی طرف دھیان دینا اور غور سے سننا؛ یہ بھی اس کا حق ہے۔ ہاں! اگر وہ کوئی نامناسب اور غلط بات کر رہا ہے جو کرنی نہیں چاہیے، جیسے: کسی کی غیبت کر رہا ہے اور کوئی غلط بات کر رہا ہے؛ تو پھر اس کو سننے کی ضرورت نہیں ہے، اس کی طرف سے آپ دھیان ہٹا لیجیے۔ لیکن اگر وہ بات غلط نہیں ہے اور شرعاً کوئی ناجائز بھی نہیں ہے، تو پھر آپ کو اس کی بات کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اور عالم و واعظ کا مجلس کے حاضرین کو خاموش کرنا، جیسا کہ کبھی ہوتا ہے کہ مجلس میں شور و شغب اُٹھ رہا ہے، تو اگر کوئی کہے کہ بھائی! چپ رہو، اور دھیان سے سنو۔ تو اپنی بات سنوانے کے لیے خاموشی کا مطالبہ کرنا اور چپ ہونے کے لیے کہنا؛ یہ بھی جائز ہے، بلکہ یہ مجلس کے آداب میں سے ہے۔

لوگوں کو خاموش کردو

۶۹۸:- عن جریر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ لِی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی حَجَّةِ الْوَدَاعِ: اسْتَنْصِتِ النَّاسَ. ثُمَّ قَالَ: لاَ تَرْجِعُوا بَعْدِی كُفَّاراً يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ: لوگوں کو خاموش کردو (ان کو خاموش رہنے کی تاکید کرو۔ جب لوگ خاموش ہو گئے اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف متوجہ ہو گئے اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو خطبہ دینا تھا وہ شروع فرمایا) اس میں ایک بات یہ بھی ارشاد فرمائی اور صحابۂ کرام کو تاکید فرمائی کہ میرے دنیا سے جانے کے بعد کافروں جیسے مت بن جائیو کہ کافر آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارتے ہیں، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں، تم لوگ آپس میں ایسا معاملہ مت کرنا۔

افادات:- نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ نصیحت اور وعظ فرمانا چاہتے تھے، اور لوگ اپنی اپنی باتوں میں مشغول تھے، اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی حالت میں بولنا شروع فرمادیتے، تو بہت سی مرتبہ ایسی حالت میں پتہ بھی نہیں چلتا کہ کوئی بات کہی جارہی ہے، اس لیے بولنے والے کو بھی چاہیے کہ پہلے ان کو خاموش کرے، پھر جو کچھ کہنا ہو وہ کہے۔ دیکھو! حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس بات کا اہتمام فرمایا کہ حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ لوگوں سے کہو کہ خاموش ہو جائیں۔ چناں چہ حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اعلان کیا۔ جیسا کہ مائک میں کہا جاتا ہے کہ بھائیو! خاموش ہو جاؤ اور دھیان دو اور سنو، پھر بات کہی جاتی ہے۔ یہاں اس روایت کو لاکر یہی بتانا چاہتے ہیں کہ یہ طریقہ ثابت ہے، اور اسی طرح ہونا بھی چاہیے۔

باب الوعظ والاقتصاد فیه

وعظ ونصیحت میں میانہ روی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شریعت کی ایک اہم تعلیم

نیا عنوان قائم کیا ہے: وعظ کہنا، نصیحت کرنا اور اس میں میانہ روی سے کام لینا۔

یہ بھی شریعت کی ایک اہم تعلیم ہے۔ دیکھو! کوئی کام کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، لیکن اس میں بھی شریعت یہ کہتی ہے کہ اعتدال سے کام لو۔ بڑے سے بڑا صاحبِ علم اور بڑے سے بڑا شیریں کلام اور نصیحت کی اچھی اچھی باتیں کہنے والا بھی اگر بار بار کہتا رہے گا تو لوگ تنگ آجائیں گے، اُکتا جائیں گے، اُوب جائیں گے، اکتاہٹ پیدا ہوجائے گی۔ اس لیے نصیحت کے معاملہ میں کوئی ایسا انداز اختیار کرنا کہ لوگ دین کی باتوں سے اُکتاہٹ محسوس کرنے لگیں؛ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ جیسے: اگر بریانی بھی روزانہ کھاتے رہیں گے تو کیا ہوگا؟ دو دن کے بعد طبیعت کہے گی کہ بس کرو، اب تو کچھ دال آجائے تو اچھا ہے۔

معلوم ہوا کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، لیکن ہر ایک چیز کے لیے موقع ومحل ہوتا ہے۔ شریعت نے دین کی باتیں لوگوں تک پہنچانے اور وعظ ونصیحت اور تقریر کرنے کے معاملہ بھی یہی تاکید کی ہے کہ اس میں بھی آپ اتنا مبالغہ سے کام نہ لیں، اس کی اتنی کثرت نہ کریں کہ پھر لوگ آپ کو دیکھ کر ہی چھپنے لگیں۔ بعض لوگوں کا ایسا مزاج ہوتا ہے تو پھر لوگ ان سے بھاگتے ہیں۔ اگر ان کو معلوم ہوجاتا ہے کہ آج فلاں مسجد میں فلاں صاحب گئے ہیں تو اس دن مسجد بدل ڈالیں گے، اس مسجد میں نماز پڑھنے جائیں گے ہی نہیں، ایسا اس لیے ہوا کہ اس نصیحت پر عمل نہیں کیا گیا، اس لیے اس بات کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ادْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستہ کی طرف لوگوں کو دانائی وحکمت کے ساتھ، بھلے طریقہ سے نصیحت کر کے اور سمجھا کر دعوت دیجیے۔ بھلے طریقہ سے جو نصیحت کی جاتی ہے اس کی بہت سی شکلیں ہیں، ان میں سے ایک شکل یہ بھی ہے کہ نصیحت کرنے کے معاملہ میں مبالغہ سے کام نہ لیا جائے، موقعہ بموقعہ، ہفتہ میں ایک یا دو مرتبہ ہو؛ بس۔ اس سے زیادہ نہیں، اور روزانہ تو بالکل بھی نہیں۔

حکمتِ تربیت یہی ہے

۶۹۹:- وعن أَبي وائلٍ شقيقِ بن سَلَمَةَ، قَالَ: كَانَ ابنُ مَسْعُودٍ - رضی اللہ عنہ - يُذَكِّرُنَا في كُلِّ خَمِيسٍ، فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحمانِ! لَوَدِدْتُ أَنَّكَ ذَكَّرْتَنَا كُلَّ يَوْمٍ، فَقَالَ: أَمَا إِنَّهُ يَمْنَعُنِي مِنْ ذَلِكَ أَنِّي أَكْرَهُ أَنْ أُمِلَّكُمْ، وَإِنِّي أَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم يَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا. (متفقٌ عَلَيهِ)

((يَتَخَوَّلُنَا)): يَتَعَهَّدُنَا.

ترجمہ:- حضرت ابو وائل شقیق بن سلمہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جو بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، صحابہ میں ان کا علمی مقام بہت اونچا تھا) ہر جمعرات کو ہمیں نصیحت کرتے تھے۔ ایک آدمی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے درخواست کی کہ: اے ابو عبد الرحمن! ہماری دلی خواہش اور تمنا یہ ہے کہ آپ روزانہ وعظ کہیں (معلوم ہوا کہ ایسا کہنے والے بھی ہوتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک دو کے کہنے کی وجہ سے آپ یہ وطیرہ اختیار کر لیں) تو اس پر حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: یہ بات اس چیز سے مجھے باز رکھتی ہے کہ میں تمہیں اُکتاہٹ میں ڈال دوں (یعنی میں روزانہ

نصیحت کرسکتا ہوں، لیکن اگر میں ایسا کروں گا تو میرا یہ عمل اور میرا یہ طریقہ وطرز تم لوگوں کو اُکتاہٹ میں مبتلا کردے گا، پھر تم لوگ اُکتا جاؤ گے) اس لیے میں موقع ومحل اور وقت دیکھ کر تمہیں نصیحت کرتا ہوں (اوراس کی دلیل یہ بتلائی) جیسا کہ نبیٔ کریم ﷺ بھی موقع و محل دیکھ کر نصیحت فرماتے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں ہم لوگ اُکتاہٹ میں مبتلا نہ ہوجائیں۔

افادات:- ’’تَخَوُّل‘‘ کہتے ہیں کہ کسی کی تربیت اورنگرانی کے معاملہ میں سمجھ داری سے کام لینا۔ نصیحت وتقریراوردین کی باتیں جو کہی جاتی ہیں اس کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی دینی تربیت ہو۔

حضورِ اکرم ﷺ سے بڑھ کر اچھی نصیحت کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے؟ اور صحابہ سے بڑھ کر محبت اور توجہ سے سننے والے اور کون ہوسکتے تھے؟ اس کے باوجود حضور ﷺ روزانہ نصیحت اس لیے نہیں فرماتے تھے کہ کہیں یہ لوگ اُکتا نہ جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی تربیت کا ایک طریقہ ہے، اس چیز کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔ تربیت اور حکمتِ تربیت کے خلاف ہے کہ آدمی اس چیز کا اہتمام نہ کرے۔ اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی تربیت اور تعلیم مقصود ہوتی ہے جب وہ اکتاہٹ محسوس کرنے لگتے ہیں، پھر یا تو وہ اس کو چھوڑ جاتے ہیں، یا ساتھ رہتے ہیں تب بھی اس کی باتوں کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔

فقاہت کی علامت

۷۰۰:- وعن أبي اليقظان عمار بن ياسر رضی اللہ عنہما قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله ﷺ يقول: إِنَّ طُولَ صَلاَةِ الرَّجُلِ، وَقِصَرَ خُطْبَتِهِ، مَئِنَّةٌ مِنْ فِقْهِهِ، فَأَطِيلُوا الصَّلاَةَ وَأَقْصِرُوا الْخُطْبَةَ.

((مَئِنَّةٌ)) أيْ: عَلاَمَةٌ دَالَّةٌ عَلَى فِقْهِهِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ: آدمی کی نماز کا لمبا ہونا اور خطبہ کا مختصر ہونا اس کی فقاہت اور سمجھ داری کی علامت اور نشانی ہے؛ اس لیے تم نماز کو لمبا کرو اور خطبہ کو مختصر کرو۔

افادات:- جیسے جمعہ کے دن نماز لمبی ہو اور خطبہ نماز کے مقابلہ میں مختصر اور (Short) ہونا چاہیے۔ آج کل معاملہ بالکل اُلٹ گیا ہے، خطبے لمبے لمبے ہوتے ہیں اور نمازیں مختصر ہوتی ہیں، حالاں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ نماز کا لمبا ہونا اور خطبہ کا مختصر ہونا آدمی کی سمجھ داری کی علامت ہے۔

وعظِ مختصر، مگر پُراثر

۱۰۷:-وعن مُعاوِيَةَ بن الحكم السُّلَمي رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: بَيْنَا أنَا أُصَلِّي مَعَ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم إذْ عَطَسَ رَجُلٌ مِنَ القَوْمِ، فَقُلْتُ: يَرْحَمُكَ اللهُ، فَرَمَانِي القَوْمُ بِأبْصَارِهِمْ. فَقُلْتُ: وَاثُكْلَ أُمِّيَاهُ، مَا شَأنُكُمْ تَنْظُرُونَ إلَيَّ؟ فَجَعَلُوا يَضْرِبُونَ بأيديهم عَلَى أفْخَاذِهِمْ فَلَمَّا رَأيْتُهُمْ يُصَمِّتُونَنِي لكِنِّي سَكَتُّ، فَلَمَّا صَلّى رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فَبِأبِي هُوَ وَأُمِّي، مَا رَأيْتُ مُعَلِّماً قَبْلَهُ وَلاَ بَعْدَهُ أحْسَنَ تَعْلِيماً مِنْهُ، فَوَاللهِ مَا كَهَرَنِي، وَلاَ ضَرَبَنِي، وَلاَ شَتَمَنِي. قَالَ: إنَّ هذِهِ الصَّلاَةَ لاَ يَصْلُحُ فِيهَا شَيءٌ مِنْ كَلاَمِ النَّاسِ، إنَّمَا هِيَ التَّسْبِيحُ وَالتَّكْبِيرُ وَقِرَاءةُ القُرْآنِ، أَوْ كَمَا قَالَ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم. قلتُ: يَا رسول الله! إنِّي حَدِيثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ، وَقَدْ جَاءَ اللهُ بِالإسْلاَمِ، وَإنَّ مِنّا رِجَالاً يَأتُونَ الكُهّانَ قَالَ: فَلاَ تَأتِهِمْ. قُلْتُ: وَمِنّا رِجَالٌ يَتَطَيَّرُونَ؟ قَالَ: ذَاكَ شَيءٌ يَجِدُونَهُ فِي صُدُورِهِمْ فَلاَ يَصُدَّنَّهُمْ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت معاویہ بن حکم سُلَمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھ رہا تھا (یہ نئے نئے اسلام لائے تھے) نماز کے دوران ہی ایک آدمی کو چھینک آئی (چھینکنے والے نے الحمدللہ نہیں کہا تھا، لیکن ان کو یہ معلوم تھا کہ چھینک کھانے والے کو جواب میں یرحمک اللہ کہنا چاہیے) تو میں نے نماز ہی میں یرحمک اللہ کہہ دیا (دراصل ان کو یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ نماز میں بولنے کی ممانعت ہے، اور صحابہ نماز میں ہونے کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے، اس لیے) لوگ میری طرف گھورنے لگے، تو میں بول پڑا کہ میری ماں مجھے روئے، تم لوگ مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟ جب میں یہ بولا تو لوگ اپنی رانوں پر اپنے ہاتھ مارنے لگے۔ یعنی اس طرح وہ ان کو یہ بتلانا چاہتے تھے کہ بھائی! تم خاموش رہو۔ تو مَیں سمجھ گیا کہ یہ مجھے چپ کرانا چاہتے ہیں ("لٰکِنِّیْ سَکَتُّ" شرّاح فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ) مجھے جوش تو بہت آیا کہ ان کو کچھ کہوں لیکن پھر بھی مَیں خاموش رہا اور کچھ بولا نہیں (یہ پورا قصہ تو نماز کے دوران پیش آیا تھا اور جماعت سے نماز ہو رہی تھی۔ آگے جو بات آ رہی ہے اسی کی تعلیم دینا چاہتے ہیں) حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے، میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، مَیں نے کسی سکھانے والے کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اچھا سکھانے والا آپ سے پہلے یا آپ کے بعد نہیں دیکھا۔ اللہ کی قسم! حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ مجھے ڈانٹا، نہ مجھے مارا، نہ مجھے لتاڑا، بلکہ اپنے قریب بلا کر فرمایا: بھائی! یہ تو نماز ہے، اور نماز کے باہر جس طرح باتیں کرتے ہیں، نماز کی حالت میں ایسی باتیں کرنے کی گنجائش نہیں ہے (بلکہ نماز میں خاموش رہنا چاہیے) نماز میں تو سبحان اللہ، اللہ اکبر کہا جاتا ہے، قرآنِ پاک کی تلاوت کی جاتی ہے (نماز میں ایسی باتیں نہیں ہوتی جو تم نے کیں۔ انہوں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصیحت کرنے کا جو انداز دیکھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو جس محبت سے سمجھایا، اس سے ان کا حوصلہ بڑھا، اور انہوں نے

موقع غنیمت سمجھ کر ایک بات پوچھ لی کہ حضور اکرم ﷺ کی توجہ میری طرف منعطف ہے تو چلو! ایک بات پوچھ لوں) انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم تو اسلام سے دور تھے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام عطا فرمایا، ہمارے یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کاہنوں کے پاس جاتے ہیں۔ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: تم ان کے پاس مت جائیو (اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اس پر انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ کیوں نہ جاؤں، بلکہ بس حضور ﷺ نے فرما دیا تو اب بات خلاص ہوگئی) پھر پوچھا: ہم میں بعض لوگ وہ ہیں جو بدشگونی لیتے ہیں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: وہ ایک کھٹکا سا ہے جو اس کی وجہ دل میں پیدا ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی اس کی وجہ سے اس کام کو چھوڑ نہ دے (بلکہ اپنا کام پورا کر ڈالے)

افادات:- ''نماز میں ایسی باتیں نہیں ہوتی جو تم نے کیں'' نصیحت کے طور پر آپ ﷺ نے بس اتنی ہی بات ارشاد فرمائی۔ کہنے کی بات اتنی ہی تھی، وہ کہہ دی، دوسرا کوئی ردِّ عمل آپ ﷺ نے نہیں کیا۔ اگر ہم اور آپ ہوتے تو پہلے زیادہ وقت تو مار پٹائی میں لیتے، اور کام کی جو چیز ہے اس میں تو ایک منٹ لگاتے۔ لیکن حضور ﷺ اپنے عمل سے اس بات کی تعلیم دے رہے ہیں کہ جو اصل چیز ہے اس کی طرف دھیان دو، دوسری چیزیں چھوڑو۔ جب کوئی آدمی ایسا کرے گا تو اس کا اثر سامنے والے پر زیادہ اچھا پڑے گا، ہم یوں سمجھتے ہیں کہ مار پٹائی میں زیادہ اثر پڑے گا۔ ہاں! اگر پہلے سے بتا دیا ہے اور وہ آدمی ان باتوں سے واقف ہے، اس کے باوجود وہ قصداً ایسا کرتا ہے، تو وہ الگ بات ہے۔

کاہن نہیں تو عامل

کاہن وہ لوگ ہوتے ہیں جو آئندہ پیش آنے والے معاملات کے متعلق خبر

دینے کا دعویٰ کرتے ہیں، جن کو ''جوتشی'' کہا جاتا ہے۔ آج کل بھی بہت سے لوگوں کا مزاج ایسا بن گیا ہے۔ جو مسلمان ہیں وہ جوتشیوں کے پاس تو کم ہی جاتے ہوں گے، لیکن عاملوں کے پاس جاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ آئندہ کا کیا معاملہ ہے؟ اس کے بارے میں دیکھ کر کچھ بتاؤ، حالاں کہ وہ غیب تھوڑا ہی جانتا ہے۔ یہ مزاج دھیرے دھیرے اسی طرف ڈھلتا جا رہا ہے، اس لیے ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

غلط عقیدہ

بدشگونی کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کو کرنے سے پہلے کسی چیز کو دیکھ کر اس کام سے رک جانا۔ زمانۂ جاہلیت میں کسی آدمی کو سفر درپیش ہوتا، یا کسی کام کے لیے گھر سے باہر نکلتا؛ تو دیکھتا کہ کوئی پرندہ بیٹھا ہوا ہے یا نہیں، اگر کوئی پرندہ بیٹھا ہوا ملتا، وہ اس کی طرف کنکر پھینکتا، اگر وہ پرندہ اُڑ کر دائیں طرف جاتا تو سمجھتا کہ اس کام میں کامیابی ہوگی، اور اگر وہ بائیں طرف جاتا تو سمجھتا کہ ناکامی ہوگی اور واپس ہو جاتا تھا۔

آج کل ہمارے سماج میں بھی بہت سے لوگ ایسا سمجھتے ہیں، جیسے: باہر نکلے اور بلّی سامنے سے گزر گئی، تو کہتے ہیں کہ سارا معاملہ خراب ہو گیا، اور پھر جس کام کے ارادہ سے گھر سے نکلے تھے اس کو چھوڑ کر واپس آجاتے ہیں کہ بلّی راستہ کاٹ گئی، اب معاملہ مشکل ہے، اس کام میں کامیابی نہیں ہوگی۔ اچھا بھائی! بلّی کا سامنے سے گزرنا اتنا زیادہ مؤثر ہے کہ اس نے آپ کے کام پر ہی اثر ڈال دیا؟ یہی بدشگونی ہے، اسلام ایسا عقیدہ رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اگر ایسا کھٹکا پیدا ہو گیا

اور ایک بات یہ بھی یاد رہے کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی واپس تو نہیں

ہوتا، لیکن دل میں کھٹکا سارہ جاتا ہے۔ ویسے ایک آدمی شریعت کے مسئلہ کو جانتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، لیکن پھر بھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پرانا مزاج ہونے کی وجہ سے دل میں وسوسہ سا پیدا ہوجاتا ہے کہ اب کیا ہوگا۔ یعنی اپنا ارادہ ترک نہیں کرتا اور اس کام کو چھوڑ بھی نہیں دیتا، گھر واپس بھی نہیں ہوجاتا، بلکہ اپنے کام کے لیے آگے تو بڑھتا ہے، لیکن دل میں ایک کھٹکا سارہتا ہے، تو اس کے لیے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر ایسا کھٹکا پیدا ہوگیا ہو تب بھی اپنا کام کرڈالے، اس کام چھوڑ نہ دے۔ بس! اس طرح اس نے شریعت کے حکم پر عمل کرلیا، اب اس کے بعد بھی وہ کام نہ ہو تو یہ نہ سمجھے کہ اس کی وجہ سے نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں تھا اس وجہ سے وہ کام نہیں ہوا۔

بہرحال! یہاں تو یہ روایت یہی بتانے کے لیے لائے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ کی تعلیم وتربیت کا طریقہ کیسا تھا۔

۷۰۲:- وعن العِرْباض بن سارِيَةَ رضی اللہ تعالیٰ عنہ **قَالَ: وَعَظَنَا رسول الله** ﷺ **مَوْعِظَةً وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوبُ، وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُونُ... وَذَكَرَ الْحَدِيثَ وَقَدْ سَبَقَ بِكَمَالِهِ فِي بَابِ الأَمْرِ بِالْمُحَافَظَةِ عَلَى السُّنَّةِ.**

افادات:- اس حدیث کو اس باب میں لاکر نبیٔ کریم ﷺ کے وعظ کا ایک نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے وعظ کی کیفیت کیا ہوا کرتی تھی۔

(یہ حدیث پہلے بھی کئی ابواب میں گزرچکی ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے: حدیث کے اصلاحی مضامین، باب الامر بالمحافظۃ علی السنۃ، حدیث نمبر: ۱۵۷، جلد: ۳/ ۲۰۸ تا ۲۱۰۔ مرتب)

باب الوقار والسکینۃ

سنجیدگی اور اطمینان کی عادت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَعِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ هَوۡنًا﴾

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ آداب کا بیان چل رہا ہے جس میں زندگی گزارنے کی تمیز اور آداب سکھائے جا رہے ہیں۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کتاب الادب کے متعلق فرماتے ہیں کہ ایک مؤمن کی زندگی کس طرح ہونی چاہیے اور زندگی کے ہر شعبہ اور ہر ہر قدم پر مؤمن کو کس طرح کا سلوک کرنا چاہیے، اسی سلیقہ اور تمیز کو ادب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سلسلہ میں مختلف ہدایتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ باب کا عنوان قائم کیا ہے: ''الوقار والسکینة'' وقار اور اطمینان کا بیان

زندگی کا اہم ادب

وقار یعنی سنجیدگی اور طبیعت کے اندر جماؤ اور ٹھہراؤ کا ہونا۔ کسی آدمی کے سامنے جب کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جو اس کی طبیعت میں بے صبری پیدا کرنے والا ہو، تو اس سے متأثر ہو کر بے صبری کا اظہار نہ کرے؛ بلکہ تحمل اور بردباری سے کام لے۔ کوئی ایسی بات پیش آئی جو آدمی کی طبیعت میں اشتعال اور غصہ و جوش دلانے والی ہے، تو اس سے متأثر ہو کر مشتعل نہ ہو، جوش و غصہ میں نہ آ جائے، بلکہ اپنے اوپر کنٹرول اور قابو رکھے۔ مجلس کے اندر اور لوگوں کے سامنے آدمی کو اپنے مزاج اور طبیعت پر قابو رکھتے ہوئے اس طرح رہنا چاہیے کہ سامنے والے کی طرف سے کی جانے والی بدسلوکی یا نامناسب برتاؤ سے متأثر ہوئے بغیر سنجیدگی اور اطمینان کا اظہار کرنا چاہیے؛ اسی کو وقار اور سکینہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آدمی کسی حال میں بھی وقار اور سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ کسی کی بھی طرف سے آپ کے ساتھ کیسا ہی معاملہ کیوں نہ کیا جائے

جس کے نتیجہ آپ کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہوسکتا ہے، طبیعت میں بے صبری آسکتی ہے، جوش اور غصہ آسکتا ہے، لیکن آپ اپنے اوپر قابو رکھتے ہوئے ان ساری چیزوں سے متأثر ہوئے بغیر وقار اور سنجیدگی کا معاملہ کریں۔

"وَقَرَ" کا معنیٰ کسی چیز کا کسی جگہ پر ٹھیر جانا اور جم جانا۔ گویا آپ کی طبیعت میں ایسا ٹھیراؤ اور جماؤ ہو کہ سامنے والا آپ کو اپنی اصل جگہ سے ہٹا نہ سکے، اشتعال دلانے والی چیز آپ کو مشتعل نہ کر سکے، جوش دلانے والی چیز آپ کو جوش میں نہ لائے؛ اسی کو "وقار" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ بھی شریعت کی ایک اہم تعلیم ہے کہ آدمی ہمیشہ وقار کا مظاہرہ کرے اور سنجیدگی سے رہے۔

ہر معاملہ میں تواضع

اس سلسلہ میں آیتِ کریمہ پیش کی ہے: ﴿وَعِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ ہَوۡنًا﴾ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فرقان میں اپنے مخصوص بندوں کی کچھ صفات بیان کی ہیں، ان میں سے ایک صفت یہ ہے کہ رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں، گویا ان کی ہر حرکت اور معاملہ سے تواضع ظاہر ہوتی ہے، ان کی چال میں بھی تواضع ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی بیماروں کی طرح بالکل آہستہ آہستہ چلے، بلکہ آدمی اپنی رفتار سے چلے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفتار میں تیزی تھی جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے: "کَأَنَّمَا الۡأَرۡضَ تُطۡوٰی لَہٗ" آپ اس طرح چلتے تھے کہ گویا زمین آپ کے لیے لپیٹی جا رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ عاجزی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیماروں کی طرح چلے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ وہ بالکل آہستہ آہستہ بیماروں کی طرح چل رہا ہے، اس سے پوچھا: کیا بات ہے؟ تم بیمار ہو؟ اس

نے کہا: نہیں۔ تو ایک کوڑا مارا اور کہا: نوجوان ہو کر اس طرح چلتے ہو؟ اس طرح مت چلو۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ آدمی کی چال میں تکبر، بڑائی اور اتراہٹ ہو، اس سے بھی شریعت نے منع کیا ہے، آدمی کی ہر ادا اور طریقہ سے تواضع ٹپکنی چاہیے، ہر معاملہ میں فروتنی ظاہر ہونی چاہیے۔

رحمٰن کے بندوں کی صفت

﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ اور جہالت کا برتاؤ کرنے والے لوگ جب ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ جواب میں کہتے ہیں: صاحب سلامت رہو۔ ''جاہلون'' سے مراد ''اَن پڑھ'' نہیں ہے، بلکہ کبھی پڑھا لکھا آدمی بھی جہالت بھرا سلوک کرتا ہے، اور کبھی بے پڑھا لکھا آدمی بھی بڑا با تمیز اور اچھا سلوک کرتا ہے۔ تو یہاں ''جاہلون'' کہہ کر ایسے لوگ مراد ہیں جو کسی کے ساتھ جیسا مناسب، انسانیت والا، مروت وشرافت والا برتاؤ کرنا چاہیے، ویسا برتاؤ نہ کریں، بلکہ نادانی اور جہالت بھرا برتاؤ کریں؛ جس کو ہم اپنی زبان میں ''اُلٹی بات کرنے والا'' کہتے ہیں۔ تو ایسا آدمی جب گفتگو کرے تو اس کے جواب میں مشتعل نہ ہو جائے، جوش اور غصہ میں نہ آجائے، بلکہ سلامتی والی ایسی بات کہے کہ سامنے والا اپنی حرکت سے اس کو جو الجھانا چاہتا ہے وہ الجھا نہ سکے۔ یہاں ﴿سَلَامًا﴾ سے مراد ''السلام علیکم'' کہنا نہیں ہے، بلکہ مفسرین نے لکھا ہے کہ اپنے آپ کو اس سے بچالے۔ سامنے والے کے سلوک کا تقاضہ تو یہ تھا کہ یہ اس سے الجھ جاتا، اور اس کے ساتھ لڑ بھڑ جاتا، لیکن وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ صبر وتحمل اور بردباری سے کام لیتا ہے، اور وقار وسنجیدگی سے پیش آتا ہے۔

اس آیت کے دوسرے جزو ﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَاماً﴾ کا

تعلق وقار اور سنجیدگی سے ہے، اس لیے کہ ظاہر ہے کوئی آدمی کسی کے ساتھ جب جہالت بھرا سلوک کرتا ہے تو طبیعت میں جوش پیدا ہوتا ہے، بے چینی اور بے صبری ہوتی ہے، آدمی کی طبیعت چاہتی ہے کہ سامنے والا ہمارے ساتھ جو معاملہ کر رہا ہے تو اس کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے، لیکن ایسے ہی وقت پر وہ اپنے اوپر قابو رکھتا ہے، او ضبطِ نفس سے کام لیتا ہے، اور سامنے والے کے جہالت بھرے سلوک کے جواب میں یہ جہالت والا معاملہ نہیں کرتا، بلکہ ایسی حرکتوں سے اپنے آپ کو بچا لے جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے مقبول و مخصوص بندوں کی جو صفات و خوبیاں ہیں ان میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے؛ اسی کو ''وقار'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

وقار کا ایک پہلو یہ بھی ہے

۷۰۳:-وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: مَا رَأَيْتُ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مُسْتَجْمِعاً قَطُّ ضَاحِكاً حَتَّى تُرَى مِنهُ لَهَوَاتُهُ، إِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((اللَّهَوَاتُ)) جَمْعُ لَهَاةٍ: وَهِيَ اللَّحْمَةُ الَّتي في أَقْصى سَقْفِ الْفَمِ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کبھی کِھل کِھلا کر اور خوب جم کر اس طرح ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ آپ کے منھ کے اندر کا کوّا نظر آتا ہو، اگر کبھی کوئی بات ہنسی کی ہوا کرتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف مسکراتے تھے۔

افادات:- یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقار کی بات تھی۔ یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ وقار کے ایک دوسرے پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ حلق کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا لٹکا ہوا ہوتا ہے، جب آدمی کِھل کِھلا کر زور سے ہنستا ہے، تو سامنے والے کو وہ نظر آتا ہے؛ اسی کو ہم اپنی زبان میں کوّا کہتے ہیں۔ مسکرانے کا مطلب یہ ہے کہ صرف ہونٹ کھلیں،

آواز بھی پیدا نہ ہو، اور آدمی کے دندان نظر آئیں، جس کو تبسم کہتے ہیں۔ بہت سی مرتبہ ہنسانے والے ہنساتے ہیں، مگر یہ اپنے آپ پر ایسا ضبط اور کنٹرول رکھتا ہے، اور اس کا ایسا اثر نہیں لیتا کہ بے قابو ہو جائے، لوٹ پوٹ ہو جائے، اور خوب زور زور سے ہنسنے لگے، اس لیے کہ یہ طریقہ بھی وقار کے خلاف ہے۔

وقار کا ایک پہلو وہ بھی بتایا تھا کہ غصہ دلانے والا جہالت بھری بات کرتا ہے تو اس کے جواب میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرتا، بلکہ اپنے آپ کو بچا لیتا ہے۔ اور وقار کا ایک پہلو یہ بھی بتایا کہ ہنسانے والا ہنسانے کی بات کرتا ہے، یا کوئی ایسی بات پیش آ گئی جس سے آدمی ہنسنے میں بے قابو ہو جائے، تب بھی یہ اپنے آپ کو بے قابو ہونے سے بچاتا ہے۔ وقار کا ایک طریقہ اور انداز یہ بھی ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ وقار کے اندر دونوں چیزیں ملحوظ رکھنی چاہئیں، جوش و غصہ والی بات سے اتنا زیادہ غصہ بھی نہ ہو جائے، اور ہنسانے والی بات پر اتنا بے قابو ہو کر ہنسنا بھی شروع نہ کر دے، بلکہ اپنے آپ پر ضبط اور کنٹرول رکھے، اسی کا نام وقار اور سنجیدگی ہے، اور شریعت نے اس کی تعلیم دی ہے۔

الندب الیٰ اتیان الصلاۃ والعلم ونحوھما من العبادات بالسکینۃ والوقار

نماز اور علمی مجالس میں سکون ووقار سے آنا

وقار کو چھوڑنے کی اجازت نہیں

نماز، علم کی مجلس، یا عبادات کے قبیل کی کوئی چیز؛ جس میں آدمی حاضری دیا کرتا ہے، وہاں بھی آدمی ایسی عجلت نہ دکھائے کہ طبیعت بے قابو ہوجائے، بلکہ ایسی جگہوں پر بھی وقار، اطمینان وسکون کے ساتھ پہنچے۔ شریعت کسی بھی حال میں وقار کو چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتی۔

تقویٰ کی علامت

اس سلسلہ میں ایک آیت پیش کی ہے: ﴿وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ جو آدمی اللہ تعالیٰ کے دین کی نشانیوں کا ادب کرتا ہے؛ یہ اس کے دل کے اندر اللہ تعالیٰ کے خوف اور ڈر کی علامت ہے۔ ''شعائر'' یعنی کسی بھی مذہب اور دین کی علامتیں اور نشانیاں جن کو دیکھ کر وہ مذہب والے پہچانے جاتے ہیں، جیسے: نماز اسلام کے شعائر میں سے ہے، اس لیے اس کے ادب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور اس کے ادب میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی اتنی جلد بازی اور عجلت نہ کرے کہ بھاگنے دوڑنے کی نوبت آئے، بلکہ اطمینان وسکون کے ساتھ نماز کے لیے مسجد میں آئے۔ دوسری کسی بھی علمی و

دینی مجالس میں حاضری دیتے وقت اطمینان وسکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

گویا وقار اور سنجیدگی کی جو تعلیم ہمیں دی گئی ہے اس کا لحاظ یہاں تک کیا گیا کہ عبادات کی حاضری کے موقع پر بھی اس کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چوں کہ عبادات وہ طریقے ہیں جن سے آدمی اللہ تعالیٰ کو راضی کرتا ہے، تو ان کے بارے میں کسی کو یہ خیال ہوسکتا تھا کہ جلد بازی اور عجلت سے کام لینا شاید مطلوب وپسندیدہ ہو۔ تو یہ روایت لاکر یہ بتلارہے ہیں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ وقار اور سنجیدگی کے متعلق شریعت کی جو تعلیم ہے اس کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے، اس کا لحاظ تو وہاں بھی ہونا چاہیے۔

دوڑنا؛ وقار اور سنجیدگی کے خلاف ہے

۷۰۴:-وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يقول: إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلاَةُ، فَلاَ تَأْتُوهَا وَأَنْتُمْ تَسْعَوْنَ، وَأْتُوهَا وَأَنْتُمْ تَمْشُونَ، وَعَلَيْكُمُ السَّكِينَةُ، فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا، وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

زادمسلِمٌ فی روايةٍ لَهُ: فَإِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا كَانَ يَعْمِدُ إِلَى الصَّلاَةِ فَهُوَ فِي صَلاَةٍ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: جب نماز کے لیے اقامت کہہ دی جائے، یا نماز شروع ہوچکی ہو؛ تو اس میں شریک ہونے کے لیے دوڑتے ہوئے نہ آؤ، بلکہ چلتے ہوئے اور سکون کے ساتھ آؤ۔ اب امام کے ساتھ نماز کا جتنا حصہ مل گیا وہ امام کے ساتھ پڑھ لو، اور جتنا چھوٹ گیا اس کو بعد میں پورا کرلو۔

مسلم شریف کی روایت میں یہ ہے کہ: تم میں کوئی آدمی جب نماز کے ارادہ سے چلتا ہے تو وہ نماز ہی کے حکم میں ہے۔

افادات:- مثلاً: مسجد میں آئے اور دیکھا کہ جماعت شروع ہوچکی ہے

اور امام صاحب رکوع میں ہیں، تو بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ رکعت پانے کے لیے دوڑتے ہیں۔ اس روایت میں یہی فرمایا کہ دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ عام رفتار سے آؤ، اگر اس میں معمولی تیزی ہو تو کوئی حرج کی بات بھی نہیں ہے، لیکن جس رفتار کو دوڑنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی اجازت نہیں ہے۔ دوڑنا؛ وقار اور سنجیدگی کے خلاف ہے، اس لیے کہا گیا کہ دوڑ کر نہ آؤ بلکہ چل کر آؤ۔ یعنی نماز میں شریک ہونے کے لیے اپنی عام چال میں کوئی فرق آنا نہیں چاہیے، وقار و سنجیدگی والی چال کے ساتھ ہی نماز میں شریک ہونا بھی نماز کے آداب میں سے ایک ادب ہے۔

حاصل شدہ کے لیے بھاگنا لا حاصل

اب یہ سوال کہ سکون کے ساتھ آنے کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ کوئی رکعت چھوٹ جائے؟ تو کہا گیا کہ آپ تو اطمینان ہی سے آئیے، امام کے ساتھ نماز کا جتنا حصہ مل جائے وہ امام کے ساتھ پڑھ لیجیے، اور جتنا چھوٹ جائے اس کو بعد میں پورا کر لیجیے۔ مسلم شریف کی روایت میں جو زیادتی ہے اس کے ذریعہ ایک اشکال کا جواب دیا ہے کہ آدمی دوڑتا اس لیے ہے کہ میں جلدی سے نماز میں شریک ہو کر نماز کا ثواب حاصل کرلوں، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ: کوئی آدمی جب نماز کے ارادے سے چلتا ہے تو وہ نماز ہی کے حکم میں ہے۔ گویا آپ گھر سے چلے تو آپ کا میٹر چالو ہو گیا، اب فکر کا ہے کی ہے۔ آپ اسی لیے دوڑتے تھے کہ نماز کا ثواب لینا ہے، تو نماز کے ارادہ سے چلنے سے ہی نماز کے ثواب کا میٹر شروع ہو چکا ہے، اب آپ اطمینان رکھئے، اور اپنی پُر وقار چال سے چلتے ہوئے نماز میں شریک ہوئیے، بھاگنے دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے دوڑنے کا مقصد ثواب کو حاصل کرنا تھا، وہ تو نماز کے ارادہ سے چلنے سے ہی

حاصل ہو چکا ہے۔

جلد بازی نیکی نہیں ہے

۷۰۵:-وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما: أَنَّهُ دَفَعَ مَعَ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَوْمَ عَرَفَةَ فَسَمِعَ النبيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَرَاءَهُ زَجْراً شَدِيداً وَضَرْباً وَصَوْتاً لِلإِبِلِ، فَأَشَارَ بِسَوْطِهِ إِلَيْهِمْ، وقال: يَاأَيُّهَا النَّاسُ! عَلَيْكُمْ بالسَّكِينَةِ، فَإِنَّ الْبِرَّ لَيْسَ بالإِيضَاعِ.

((الْبِرُّ)): الطَّاعَةُ. وَ((الإِيضَاعُ)): الإِسْرَاعُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرفات کے دن (غروبِ آفتاب کے بعد میدانِ عرفات سے مزدلفہ کی طرف) روانہ ہوئے۔ جب آپ روانہ ہوئے تو جو لوگ حج میں شریک تھے وہ سب بھی آپ کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو آگے تشریف لے جا رہے تھے تو آپ نے اپنے پیچھے سے محسوس کیا اور سنا کہ لوگ اپنے جانوروں کو (تیز چلانے کے لیے) خوب جھڑک رہے ہیں اور ان کی پٹائی کر رہے ہیں اور اونٹوں کو آواز دے رہے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے کوڑے کے ذریعہ سے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! سکون اور اطمینان کو لازم پکڑو، اپنے جانوروں کو جھڑک کر اور ان کی پٹائی کر کے جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ جانوروں کو تیز دوڑانا کوئی عبادت اور نیکی نہیں ہے۔

باب إكرام الضيف

مہمان کا اعزاز واکرام کرنا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عمل

مہمان نوازی بھی آداب میں سے ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿هَلۡ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيۡفِ إِبۡرَاهِيمَ الۡمُكۡرَمِينَ﴾ کیا آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باعزت مہمانوں کا قصہ پہنچا؟ جب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے حضرت کو سلام کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی سلام کیا (اور دل میں سوچا) نئے لوگ معلوم ہوتے ہیں، جانے پہچانے لوگ نہیں ہیں، شناسا نہیں ہیں۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام دھیرے سے اپنے گھر والوں کے پاس سرک گئے، اور تازہ بھنا ہوا بچھڑا لے کر آئے، اپنے مہمانوں کے سامنے پیش کیا اور فرمانے لگے: ﴿أَلَا تَأۡكُلُونَ﴾ کھاتے نہیں؟ یہ آیتِ کریمہ لاکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مہمان نوازی والا عمل بتلایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس ان کے یہاں پیدا ہونے والے بچے کی بشارت دینے کے لیے تین فرشتے حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل اور حضرت اسرافیل علیہم السلام کو انسانی شکلوں میں بھیجا تھا۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ علیہا السلام بھی بوڑھی ہوچکی تھیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام خود بھی بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کو ان دونوں کو بیٹا دینا منظور تھا جس کی بشارت دینے کے لیے ان تین فرشتوں کو بھیجا اور یہ تینوں انسانی شکل میں ان کے گھر مہمان بن کر پہنچے، حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو پہچان نہیں پائے، بلکہ سمجھے کہ کوئی انسان ہیں جو ہمارے یہاں مہمان آئے ہیں۔ اس لیے کہ آنے والے دونوں قسم کے ہوتے ہیں، بعض ایسے ہوتے ہیں جن سے پہلے سے شناسائی اور جان پہچان ہوتی ہے، اور

بعضوں سے پہلے سے جان پہچان نہیں ہوتی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دل میں سوچا کہ آنے والے نئے معلوم ہوتے ہیں۔

تب مجوسی ایمان لے آیا

ویسے بھی مہمان نوازی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جاری فرمودہ سنت ہے، آپ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب کھانے بیٹھتے تھے تو جب تک کوئی مہمان نہیں ہوتا تھا وہاں تک کھانا حلق سے نہیں اترتا تھا، اگر کوئی مہمان نہیں ہوتا تھا تو مہمان تلاش کرنے کے لیے باہر نکلتے تھے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اسرائیلیات سے ایک قصہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ کوئی مہمان نہیں تھا تو اس کی جستجو اور تلاش میں نکلے، ایک مجوسی نظر آیا، اس کو ساتھ لے آئے، کھانے کے لیے ساتھ بٹھایا اور اس سے کہا: بسم اللہ کہو اور کھانا شروع کرو۔ اس نے کہا: کون اللہ؟ میں نہیں جانتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو اُٹھا کر روانہ کر دیا۔ جب وہ باہر نکلا تو اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ: اے ابراہیم! ہم تو اس کو زندگی بھر کھلاتے رہے، اور تم سے ایک مرتبہ بھی کھلایا نہ گیا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام فوراً دوڑے اور اس کو سمجھا بجھا کر ساتھ لے آئے کہ میرے ساتھ ہی کھانا کھاؤ۔ اس نے کہا: جب تک مجھے یہ نہیں بتلاؤ گے کہ مجھے نکالا کیوں تھا، پھر دوبارہ بلا کر کیوں لائے؛ وہاں تک میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتلایا: تو نے اس اللہ کا نام نہیں لیا جس نے ہمیں پیدا کیا اور روزی دی، اس کے بہت سارے انعامات واحسانات ہیں، اسی کی نعمتیں ہم استعمال کرتے ہیں، تجھے اس کا نام لینا چاہیے، لیکن میں نے جب بسم اللہ پڑھنے کو کہا تو تو نے یہ جواب دیا کہ کون اللہ؟ میں نہیں جانتا، اس پر مجھے غصہ آیا اور میں

نے تجھے روانہ کر دیا، لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی بھیجی کہ میں تو اس کو ابتدائے زندگی سے آج تک کھلا رہا ہوں، تو میں تجھے بلا کر لے آیا؛ اب کھانا شروع کر۔ یہ سن کر وہ آدمی ایمان لے آیا۔

آیت سے مستفاد احکام

یہاں یہ آیت لا کر بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھئے! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے یہاں آنے والے ان مہمانوں کی میزبانی کا اتنا زیادہ اہتمام کیا کہ وہ آ کر بیٹھے تو آہستہ سے ان کے پاس سے سرک گئے، اور بھونا ہوا تازہ بچھڑا لا کر ان کے سامنے پیش کیا۔

"فَرَاغَ" کا مطلب ہے: آدمی کا آہستہ سے سرک جانا، اس طرح اُٹھنا کہ پاس والوں کو پتہ بھی نہ چلے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب مہمان آئے تو فوری طور پر جو کچھ موجود ہو، اسی سے اس کا اکرام کرنا چاہیے، تکلّف میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعد میں مزید جو اہتمام ہو سکتا ہو وہ کر لے۔

''انہوں نے مہمانوں کے سامنے لا کر کھانا پیش کیا'' اس سے بعض حضرات یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ مہمانوں کو مکلّف نہیں کرنا چاہیے کہ آپ چلئے، بلکہ وہ جہاں بیٹھے ہوں وہیں کھانا لا کر پیش کیا جائے۔

چوں کہ وہ فرشتے تھے اس لیے انہوں نے کھانے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھائے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو متوجہ کیا کہ کھاؤ، کیوں نہیں کھاتے؟ ان کے نہ کھانے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذرا خوف بھی محسوس کیا، اس لیے کہ اُس زمانہ کا رواج یہی تھا کہ کوئی کسی کے یہاں کسی بُرے ارادہ سے جاتا تو اس کے یہاں کا کھانا نہیں کھاتا تھا (آج کل تو اسی کا کھا کر اسی کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ خیر!) انہوں

نے کہا کہ: ہم تو فرشتے ہیں، ہم کھاتے پیتے نہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام کا مہمانوں کا اکرام

دوسری آیت پیش کی: ﴿وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ إِلَيْهِ﴾ یہی فرشتے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بیٹے کی بشارت دینے کے لیے آئے تھے، یہاں سے فارغ ہونے کے بعد حضرت لوط علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے پاس پہنچے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین میں قیام پذیر تھے، وہاں سے چند میل کے فاصلے پر حضرت لوط علیہ السلام کی آبادی تھی، فرشتے انسانی شکل میں بے ریش اور خوبصورت تھے، اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم لواطت کی برائی میں مبتلا تھی، ان خوبصورت شکل والے لڑکوں کو دیکھ کر وہ لوگ اپنے جذبات لے کر دوڑے ہوئے آئے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے ان لوگوں سے کہا کہ: تمہارے گھروں میں جو تمہاری بیویاں ہیں وہ میری بیٹیوں کا درجہ رکھتی ہیں، وہ تمہارے لیے پاکیزہ اور حلال ہیں، ان سے اپنی ضرورت پوری کرو۔ یہ میرے مہمان ہیں، ان کے معاملہ میں تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی سمجھ دار آدمی نہیں ہے؟ دیکھئے! حضرت لوط علیہ السلام نے اپنے مہمانوں کے اکرام کے معاملہ میں اتنا زیادہ اہتمام فرمایا اور قوم کی طرف سے کی جانے والی ناروا حرکت سے بچانے کی پوری کوشش کی، اس لیے اس آیت کو یہاں لائے ہیں۔

مہمان نوازی؛ ایمان کا تقاضہ

۷۰۶:- وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وآله وسلم قَالَ: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ. وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ. وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْراً أَوْلِيَصْمُتْ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔ اور جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے (اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے) اور جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے (یعنی اگر کچھ بولنا ہی ہو تو زبان سے بھلی بات بولے، ورنہ خاموشی اختیار کرے۔)

افادات:- مہمان نوازی ان صفات میں سے ہے جس کا اہتمام زمانۂ جاہلیت میں بھی کیا جاتا تھا، اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے آپ جن کاموں کا خاص طور پر اہتمام فرماتے تھے؛ ان میں سے ایک کام یہ بھی تھا چناں چہ حدیثِ پاک میں ہے کہ جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر غارِ حراء میں سب سے پہلی وحی نازل ہوئی، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ سے تین مرتبہ کہا کہ پڑھیے، آپ نے کہا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دبوچا، اس کے بعد پھر آپ سے کہا تو آپ نے پڑھا، جب وہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر پر واپس آئے تو چوں کہ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ فرشتہ سے ملاقات ہوئی تھی، اس سے آپ کو اپنی جان کا اندیشہ لاحق ہوا، تو آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہا: "اِنِّيْ خَشِيْتُ عَلٰی نَفْسِيْ" مجھے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے تسلی کے لیے جو باتیں ارشاد فرمائیں، ان میں یہ فرمایا تھا: "كَلَّا! وَاللّٰهِ لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ أَبَدًا" ہرگز نہیں! آپ کو اپنی جان کے متعلق فکر رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کریں گے "اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ. وَتَحْمِلُ الْكَلَّ. وَتَقْرِي الضَّيْفَ" آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، ناتوانوں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں (بخاری شریف) اس سے پتہ چلا

کہ مہمان نوازی ان خوبیوں میں سے ہے جن کا قدیم زمانہ سے اہتمام چلا آرہا ہے، خود نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس کی تاکید اور تعلیم فرمائی ہے۔ گویا ایمان کی علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اپنے مہمان کا اکرام کرے۔

آج کل تو لوگ ایسی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے کہ اب تو یہ سب کام بھی بوجھ پڑتے ہیں، جب سے ٹی وی کی مصیبت آگئی ہے تو مہمان کے آنے پر ناگواری کا اظہار کیا جاتا ہے، اگر آدمی ٹی وی دیکھنے بیٹھا ہو اور مہمان آجائے تو اُٹھ کر اس کی طرف توجہ کرنے کی بھی زحمت نہیں کرتا۔

مہمان اور میزبان کے لیے ہدایات

۷۰۷: وعن أَبی شُرَیح خُوَیْلِدِ بن عَمرو الخُزَاعِیِّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول: مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالیَوْمِ الآخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہُ جَائِزَتَہُ. قالوا: وَمَا جَائِزَتُہُ یَا رسول اللہ؟ قَالَ: یَوْمُہُ وَلَیْلَتُہُ، وَالضِّیَافَۃُ ثَلاَثَۃُ أَیَّامٍ، فَمَا کَانَ وَرَاءَ ذٰلِکَ فَھُوَ صَدَقَۃٌ عَلَیْہِ. (متفقٌ عَلَیْہِ)

وفی روایۃ لِمسلمٍ: لاَ یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ یُقِیمَ عِنْدَ أَخِیہِ حَتّٰی یُؤْثِمَہُ. قالوا: یَا رسول اللہ! وَ کَیْفَ یُؤْثِمُہُ؟ قَالَ: یُقِیمُ عِنْدَہُ، وَلاَ شَيْءَ لَہُ یُقْرِیہِ بِہِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوشریح خویلد بن عمرو خزاعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اور خصوصی اہتمام کرے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! خصوصی اہتمام کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک دن اور رات (گویا مہمان کی آمد پر دو وقت اس کے اکرام کے لیے کوئی مخصوص چیز (Special

Item) بنانی چاہیے، اسی کو ’’جائزہ‘‘ سے تعبیر کیا گیا) ویسے میزبانی تین دن ہے (باقی دو دن کوئی خاص تکلّف کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جو خود کھاتا ہے وہی مہمان کو کھلائے۔ ہاں! ایک دن مہمان کے لیے اس کا اکرام کرتے ہوئے تکلّف بھی کرے) تین دن کے بعد مہمان کا کوئی حق نہیں ہے، اس کے بعد بھی میزبان اس کو کھلاتا پلاتا رہے، تو وہ اس کی طرف سے ایک طرح کا صدقہ سمجھا جائے گا۔

(اسی بات کو دوسری روایت میں اس طرح فرمایا گیا ہے کہ) کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے بھائی کے یہاں اتنا ٹھہرے کہ اپنے بھائی کو گناہ میں ڈال دے (یعنی مہمان بن کر گئے تو واپس جانے کا نام ہی نہیں لیتے، بوریا بستر لے کر فیوی کول لگا کر وہیں جم کر پڑ گئے) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! گناہ میں کیسے ڈالے گا؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس کے یہاں اتنا قیام کرے کہ اس کے پاس میزبانی کے لئے کچھ بھی نہ رہے، پھر وہ بے چارہ قرض لینے یا کوئی دوسری شکل اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ مہمان کو کسی کے یہاں زیادہ سے زیادہ تین دن قیام کرنا چاہیے، اس سے زیادہ نہیں۔ ہاں! صاحبِ خانہ یا جس کے یہاں آپ گئے ہیں اس کے ساتھ آپ کے مراسم ایسے ہیں کہ وہ خود اصرار بھی کرتا ہے، اور آپ کا اس کے یہاں ٹھہرنا اس کو ناگوار نہیں گزرتا بلکہ وہ خوش ہوتا ہے؛ تو اس صورت میں حکم بدل جائے گا۔ ورنہ اصل حکم تو یہی ہے کہ کسی کے یہاں زیادہ سے زیادہ تین دن قیام کرے، اس سے زیادہ نہیں۔

إستحباب التبشير والتهنئة بالخير

کسی کو مبارک باد دینے کا پسندیدہ ہونا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ

مبارک باد دینا پسندیدہ ہے

کسی کے دل کو خوش کرنا دیکھنے میں ایک چھوٹی سی چیز ہے، لیکن شریعت کی نگاہوں میں بہت بڑی نیکی ہے۔ اور آدمی جن مختلف طریقوں سے نیکی حاصل کرسکتا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی ایسی خوش کن خبر جو سامنے والے کے لیے مسرت اور خوشی کا باعث ہو اس کو بشارت کے طور پر سامنے والے کو سنانا؛ تاکہ اس کا جی خوش ہو، اور کسی اچھی بات پر مبارک باد دینا؛ یہ بھی اسلام کی نگاہ میں محبوب اور پسندیدہ ہے۔

اگر اس پر عمل ہو جائے!

آج کل دلوں میں حسد، بغض اور کینہ کے نتیجہ میں ہم لوگوں کا مزاج ایسا بنا ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ رہنے والے کسی بھائی کے یہاں کوئی ایسی بات پیش آئے جو اس کے لیے باعثِ مسرت ہو، تو ہم اس کو مبارک باد دینے میں جھجھک محسوس کرتے ہیں۔ حالاں کہ ایسے موقع پر اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ آپ خوشی کے موقع پر اس کو مبارک باد دیجیے، اور اگر یہ خوشی کی اطلاع اس تک نہیں پہنچی ہے تو آپ جلدی سے اس اطلاع کو اس تک پہنچا کر اس کا جی خوش کیجیے۔ یہ بھی ایک مسلمان کا حق ہے، اور اسلام نے یہ تعلیم دی ہے، اگر ان تعلیمات پر عمل عام ہو جائے تو اس کی وجہ سے دلوں میں ایک دوسرے کے متعلق جو میل، عداوت، بغض اور کینہ ہوتا ہے وہ سب ختم ہو جائے۔

اسلامی معاشرے کو باہم جوڑنے والی

قدیم زمانہ میں ہمارے یہاں اس کا رواج تھا اور آج بھی جہاں سادگی ہے وہاں اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ گھروں میں جہاں قریبی تعلق ہوتا ہے وہاں بھی اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے، مثلاً: کسی کے یہاں بیٹا پیدا ہوا تو لوگ کوشش کرتے ہیں کہ بچہ کے باپ کو جلدی سے خوشخبری سنا کر اس سے کچھ ہدیہ وصول کریں۔ خوشخبری سنانے والے کا جی خوش کرنا بھی ثابت ہے اور اس کی بھی تاکید آئی ہے، ایسا آج کل بھی ہوتا ہے، لیکن ہم نے اس کو صرف اپنے ہی گھر کے اندر محدود کر رکھا ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ایک مسلمان بھائی کا رشتہ دوسرے مسلمان بھائی کے ساتھ وہی ہے جو ایک انسان کا اپنے سگے بھائی کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ تو جیسے وہاں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے، وہی معاملہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ بھی ہونا چاہیے۔ جیسے کسی نے ملازمت کے لیے درخواست دے رکھی تھی، اور آپ کو پتہ چل گیا کہ اس کی ملازمت لگ گئی، تو آپ فوراً بھاگے دوڑے اس کے پاس جائیے اور اس کو خوشخبری سنائیے، اس سے اس کا جی خوش ہو جائے گا، اور وہ یہ سمجھے گا کہ اس کی اس خوشی میں آپ بھی اس کے ساتھ شریک ہیں۔ یہ چیز اسلامی معاشرے کو آپس میں جوڑنے والی ہے۔

ہمارے آداب اہلِ یوروپ نے اپنا لئے

اسلام نے یہی سب آداب ہمیں سکھائے ہیں، لیکن ہم ان آداب کو بھول گئے اور یوروپین تہذیب میں وہ لوگ انہیں آداب کو اپناتے جا رہے ہیں اور خوش کن خبر کو اس انداز سے پیش کرنے کا بڑا اہتمام کرتے ہیں، حالاں کہ وہ ایک نمائش ہوتی ہے۔ ایک صاحب اپنا قصہ سنانے لگے کہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک گئے، جب وہاں

اترے اور امیگریشن کے اندر پاسپورٹ دیا، تو چوں کہ پاسپورٹ پر ولادت کی تاریخ (Birth date) لکھی ہوئی ہوتی ہے، تو اتفاق کی بات کہ وہ جس روز وہاں پہنچے وہی ان کی تاریخِ پیدائش تھی۔ کاؤنٹر پر جس نے ان کا پاسپورٹ لیا اس نے سب سے پہلے ان کو مبارک باد دی کہ آج آپ کا برتھ ڈے (Birth day) ہے، ہماری طرف سے مبارک باد قبول کیجیے، حالاں کہ اس کا اس سے نہ کوئی رشتہ تھا، نہ وہ اس کا پڑوسی تھا، اور نہ کوئی تعلق تھا، ایک نو وارد اس ملک میں گیا تھا لیکن وہ لوگ ان چیزوں کا بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ اور آج ہم الٹا کرتے ہیں، ہمارے یہاں ان چیزوں کا اہتمام تو دور کی بات رہی، بلکہ اس بات کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی کی خوشی کی بات کو دبایا جائے، حالاں کہ اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ کسی کی خوشی کے موقع پر آدمی خوشی کا اظہار کرے تاکہ اپنے مسلمان بھائی کے سامنے یہ ظاہر ہو کہ میری خوشی پر وہ بھی خوش ہے، اس سے اس کی خوشی دوبالا اور دوگنی ہو جائے گی، اس کی مسرت میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور مقصد تو یہی ہے۔ یہی چیز اسلامی معاشرے اور سماج کو قوت پہنچانے والی ہے۔

اپنا بنانے کا گُر

پھر اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ ایک دوسرے کی مصیبت کے موقع پر بھی وہ آپس میں کام آئیں گے۔ آپ کسی کی خوشی کے موقع پر کسی کے ساتھ شرکت کریں گے تو یقیناً آپ کی غمی کے موقع پر وہ آپ کے ساتھ شریک ہونا پسند کرے گا۔ وہ یاد رکھے گا کہ فلاں خوشی کے موقع پر آپ نے مبارک بادی تھی، تو اگر آپ پر کوئی آڑا وقت آ گیا تو وہ دوڑا ہوا آئے گا، حالاں کہ وہ ایک معمولی بات تھی کہ آپ نے ذرا سا خوشی کا اظہار کیا تھا، لیکن اس عمل سے آپ نے اس کو اپنا بنا لیا۔

قرآنی دلائل

یہی تعلیمات اور زندگی کے آداب ہیں جو ہمیں سکھائے جارہے ہیں، انہی تعلیمات کو اس باب میں بتلاتے ہیں کہ کسی کو خوشی کے موقع پر بشارت سنانا مستحب و پسندیدہ ہے، اسلام کی نگاہوں میں یہ چیز اچھی ہے، اس کو انجام دینا چاہیے، اسی کی تلقین کی گئی اور ترغیب دی گئی ہے۔ اس موقع پر قرآنِ پاک کی بہت ساری آیتیں پیش کی ہیں، جن میں بشارت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے: ﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهُ﴾ باری تعالیٰ حضورِ اکرم ﷺ سے فرماتے ہیں کہ میرے وہ بندے جو میرے کلام کو سن کر اس کی پیروی کرتے اور اس پر عمل کا اہتمام کرتے ہیں آپ ان کو بشارت سنا دیجیے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس کے احکام پر عمل کرنے کی توفیق دی، اس پر اللہ تعالیٰ آپ کو اجر و ثواب اور جنت عطا فرمائے گا۔

﴿يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ﴾ جنتیوں کو اللہ تعالیٰ بشارت سنائیں گے اپنی خاص رحمتوں اور رضامندی اور باغات کی، جن میں ان کو اور بھی نعمتیں ملیں گی اور ہمیشہ کا ٹھکانہ ملے گا۔ گویا یہ وہ کام ہے جس کو خود اللہ تعالیٰ بھی کریں گے کہ اپنے بندوں کو خوش کرنے کے لیے اپنی طرف سے خوشخبریاں سنائیں گے۔ جیسے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹے کے کامیاب ہونے کی اطلاع آئی تو باپ کہتا ہے کہ کوئی اس کو نہ بتائے، میں خود بتاؤں گا۔ اس کے دل میں بیٹے کی قدر ہوتی ہے، وہ اس کو خوش کرنا اور اس کو اعزاز دینا چاہتا ہے تو اپنی طرف سے اس کو اطلاع دینے کا اہتمام کرتا ہے۔ جب باری تعالیٰ اپنے بندوں کو اعزاز دینا چاہتا ہے تو ان کو ایسی بشارت خود ہی سناتا ہے۔

﴿وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ قیامت کے روز باری تعالیٰ اہلِ ایمان سے فرمائیں گے: خوشخبری سن لو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا کہ اگر نیک کام کروگے تو جنت ملے گی، تو آج دیکھ لو، یہ مل رہی ہے، اب خوش ہو جاؤ۔

﴿فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيْمٍ﴾ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو بیٹا ہونے کی خوشخبری فرشتوں کے ذریعہ سنائی اس کو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَبَشَّرْنَاهُ﴾ ہم نے بشارت دی۔ یعنی یہ اطلاع دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بھیجا تھا، گویا بشارت دینے والے اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔

قرآنِ پاک کی ان آیتوں کے ذریعہ سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ کی ذات تو بے نیاز ہے، لیکن اپنے خلیل کے ساتھ محبت کا اظہار کرنے اور ان کے اعزاز کے واسطے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتنا اہتمام کیا جا رہا ہے! تو ہمیں بھی آپس میں ان چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے، یہی چیز آپس کے تعلقات کو بڑھانے والی اور محبت میں اضافہ کرنے والی ہے۔

﴿وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيْمَ بِالْبُشْرٰى﴾ ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت اور خوشخبری لے کر آئے۔ باری تعالیٰ نے ان کو خوش خبری سنانے کے لیے باقاعدہ فرشتے بھیجے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر آپ بھی کسی کو کوئی خوش خبری سنانے کے لیے ٹیلیفون، خط، ٹیلی گرام، یا آدمی بھیجنے کا اہتمام کریں؛ تو یہ ثابت ہے، خود باری تعالیٰ قرآنِ پاک میں فرما رہے ہیں۔ ﴿وَامْرَأَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَاءِ إِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ﴾ فرشتے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں مہمان بن کر بیٹے کی بشارت سنانے کے لیے آئے؛ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ حضرت سارہ بھی مہمانوں کی خدمت کے لیے (پردہ کی آڑ میں) موجود تھیں، وہ ہنسیں،

اورہم نے ان کوحضرت اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت سنائی اوران کے یہاں جو بیٹا پیدا ہوگا اس کا نام یعقوب ہوگا۔﴿فَنَادَتْهُ الْمَلآئِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّيْ فِيْ الْمِحْرَابِ أَنَّ اللهَ يُبَشِّرُ كَ بِيَحْيٰ﴾ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کے یہاں بیٹا یحییٰ پیدا ہونے کی بشارت فرشتوں کے ذریعہ سے دلوائی۔

یہ ساری آیتیں لاکر بتلانا چاہتے ہیں کہ یہ خوشخبری سنانا کتنا عمدہ کام ہے کہ اللہ تعالیٰ خود بھی اس کا اہتمام کررہے ہیں، تو ظاہر ہے ہمیں بھی ان چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

ایک موتی کے مکان کی خوشخبری

۷۰۸:-عن أَبي إبراهيم، ويقال: أَبو محمد، ويقال: أَبو معاوية عبد الله بن أَبي أوفى رضی اللہ عنہما أنّ رسولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بَشَّرَ خَدِيجَةَ رضی اللہ عنہا بِبَيْتٍ في الجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ لاَصَخَبَ فِيهِ، وَلاَ نَصَبَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((الْقَصَبُ)): هُنَا اللُّؤْلُؤُ الْمُجَوَّفُ. وَ((الصَّخَبُ)): الصِّياحُ وَاللَّغَطُ. وَ((النَّصَبُ)): التَّعَبُ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو جنت کے اندر ایک ایسے مکان کی خوشخبری سنائی جو ایسے موتی کا بنا ہوا ہوگا جو اندر سے کھوکھلا ہوگا (یعنی اس مکان کے چاروں طرف موتی کا خول چڑھا ہوا ہوگا) جس میں نہ کوئی شور شغب ہوگا اور نہ کوئی تھکن ہوگی (بڑے سکون سے وہاں زندگی گزرے گی)۔

افادات:- نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب غار حراء میں عبادت میں مشغول ہوتے تھے تو موقع بموقع حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ٹفن پہنچانے کا کام کرتی تھیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو توشہ پہنچاتی تھیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام غارِ حراء

میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس موجود تھے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا توشہ لے کر آرہی تھیں، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جب ان کو آتے ہوئے دیکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: باری تعالیٰ ان کو سلام فرماتے ہیں، آپ ان کو سلام پہنچا دیجئے اور بشارت سنا دیجئے کہ باری تعالیٰ ان کو جنت میں ایک ہی موتی سے بنا ہوا محل عطا فرمائیں گے، ایسا محل جس میں کوئی شور و شغب اور تھکن نہیں ہوگی۔ (بخاری شریف: باب تَزْوِيجُ النَّبِيِّ ﷺ خَدِيجَةَ وَفَضْلُهَا)

اس سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مقام معلوم ہوتا ہے۔ اور اُمہات المؤمنین میں ان کا مقام سب سے اونچا ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مناقب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج میں کسی عورت پر اتنی غیرت نہیں آتی جتنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر آتی تھی، حالاں کہ ان کا انتقال میرے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح میں آنے سے پہلے ہو چکا تھا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا اتنی کثرت سے تذکرہ فرماتے تھے کہ مجھے ان پر رشک آتا تھا اور غیرت آتی تھی۔ (بخاری: باب تَزْوِيجُ النَّبِيِّ ﷺ خَدِيجَةَ وَفَضْلُهَا) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح میں آنے سے پہلے باری باری دو مردوں کے نکاح میں رہی تھیں، جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح میں آئیں اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف پچیس (۲۵) سال تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس (۴۰) سال تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کبھی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ بڑی محبت سے فرماتے تو میں کہتی: اُس بڑھیا کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک جوان عورت عطا فرمائی ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے: میری تمام اولاد انہی سے ہیں

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام اولاد سوائے حضرت (بخاری شریف: باب تَزْوِيجُ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خَدِيجَةَ وَفَضْلُهَا) ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انہی سے ہیں۔ حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے، باقی چاروں بیٹیاں اور سب صاحبزادے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہیں۔

اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لانے والی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ حضورا کرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دینے والی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ اپنا سب مال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے قربان کرنے والی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ انہی کی وجہ سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بڑی تقویت رہی۔ ان کے انتقال والے سال ہی ابوطالب کا بھی انتقال ہوا جس کی وجہ سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بڑی پریشانیوں کا سامنا ہوا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت کی بشارتیں سنائیں

۷۰۹:-وعن أَبِي موسى الأشعري رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّهُ تَوَضَّأَ فِي بَيْتِهِ، ثُمَّ خَرَجَ، فَقَالَ: لَأَلْزَمَنَّ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم. وَلَأَكُونَنَّ مَعَهُ يَوْمِي هَذَا، فَجَاءَ الْمَسْجِدَ، فَسَأَلَ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم. فَقَالُوا: وجَّهَ هاهُنَا، قَالَ: فَخَرَجْتُ عَلَى أَثَرِهِ أَسْأَلُ عَنْهُ، حَتَّى دَخَلَ بِئْرَ أَرِيسٍ، فَجَلَسْتُ عِنْدَ البَابِ حتَّى قضى رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاجتَهُ وتوضأ، فقمتُ إليهِ فإذا هو قد جلسَ على بئرِ أريسٍ وتوَسَّطَ قُفَّهَا، و كشَفَ عنْ ساقيهِ ودلَّاهُما في البئرِ، فسلمتُ عَليهِ ثمَّ انصَرَفتُ، فجلستُ عِندَ البابِ، فَقُلْتُ: لأَكُونَنَّ بَوَّابَ رسولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الْيَوْمَ، فَجَاءَ أَبُو بَكْرٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فَدَفَعَ الْبَابَ، فقلتُ: مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ: أَبُو بَكْرٍ، فقُلتُ: عَلَى رِسْلِكَ، ثُمَّ ذَهَبْتُ، فقلتُ: يَا رسول الله، هَذَا أَبُو بَكْرٍ يَستَأْذِنُ. فَقَالَ: ائْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ. فَأَقْبَلْتُ حَتَّى قُلْتُ لأَبِي بَكْرٍ: ادْخُلْ وَرسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يُبَشِّرُكَ بِالْجَنَّةِ. فَدَخَلَ أَبُو بَكْرٍ حَتَّى جَلَسَ عَنْ

يَمِينِ النَّبِيِّ ﷺ مَعَهُ فِي الْقُفِّ، وَدَلَّى رِجْلَيْهِ فِي الْبِئْرِ كَمَا صَنَعَ رسول الله ﷺ، وَكَشَفَ عَنْ سَاقَيْهِ، ثُمَّ رَجَعْتُ وَجَلَسْتُ، وَقَدْ تَرَكْتُ أَخِي يَتَوَضَّأُ وَيَلْحَقُنِي، فقلتُ: إِنْ يُرِدِ اللهُ بِفُلَانٍ - يُرِيدُ أَخَاهُ - خَيْراً يَأْتِ بِهِ. فَإِذَا إِنْسَانٌ يُحَرِّكُ الْبَابَ، فقلتُ: مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ: عُمَرُ بن الخطّابِ، فقلتُ: عَلَى رِسْلِكَ، ثُمَّ جِئْتُ إِلَى رسول الله ﷺ، فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ وَقُلْتُ: هَذَا عُمَرُ يَسْتَأْذِنُ. فَقَالَ: ائْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ. فَجِئْتُ عُمَرَ، فقلتُ: أَذِنَ وَيُبَشِّرُكَ رسول الله ﷺ بِالْجَنَّةِ، فَدَخَلَ فَجَلَسَ مَعَ رسول الله ﷺ فِي الْقُفِّ عَنْ يَسَارِهِ وَدَلَّى رِجْلَيْهِ فِي الْبِئْرِ، ثُمَّ رَجَعْتُ فَجَلَسْتُ، فَقُلْتُ: إِنْ يُرِدِ اللهُ بِفُلَانٍ خَيْراً - يَعْنِي أَخَاهُ - يَأْتِ بِهِ، فَجَاءَ إِنْسَانٌ فَحَرَّكَ الْبَابَ. فَقُلْتُ: مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ: عُثْمَانُ بن عَفَّانَ. فقلتُ: عَلَى رِسْلِكَ، وجِئْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَأَخْبَرْتُهُ، فقال: ائْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ مَعَ بَلْوَى تُصِيبُهُ. فَجِئْتُ، فقلتُ: ادْخُلْ وَيُبَشِّرُكَ رسولُ الله ﷺ بِالْجَنَّةِ مَعَ بَلْوَى تُصِيبُكَ فَدَخَلَ فَوَجَدَ الْقُفَّ قَدْ مُلِئَ، فجلس وِجَاهَهُمْ مِنَ الشِّقِّ الْآخَرِ.

قَالَ سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ: فَأَوَّلْتُهَا قُبُورَهُمْ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وزاد في رواية: وأمرني رسولُ الله ﷺ بحفظِ الباب. وَفيها: أَنَّ عُثْمَانَ حِيْنَ بَشَّرَهُ حَمِدَ اللهَ تَعَالَى، ثُمَّ قَالَ: اللهُ الْمُسْتَعَانُ.

ترجمہ:- حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ اپنے گھر میں وضو کیا، پھر گھر سے باہر آئے اور اپنے جی میں سوچا کہ آج کے پورے دن میں حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ ہی رہوں گا۔ چناں چہ اسی ارادہ سے وہ مسجدِ نبوی میں حاضر ہوئے، لوگوں سے پوچھا: حضور ﷺ کہاں ہیں؟ لوگوں نے بتلایا کہ اس طرف تشریف لے گئے ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جو سمت مجھے بتلائی گئی تھی میں اس طرف چلا اور لوگوں سے پوچھتا جاتا تھا کہ حضور اس طرف

آئے ،تو کہاں ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیرٔ اُریس میں داخل ہوئے ہیں (مسجد قباء کے سامنے ایک باغ تھا اسی میں ایک کنواں تھا، اس کنویں کا نام بیرٔ اُریس تھا نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی کبھار اس باغ میں تشریف لے جاتے اور اس کنویں کا پانی نوش فرماتے اور اس کنویں کے کنارے سے اپنے پاؤں کنویں کے اندر لٹکا کر سکون وراحت حاصل کرنے کے لیے بیٹھتے ،اس روز بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہیں تشریف لے گئے تو حضرت ابوموسیٰ اُشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ) مَیں اس باغ کے پاس پہنچ کر اس کے دروازے پر بیٹھ گیا، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی باغ میں کچھ دور اپنی حاجت پوری فرمانے کے لیے تشریف لے گئے تھے، یہاں تک کہ جب آپ قضائے حاجت کے بعد واپس تشریف لائے اور وضو فرمایا تو مَیں اُٹھ کر حضور کے پاس پہنچا، اس وقت حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کنویں پر آکر تشریف فرما ہو چکے تھے، اور آپ نے اس کے ایک طرف بیٹھ کر اپنی پنڈلیاں کھول کر کنویں میں پاؤں لٹکا رکھے تھے۔ مَیں نے سلام کیا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول !اگر آپ اجازت دیں تو مَیں پہرہ داری کروں کہ باغ کے دروازہ پر بیٹھوں اور آپ کی اجازت کے بغیر کسی کو اندر نہ آنے دوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو دربانی کا حکم دیا۔ چناں چہ وہ دروازہ کے پاس بیٹھ گئے ،اور اپنے جی میں طے کرلیا کہ آج میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دربانی کے فرائض انجام دوں گا۔ کچھ دیر بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے اور دروازہ کو دھکا دیا۔ مَیں نے پوچھا: کون؟ انہوں نے کہا: ابوبکر۔ مَیں نے کہا: آپ ٹھہر جائیے، ابھی اندر نہیں آسکتے ، پہلے میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت لے لوں ۔ پھر میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گیا اور عرض کیا: یارسول اللہ! ابوبکر اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان کو اندر آنے کی اجازت دو، اور جنت کی خوشخبری بھی سناؤ۔ (بس ! یہاں تو یہ روایت اسی بات کو بتلانے کے لیے لائے ہیں کہ آپ نے خوشخبری سنانے کا فرمایا)۔

حضرت ابوموسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں دروازہ کی طرف آیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: اندر تشریف لائیے اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو جنت کی خوشخبری دی ہے۔ چناں چہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اندر آئے اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کنویں کے جس کنارے پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے تھے، وہیں آکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دائیں طرف بیٹھ گئے، اور انہوں نے بھی اپنے پاؤں اسی طرح کنویں کے اندر لٹکا دیئے جس طرح حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لٹکائے تھے اور اپنی پنڈلیاں بھی اسی طرح کھول دیں جس طرح حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھولی تھیں۔ حضرت ابوموسیٰ کہتے ہیں: پھر مَیں کنویں کے پاس سے لوٹ کر دروازہ کے پاس آیا اور بیٹھ گیا (چوں کہ ان کو تو آج دربانی کرنی تھی) حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جس وقت مَیں گھر سے وضو کر کے نکلا تھا تو اپنے بھائی کو وضو کرتا ہوا چھوڑ آیا تھا، اس لیے میں نے اپنے جی میں سوچا کہ آج اگر اللہ تعالیٰ کو میرے بھائی کی بھلائی منظور ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو یہاں ضرور لائیں گے، اس لیے کہ آج تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنت کی بشارت سنا رہے ہیں، کاش! وہ بھی آجائے **(اس سے معلوم ہوا کہ کوئی آدمی اپنے متعلقین میں سے کسی کے لیے ایسی چیز کی تمنا کرے تو پسندیدہ ہے)** ابھی میں دل میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا کہ کوئی دروازے کو دھکا دے رہا ہے۔ میں نے پوچھا: بھائی! کون ہو؟ انہوں نے کہا: عمر بن خطاب ہوں۔ حضرت ابوموسیٰ نے کہا: ٹھہر جائیے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور اطلاع دی کہ حضرت عمر دروازہ پر ہیں اور اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان کو اندر آنے کی اجازت دیدو اور ان کو بھی جنت کی خوشخبری سنادو۔ مَیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اندر آنے کی اجازت دی اور آپ کو جنت کی بشارت ارشاد فرمائی۔ چناں چہ وہ داخل ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بائیں طرف بیٹھ گئے، اور انہوں نے بھی اپنے پاؤں کنویں میں لٹکا دیئے۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: پھر مَیں دروازہ کے پاس آیا اور بیٹھ گیا اور دل میں وہی تمنا کرنے لگا کہ کاش! میرا بھائی آجاتا، آج بڑا اچھا موقع ہے، اگر اللہ تعالیٰ کو اس کے لیے خیر منظور ہے تو ضرور اس کو بھیج دیں گے۔ اتنے

میں کوئی آدمی آیا اور دروازہ کو ہلانے لگا۔ میں نے پوچھا: کون ہو؟ انہوں نے جواب دیا: میں عثمان بن عفان ہوں۔ میں نے ان سے بھی کہا: ٹھہر جائیے، ابھی آپ اندر نہیں آسکتے۔ اس کے بعد مَیں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور اطلاع کی۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان کو اندر آنے کی اجازت دو اور جنت کی بشارت سناؤ اس آزمائش کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ ان کی کریں گے۔ مَیں نے کہا: اندر آجائیے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کو جنت کی بشارت سنا رہے ہیں اس آزمائش کے ساتھ جو آپ کو پہنچنے والی ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ بشارت سن کر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء فرمائی اور کہا اللہ تعالیٰ ہی مدد فرمانے والا ہے۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اندر تشریف لائے تو دیکھا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کنویں کے جس کنارہ پر تشریف فرما تھے وہ بھر چکا تھا، حضور کے دائیں بائیں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بیٹھ چکے تھے، وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی، اس لئے کنویں کے سامنے والے دوسرے کنارہ پر جو جگہ خالی تھی وہ وہاں بیٹھ گئے۔

اس روایت کے نقل کرنے والے حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ (جو بڑے تابعی ہیں) فرماتے ہیں کہ اس روایت کا مطلب میں نے یہ لیا کہ ان حضرات کو جہاں جہاں بیٹھنے کا موقع ملا، وہ ان کی قبروں سے عبارت ہے۔

افادات:- اللہ تعالیٰ نے حضراتِ شیخین رضی اللہ عنہما کی قبریں تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اسی حجرۂ شریفہ میں بننے دیں، اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر جنت البقیع میں ہے، لیکن اگر آپ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر پر جا کر کھڑے رہیں اور دیکھیں تو وہاں سے گنبدِ خضراء بالکل سامنے سیدھ میں نظر آئے گا، ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہے۔

میرے پہلے سفرِ حج کا واقعہ

مَیں پہلی مرتبہ جب حج میں گیا تھا تو وہاں ایک بڑے صالح بزرگ تھے،

مدت سے وہاں جماعت کے کام میں لگے ہوئے تھے، اور مدینہ منورہ کی ساری زیارت گاہوں سے خوب واقف تھے، اور چوں کہ اس سے اگلے سال ۹۷ھ میں ایک واقعہ پیش آیا تھا جس کی وجہ سے جماعت کے کام کرنے والوں پر بڑی سختی اور نگرانی تھی۔ جب مَیں مدینہ منورہ پہنچا تو میں نے ساتھیوں سے کہا کہ مسجدِ نبوی اور یہاں کی دوسری تاریخی جگہوں کی زیارت کرنا چاہتا ہوں، اگر کوئی واقف کار آدمی ہو تو رہنمائی ملے۔ مولانا اسماعیل صاحب بدات اور دوسرے ایک دو آدمیوں نے کہا کہ دَھار (دھار) (مہاراشٹر کے ایک علاقہ کا نام ہے) کے فلاں بڑے میاں ہیں وہ بہت اچھا بتلائیں گے، ان سے ملو۔ مَیں ان سے ملا، انہوں نے کہا: آج کل میری نگرانی ہو رہی ہے، تم اگر میرے سامنے بیٹھو گے تو تم بھی پکڑے جاؤ گے، اس لیے میرے پاس اس طرح بیٹھنا جیسے کوئی آدمی صف میں بیٹھتا ہے، مَیں تھوڑی تھوڑی چیزیں بتا تا رہوں گا۔ وہ مسجدِ نبوی کی چیزیں بتاتے اور پھر کہتے کہ جاؤ! تم دیکھ کر آؤ، مَیں دیکھ کر آتا اور رپورٹ دیتا کہ ایسی ایسی ہے، تو وہ کہتے کہ ہاں! ٹھیک ہے۔

ایک مرتبہ انہوں نے یہی قصہ سنایا، لیکن انہوں نے اس میں ایک چیز کا اضافہ کیا تھا، مجھے تو آج تک کسی روایت میں وہ چیز نہیں ملی، مَیں تلاش میں بھی ہوں کہ مل جائے۔ وہ اضافہ یہ تھا کہ اس کے بعد ایک اور آدمی آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا: کون ہو؟ آنے والے نے کہا: مَیں علی بن اَبی طالب ہوں۔ انہوں نے کہا: یہیں ٹھہرو، مَیں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت لے لوں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچے اور کہا کہ حضرت علیؓ اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان کو جنت کی بشارت سنادو اور اندر آنے کی اجازت نہیں ہے، چناں چہ ان کی قبر مدینہ منورہ میں نہیں بنی۔

حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے ان حضرات کی قبور کی جو تعبیر فرمائی وہ یہ ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی قبریں تو بالکل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بنیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ساتھ میں نہیں ہیں، لیکن مدینہ منورہ ہی میں بالکل سامنے ہیں، اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر مدینہ منورہ میں نہیں بن پائی۔

خیر! یہاں تو بشارت سنانے کی مناسبت سے یہ روایت پیش کی ہے کہ دیکھو! حضرت اُبوموسیٰ اُشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے جا کر یہ خوشخبریاں بڑے خوش ہو کر سناتے رہے۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ مجھے تو یہ خوشخبری نہیں دی جارہی ہے تو پھر میں جا کر دوسروں کو کیوں سناؤں۔ ہمارے جیسے ہوتے تو ایسا ہی سوچتے کہ مجھے تو کوئی بشارت نہیں مل رہی، تو پھر یہ سارے چکر اور آنٹے پھیرے (ج چکر) کیوں مارتا رہوں۔

یقین سے کلمہ پڑھنے پر جنت کی بشارت

۷۱۰:- وعن أبی هریرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: كُنَّا قُعُوداً حَوْلَ رسولِ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَمَعَنَا أَبُو بَكرٍ وَعُمَرُ رضی اللہ عنہما فی نَفَرٍ، فَقَامَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مِنْ بَيْنِ أَظْهُرِنَا فَأَبْطَأَ عَلَيْنَا، وَخَشِينَا أَنْ يُقْتَطَعَ دُونَنَا وَفزِعْنَا فقُمْنَا، فَكُنْتُ أَوَّلَ مَنْ فَزِعَ، فَخَرَجْتُ أَبْتَغِي رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حَتَّى أَتَيْتُ حَائِطاً للأنصارِ لِبَنِي النَّجَارِ، فَدُرْتُ بِهِ هَلْ أَجِدُ لَهُ بَاباً؟ فَلَمْ أَجِدْ! فَإِذَا رَبِيعٌ يَدْخُلُ فِي جَوْفِ حَائِطٍ مِنْ بِئْرٍ خَارِجَهُ- وَالرَّبِيعُ: الجَدْوَلُ الصَّغِيرُ- فَاحْتَفَرْتُ، فَدَخَلْتُ عَلَى رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَقَالَ: ((أَبُو هُرَيْرَةَ؟)) فقلتُ: نَعَمْ، يَارسول الله، قَالَ: ((مَا شَأْنُكَ؟)) قُلْتُ: كُنْتَ بَيْنَ أَظْهُرِنَا فَقُمْتَ فَأَبْطَأْتَ عَلَيْنَا، فَخَشِينَا أَنْ تُقْتَطَعَ دُونَنَا، ففزعنا، فَكُنْتُ أَوَّلَ مَنْ فَزِعَ، فَأَتَيْتُ هَذَا الحَائِطَ، فَاحْتَفَزْتُ كَمَا يَحْتَفِزُ الثَّعْلَبُ، وهؤلاء

النَّاسُ وَرَائِي. فَقَالَ: يَا أَبَا هُرَيرَةَ. وَأَعْطَانِي نَعْلَيْهِ، فَقَالَ: اذْهَبْ بِنَعْلَيَّ هَاتَيْنِ، فَمَنْ لَقِيتَ مِنْ وَرَاءِ هَذَا الحَائِطِ يَشْهَدُ أَنْ لا إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهُ، فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ.....وَذَكَرَ الحديثَ بطوله.. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی کچھ صحابہ کے ساتھ موجود تھے کہ اچانک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے درمیان سے اُٹھے اور آبادی سے باہر تشریف لے گئے، جب آپ نے واپس آنے میں دیر کر دی تو سب کو فکر لاحق ہوئی کہ پتہ نہیں کیا بات ہوئی، اس لیے سب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش و جستجو میں نکلے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے بے چینی مجھے پیدا ہوئی تھی اس لئے مَیں آپ کو تلاش کرنے کے لئے نکلا، یہاں تک کہ انصار کے قبیلہ بنونجّار کا ایک باغ تھا اُس کے متعلق مجھے خیال ہوا کہ آپ شاید اندر ہوں گے، تو مَیں اندر جانے کا راستہ ڈھونڈنے کے لیے اس باغ کے چاروں طرف چکّر لگانے لگا، لیکن مجھے راستہ نہیں ملا، اس باغ میں پانی جانے کے لیے ایک چھوٹی سی نہر تھی جو مجھے نظر آئی تو میں نے اپنے جسم کو سکیڑا، جیسے لومڑی سکیڑتی ہے، اور اس چھوٹی سی نہر سے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس باغ میں تشریف فرما ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے دیکھا تو پوچھا: ابو ہریرہ ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! اے اللہ کے رسول۔ پوچھا: کیا بات ہے؟ یہاں کیوں آئے؟ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے، پھر اچانک اُٹھ گئے اور واپس آنے میں دیر ہوگئی تو ہم سب پریشان ہو گئے، اور ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچی ہو، اس لئے ہم سب بے چین ہو گئے اور سب سے پہلے بے چینی مجھے ہوئی، اس لئے میں اس باغ میں اپنے جسم کو اس طرح سکیڑ کر اندر داخل ہوا جیسے لومڑی کسی جگہ گھستی ہے۔ دوسرے لوگ بھی میرے پیچھے پیچھے آرہے ہیں (جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اس بے چینی کو دیکھا اور ظاہر ہے کہ نبیٔ

کریم ﷺ کے ساتھ تعلق ومحبت کی بنا پر یہ بے چینی پیدا ہوئی تھی، تو نبیٔ کریم ﷺ نے چاہا کہ اس کی تلافی ہوجائے اور ان کا جی خوش ہوجائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ) حضور ﷺ نے مجھے اپنے نعلین مبارک علامت اور نشانی کے طور پر عطا فرمائے اور ارشاد فرمایا: میرے یہ دونوں جوتے لے کر جاؤ اور اس باغ کے باہر جو بھی ایسا آدمی تمہیں ملے جو دل کے یقین کے ساتھ ''لا الہ الا اللہ'' کا اقرار کرتا ہو؛ اس کو جنت کی بشارت سنا دینا۔

افادات: - یہ روایت پہلے بھی آچکی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ نعلین مبارک لے کر باہر نکلے، سب سے پہلے ملاقات حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوگئی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو خوشی خوشی جوتے لے کر جارہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: ابوہریرہ! کیا بات ہے؟ کہا: نبیٔ کریم ﷺ کے یہ جوتے ہیں جو آپ نے مجھے عنایت فرمائے ہیں اور مجھے یہ حکم دیا ہے کہ جو بھی لا الہٰ الاّ اللہ کا سچے دل سے اقرار کرنے والا تمہیں ملے؛ اس کو جنت کی بشارت سنا دو؛ تو لیجئے میں آپ کو جنت کی بشارت سناتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ٹھہرو! اور واپس چلو۔ اب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تو حضورِ اکرم ﷺ نے بھیجا تھا اس لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کہنے سے واپس تھوڑے ہی لوٹتے، انہوں نے واپس لوٹنے میں تأمّل کیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے سینے پر ایک ہاتھ مارا جس سے وہ نیچے زمین پر گر پڑے۔ اب دیکھا کہ واپس لوٹنا ہی پڑے گا، لہٰذا لوٹے۔ آگے حضرت ابوہریرہ اور پیچھے حضرت عمر۔ حضور ﷺ کے پاس پہنچے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو رہے تھے اور حضور ﷺ سے عرض کیا کہ: آپ کے ارشاد کے مطابق میں تو جا رہا تھا، راستہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مل گئے اور انہوں نے میرے سینے پر ایسے زور سے ہاتھ مارا کہ میں تو نیچے گر گیا اور مجھ سے کہا کہ ایسی بشارت مت سناؤ اور واپس لوٹو۔ اتنے میں حضرت عمرؓ بھی پہنچ گئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے ان کو اپنے

جوتے عنایت فرما کر بھیجا تھا؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جی ہاں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ایسی بشارت سنانے کے لیے بھیجا تھا؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جی ہاں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ایسا نہ کیجیے، لوگوں کو عمل کرنے دیجیے، کیوں کہ اگر صرف دل کے یقین کے ساتھ کلمہ پڑھ لینے پر جنت کی بشارت سن لیں گے، تو ہوسکتا ہے کہ عمل کے معاملہ میں کمزوری آجائے، لوگ یوں سوچنے لگیں کہ جنت تو مل ہی گئی ہے، حالاں کہ جنت کے تو بہت سے درجات ہیں، اس لیے یہ بشارت نہ سنائیے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے، اگر مناسب نہیں ہے تو بشارت سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

نوٹ: یہ قصہ حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد: ۷ / امید کے بیان میں آیا تھا، وہاں تفصیلی وضاحت کر چکا ہوں۔

مختصر آپ بیتی از حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۷۱۱:- وعن ابن شماسة، قَالَ: حَضَرْنَا عَمْرَو بنَ العَاصِ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وَهُوَ فی سِيَاقَةِ الْمَوْتِ، فَبَكَى طَوِيلاً، وَحَوَّلَ وَجهَهُ إِلَى الجِدَارِ، فَجَعَلَ ابْنُهُ، يَقُولُ: يَا أَبَتَاهُ! أَمَا بَشَّرَكَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بكَذَا؟ أَمَا بَشَّرَكَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِكَذَا؟ فَأَقْبَلَ بِوَجْهِهِ، فقَالَ: إنَّ أَفْضَلَ مَا نُعِدُّ شَهَادَةُ أنْ لا إلٰهَ إلاَّ الله، وَأَنَّ مُحَمَّداً رسولُ اللهِ، إنِّي قَدْ كُنْتُ عَلَى أَطْبَاقٍ ثَلاَثٍ: لَقَدْ رَأَيْتُنِي وَمَا أَحَدٌ أَشَدُّ بُغْضاً لرسولِ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مِنِّي، وَلاَ أَحَبَّ إلَيَّ مِنْ أنْ أكُونَ قَدِ اسْتَمْكَنْتُ مِنْهُ، فَقَتَلْتُه، فَلَوْ مُتُّ عَلَى تلكَ الحَالِ، لَكُنْتُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ. فَلَمَّا جَعَلَ اللهُ الإسلامَ فی قَلْبِي، أَتَيْتُ النبيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقُلْتُ: ابسُطْ يَمِينَكَ فَلأُبَايِعكَ، فَبَسَطَ يَمِينَهُ، فَقَبَضْتُ يَدِي، فَقَالَ: ((مَا لَكَ يَا عَمْرُو؟)) قلتُ: أردتُ أنْ أَشْتَرِطَ. قَالَ: ((تَشْتَرِطُ مَاذا؟)) قُلْتُ: أنْ يُغْفَرَ لِي، قَالَ: ((أمَا عَلِمْتَ أنَّ الإسلامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ، وأنَّ الهِجْرَةَ

تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبلَهَا، وَأَنَّ الحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟)) وَمَا كَانَ أَحدٌ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَلاَ أَجَلَّ فِي عَيني مِنْهُ وَمَا كُنْتُ أُطِيقُ أَن أَملأَ عَينِي مِنْهُ؛ إِجلالاً لَهُ، ولو سئلت أن أصفه مَا أطقت، لأني لَمْ أكن أملأ عيني مِنْهُ، ولو مُتُّ عَلَى تِلْكَ الحالِ لَرَجَوْتُ أن أكُونَ مِنْ أَهْلِ الجَنّةِ. ثُمَّ وَلِينَا أَشْيَاءَ مَا أَدْرِي مَا حَالِي فِيهَا؟ فَإِذَا أَنَا مُتُّ فَلاَ تَصحَبَنِّي نَائِحَةٌ وَلاَ نَارٌ، فَإِذا دَفَنْتُمُونِي، فَشُنُّوا عَلَيَّ التُّرابَ شَنّاً، ثُمَّ أَقِيمُوا حَوْلَ قَبْرِي قَدْرَ مَا تُنْحَرُ جَزورٌ، وَيُقْسَمُ لَحْمُهَا، حَتَّى أَسْتَأْنِسَ بِكُمْ، وَأَنْظُرَ مَا أُرَاجِعُ بِهِ رُسُلَ رَبِّي. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابن شماسہ فرماتے ہیں ہم لوگ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حاضر ہوئے، وہ بالکل موت کی گھڑی میں تھے، دیر تک روتے رہے، اپنا چہرہ دیوار کی طرف پھیرلیا، ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ (بھی صحابی ہیں) ان سے کہنے لگے: ابا جان! کیا آپ کو حضورِ اکرم ﷺ نے فلاں چیز کی بشارت نہیں دی؟ کیا حضورِ اکرم ﷺ نے فلاں چیز کی بشارت نہیں سنائی؟ (حضورِ اکرم ﷺ نے ان کو جو جو بشارتیں دی تھیں وہ یاددلانے لگے، چوں کہ موت کا وقت تھا اور وہ رورہے تھے، تو دل کے اندر امید پیدا کرنے کے لیے وہ ساری چیزیں یاددلا رہے تھے، یہ سن کر) انہوں نے اپنا چہرہ لوگوں کی طرف متوجہ کیا اور کہنے لگے: سب سے عمدہ چیز جو ہم نے اپنے ساتھ سامان کے طور پر لی ہے وہ کلمۂ شہادت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی ہے۔ پھر فرمانے لگے: میرے اوپر تین دور گزرے ہیں، ایک دَور تو وہ تھا کہ نبیٔ کریم ﷺ کی دشمنی میرے دل میں بھری ہوئی تھی، حضور ﷺ کا مجھ سے بڑا دشمن اور کوئی نہیں تھا، اُس زمانہ میں مجھے یہ چیز بہت پسند تھی کہ اگر مجھے موقع مل جائے تو مَیں آپ کو قتل کردوں، اگر اس حالت میں میری موت آتی تو یقیناً میں جہنمی ہوتا۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی محبت ڈالی، تو مَیں حضورِ اکرم ﷺ کی

خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ اپنا دستِ مبارک آگے بڑھائیے، مَیں آپ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کرنا چاہتا ہوں (یعنی مسلمان ہونا چاہتا ہوں) جب حضور ﷺ نے اسلام کی بیعت لینے کے واسطے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا، تو مَیں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا، حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عمرو! کیا بات ہے؟ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! مَیں ایک شرط کرنا چاہتا ہوں حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا شرط کرنا چاہتے ہو؛ کرو۔ مَیں نے کہا: اس شرط پر اسلام لاؤں گا کہ میرے سارے گناہ معاف ہو جائیں، اور میری مغفرت ہو جائے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عمرو! تمہیں معلوم نہیں کہ اسلام تو اپنے سے پہلے کے سارے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے، اور ہجرت اس سے پہلے کے سارے گناہوں کو مٹا دیتی ہے، اور حج بھی اس سے پہلے کئے ہوئے تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے (اس جگہ پر اسلام کے متعلق لکھا ہے کہ اسلام لانے سے تو اس کا نامۂ اعمال ایک دم کلین وصاف ہو جاتا ہے، ایسا جیسا کہ آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو، لیکن ہجرت اور حج کے متعلق لکھا ہے کہ اس سے صغیرہ گناہ معاف ہوں گے، کبیرہ گناہ نہیں، اگرچہ بعضوں نے کبیرہ کے متعلق بھی لکھا ہے، لیکن راجح قول وہی ہے) پھر تو میرا یہ حال ہو گیا کہ حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے زیادہ محبوب اور باعزت میری نگاہوں میں اور کوئی نہیں رہا، بلکہ حضور ﷺ کا میرے دل میں اتنا زیادہ احترام تھا کہ مَیں آنکھیں بھر کر حضور ﷺ کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر کوئی مجھے پوچھے کہ حضور ﷺ کے چہرۂ انور کی کیفیت بیان کرو تو مَیں بیان نہیں کر سکتا، کیوں کہ میں کبھی حضورِ اکرم ﷺ کو نظر بھر کر دیکھ ہی نہیں سکتا تھا؛ پھر کیسے بیان کروں؟ (جو چیز آدمی غور سے اور پورے اطمینان سے دیکھے اس کو بیان کر سکتا ہے، اور جس کو پورے اطمینان سے نہ دیکھ پاتا ہو، تو کیسے بیان کرے گا) اگر اس وقت میری موت آ گئی ہوتی تو مجھے امید تھی کہ یقیناً میں جنتی ہوتا۔

اس کے بعد بہت سارے اختیارات ہمارے حوالے کئے گئے (یعنی بعد میں حکومت

ہمارے ہاتھ میں آئی، کچھ اختیارات استعمال کرنے کی نوبت آئی) اس کے بعد اب میں نہیں کہہ سکتا کہ میرا حال کیا ہے۔ اس لئے دیکھو! جب میری موت ہو جائے تو کوئی رونے والی عورت اور آگ میرے جنازہ کے ساتھ نہ جائے (زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا کہ جب کسی کا جنازہ لے جاتے تھے، تو ساتھ میں آگ بھی لے جاتے تھے، اور رونے والی عورتیں سینہ اور چہرہ کوٹتی ہوئی اور مرنے والے کی خوبیاں بیان کرتی ہوئی ساتھ میں چلتی تھیں، اس لیے انہوں نے تاکید کر دی کہ میرے ساتھ ایسا نہ ہو۔ بہت سی جگہوں پر غیر مسلموں میں آج بھی ایسا رواج ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ آدمی کے مرنے کے بعد اگر اس کے خاندان والوں کی طرف سے اس بات کا اندیشہ یا رواج ہو کہ وہ کسی بدعت کا ارتکاب کریں گے، تو اس کو چاہیے کہ تاکید کے ساتھ اس بات کی وصیت کر جائے کہ میرے مرنے کے بعد ایسا کچھ مت کرنا، اس کے بعد بھی اگر وہ کریں گے تو مرنے والے پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں رہے گی) اور جب مجھے دفن کر چکو تو میری قبر پر مٹی ڈال دینا، پھر میری قبر کے پاس اتنی دیر تک ٹھہرنا جتنی دیر میں ایک اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کر دیا جاتا ہے (تقریباً بیس پچیس منٹ) تاکہ تمہارے ذریعہ مجھے اُنس حاصل ہو، اور میں دیکھ لوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے فرشتوں کو مَیں کیا جواب دیتا ہوں۔ چوں کہ دفن کے بعد فوراً فرشتے آتے ہیں تو اس وقت اہلِ خاندان کو چاہیے کہ قبر کے پاس بیس پچیس منٹ ٹھہریں اور کلمۂ طیبہ کا ورد کریں، تلاوتِ قرآن میں مشغول رہیں اور مرنے والے کے لیے دعا کا اہتمام کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کو منکر نکیر کے سوال کے جواب میں ثبات قدمی نصیب کرے اور اس سے صحیح جواب دلوائے؛ یہ مناسب ہے، بہر حال! یہاں تو اس روایت کو اس بنیاد پر لائے ہیں کہ ان کے صاحبزادہ نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشادات کے مطابق ان کو بشارت سنائی، اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں کو خوشخبری دینا اور بشارت سنانا ثابت ہے۔

باب وداع الصاحب ووصيته عند فراقه للسفر وغيره والدعاء لَهُ وطلب الدعاء مِنْهُ

اپنے کسی ساتھی اور دوست کو رخصت کرتے وقت نصیحت کرنا

اس کے لیے دعا کرنا

اور اس سے دعا کی درخواست کرنا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَوَصَّى بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَابَنِيَّ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَى لَكُمُ الدِّينَ فَلاَ تَمُوتُنَّ إِلاَّ وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ. أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ، إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي؟ قَالُوا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلٰهاً وَاحِداً وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (البقرة:۱۳۳،۱۳۲)

جدائی کے موقع کے چار آداب

باب کا عنوان ہے: اپنے ساتھی، عزیز، اپنی اولاد یا اپنے ملنے والوں کو جدائی کے موقع پر الوداع کہنا، اور جو نصیحت کی بات ان کے مناسبِ حال ہو وہ کہنا۔ جدائی چاہے سفر کی وجہ سے ہو رہی ہو، پھر وہ سفر تجارتی ہو، حج کا ہو، تبلیغ کی غرض سے ہو، یا طلبِ علم کے لیے ہو، یا وہ جدائی کسی اور وجہ سے ہو رہی ہو، جیسے: ایک آدمی بالکل آخری گھڑی میں ہے اور وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اب میں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جدائی چاہے وقتی ہو، یا مستقل ہو، جب بھی اپنے عزیزوں، رفقاء اور دوستوں سے جدائی کی گھڑی آئے، تو آداب میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ ان کو الوداع کہے، اور دوسرا ادب یہ ہے کہ ان کو وصیت، تاکیدی نصیحت اور بھلائی کی بات کہے جو ان کے مناسبِ حال ہو۔

''وصیت'' دراصل اس نصیحت کی بات کو کہتے ہیں جو کوئی آدمی کسی کو رخصت کے وقت کرتا ہے۔ ویسے روزانہ عام حالات میں جو کہا جاتا ہے اس کو نصیحت کہیں گے، لیکن یہی نصیحت کی بات جب جدائی کے موقع پر- چاہے جدائی وقتی ہو یا ہمیشہ کی ہو- کہی جاتی ہے تو اس کو ''وصیت'' سے تعبیر کرتے ہیں جس میں تاکید زیادہ ہوا کرتی ہے۔

تو یہ چاروں چیزیں آداب میں سے ہیں:-

[۱]:-الوداع کہنا۔

[۲]:- کچھ نصیحت کرنا۔

[۳]:-اس کے لیے دعا کرنا۔

[۴]:-اپنے واسطے اس سے دعا کی درخواست کرنا۔

ان کا بھی ہمیں اپنی زندگیوں میں اہتمام کرنا چاہیے، اسی کو بتلانے کے لیے یہ باب قائم کیا ہے۔

دو پیغمبروں کی اپنے بیٹوں کو وصیت

اس سلسلہ میں سورۂ بقرہ کی دو آیتیں پیش کی ہیں۔ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کو دین پر قائم رہنے اور کلمہ کو مضبوطی سے پکڑنے کی وصیت کی تھی، چناں چہ ان کی وصیت کے الفاظ ذکر کیے: اے میرے بیٹو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا ہے (تم کو دینِ اسلام کی توفیق عطا فرمائی، اس کی ہدایت عطا فرمائی جس کی وجہ سے تم نے اس دین کو قبول کیا، اور اب تک اسی پر قائم ہو، اسی پر عمل کر رہے ہو) تو اب تمہاری موت نہ آئے مگر ایسی حالت میں کہ تم اسلام ہی پر قائم ہوؤ۔ گویا دینِ اسلام کو مضبوطی سے تھامے رہنا، اور مضبوطی سے تھامنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اپنی زندگیوں میں عملی جامہ پہناؤ کہ تمہارا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا، چلنا پھرنا؛ غرضیکہ تمہاری ہر حرکت وسکون اور تمہارا ہر کام اسی کے مطابق ہو، تب ہی کہا جائے گا کہ تم اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے ہو۔

اور پھر اسی حال میں تمہیں موت آئے، اس لیے کہ اگر آدمی یہ چاہتا ہے کہ فلاں

حالت میں مجھے موت آئے، تو ظاہر ہے کہ موت کا کوئی وقت اور گھڑی مقرر نہیں ہے، کسی کے متعلق بھی گارنٹی کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کون سے دن، کون سی گھڑی میں، کتنے بجے موت آنے والی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی یہ چاہتا ہو کہ اس کی موت ایمان پر آئے تو اس کو چاہیے کہ ایمان کو ہمیشہ تھامے رہے، اور ایسا طریقہ اختیار کرے کہ کسی حال میں بھی اپنے آپ کو ایمان سے جدا نہ ہونے دے، اس لیے کہ معلوم نہیں کب موت آجائے۔ جب ایمان کو ہمیشہ کے لیے تھامے رکھے گا، تو ظاہر ہے کہ جب بھی موت آئے گی اسی حالت میں آئے گی۔ جیسا کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے: "تَمُوْتُوْنَ كَمَا تَعِيْشُوْنَ، وَتُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ (تفسیر روح البیان)" موت اسی حالت میں آئے گی جس حالت میں تم زندگی گزارتے ہو، اور جس حالت میں موت آئے گی اسی میں تم اٹھائے جاؤ گے۔ کوئی آدمی اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کی حالت میں زندگی گزارتا ہے، تو موت بھی اسی حالت میں آئے گی۔ اور اگر کوئی آدمی معصیت اور نافرمانی کی حالت میں زندگی گزارتا ہے، گناہوں میں لت پت ہے، اسی میں مشغول ہے تو ظاہر ہے کہ موت بھی اسی حالت میں آئے گی۔ اس لیے اگر آپ چاہتے ہیں کہ اچھی حالت میں موت آئے، تو اپنا حال درست کرلو، پھر اسی حال پر مروگے۔ اور جس حالت میں موت آئے گی اسی حالت میں تم اُٹھائے جاؤ گے۔ اگر اچھی حالت میں موت آئی ہے تو اچھی حالت میں اٹھائے جاؤ گے اور اگر خدانخواستہ بری حالت میں موت آئی ہے تو بری حالت میں اٹھائے جاؤ گے۔

دیکھو! حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کو جو وصیت فرمائی، اپنی موت کے وقت جو تاکید فرمائی وہ یہ تھی کہ: دین کا دامن تھامے رکھیو، دین کو ہاتھ سے جانے مت دینا، اس پر مضبوطی سے قائم رہنا۔

بیانِ واقعہ کا نرالا انداز

خاص طور سے حضرت یعقوب علیہ السلام کا قصہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ذکر کیا، تو ہمیں غور کرنا ہے کہ کیوں ذکر کیا؟ ظاہر ہے کہ قرآنِ پاک میں ماضی کے واقعات تاریخی حیثیت سے نہیں ذکر کئے جاتے بلکہ اس کا مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ ہمیں عبرت حاصل ہو، اور اس سے کچھ سبق لیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس واقعہ کو ایک عجیب ونرالے انداز سے قرآنِ پاک میں ذکر کیا، باری تعالیٰ سوال کرتے ہیں کہ:
﴿أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ﴾ کیا تم لوگ اس وقت موجود تھے جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت آیا؟ یہ آیت حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی، تو اس کے سب سے پہلے مخاطب حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور آپ کے واسطے سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد قیامت تک آنے والی پوری امتِ محمدیہ ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا زمانہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے سیکڑوں سال پہلے کا ہے تو ان کی موت کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں کیسے موجود ہوتے؟ نہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت موجود تھے، نہ صحابۂ کرام موجود تھے، اور نہ ہم آپ موجود تھے۔ دراصل یہ انداز اختیار فرما کر آگے جو بات کہی جانے والی ہے اس کی اہمیت اور تاکید بتانا مقصود ہے، جیسے کوئی واقعہ اور حادثہ آپ کے سامنے پیش آیا ہو تو اس کو بیان کرنے کا ایک انداز یہ ہوتا ہے کہ بھائی! فلاں نے فلاں کو جو بات کہی تھی اس وقت تم وہاں تھے؟ وہ کہے گا کہ نہیں! میں وہاں موجود نہیں تھا، تو آپ کہیں گے کہ میں وہاں تھا، اس لیے میں بتلاتا ہوں کہ کیا ہوا تھا۔ یہ انداز دراصل سامنے والے کو کسی چیز کی طرف متوجہ کرنے کے واسطے ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ نے بھی یہاں وہی انداز اختیار کیا۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ نے لوگوں کو سمجھانے کے واسطے سارے انداز اور طریقے وہی اختیار کئے جو آپس کی بات چیت میں اختیار کئے جاتے ہیں۔ کسی آدمی کو متوجہ کرنے کے لیے یہ بھی ایک انداز اور طریقہ ہے جو اپنایا جاتا ہے۔ گویا باری تعالیٰ یہ سوال کرتے ہیں کہ جس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت آیا اس وقت آپ لوگ وہاں موجود تھے؟ ظاہر ہے کہ موجود نہیں تھے، تو باری تعالیٰ فرمانا چاہتے ہیں کہ میں تھا، بتاؤں کہ کیا ہوا تھا؟ اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ فرماتے ہیں کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی موت کی گھڑی آئی تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو جمع کیا اور ان سے سوال کیا۔

خاندانِ نبوت

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا معلوم ہو جانا چاہیے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کون تھے؟ آپ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ بنو اسرائیل پورا ایک خاندان ہے جن کے اندر سینکڑوں انبیاءِ کرام مبعوث ہوئے، اس لیے کہ ان کے بعد سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے بھی نبی آئے وہ سب بنو اسرائیل ہی میں آئے۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام ہی کا دوسرا نام ہے، ان کے بارہ بیٹے تھے انہی سے بارہ خاندان پھیلے، انہی کی ساری اولاد کو بنو اسرائیل کہا جاتا ہے، پھر ان بنو اسرائیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو خصوصی معاملہ ہوا وہ بھی عجیب وغریب ہے، اور اسی خاندان میں نبوت کا سلسلہ جاری رہا۔ اور دیکھئے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام خود اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، ان کے والد حضرت اسحاق علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، ان کے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی ہیں جن کو ابوالانبیاء کہا جاتا ہے، اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے بعد دنیا

میں جتنے بھی انبیاء آئے وہ سب کے سب انہی کی نسل سے ہیں۔ اور ان کے چچا حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی نبی ہیں؛ گویا پورا گھرانہ نبوت کا گھرانہ ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ وہاں کون سی چیز کے چرچے ہوں گے! جیسے: تاجر گھرانہ میں تجارت کے چرچے ہوتے ہیں کھیتی باڑی والے گھرانہ میں کھیتی باڑی کے چرچے ہوتے ہیں، جیسا گھرانہ ہوتا ہے اس میں ویسے ہی چرچے ہوتے ہیں؛ تو آخر ان کا کام کیا تھا؟ پورے خاندان کا کام ہی لوگوں کو اللہ کی توحید اور نبی کی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دینا تھا، ان کی زندگیاں اسی میں گزرتی تھیں، اپنی صلاحیتوں کو اسی کے لیے استعمال کرتے تھے اور اسی کے لیے ساری مشقتیں اُٹھاتے تھے، گویا ان کی زندگی کا مقصد اور مشن یہی تھا۔

فکر کیا کرے؟

نیز سوچنے کی بات یہ ہے کہ باپ خود اللہ کے نبی ہیں اور ان بارہ بیٹوں میں سے ایک حضرت یوسف علیہ السلام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، تو باپ اپنے بیٹوں کو - جن میں ایک اللہ کے نبی موجود ہیں - جمع کر کے وصیت کر رہے ہیں اور اس میں یہ سوال کر رہے ہیں: ''مَا تَعۡبُدُونَ مِنۢ بَعۡدِی؟'' اے میرے بیٹو! تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ بھی کوئی کرنے کا سوال تھا؟ ظاہر ہے کہ ان کے گھر میں دعوت کے چرچے ہوتے تھے، ان کی زندگیاں اسی میں کھپ گئی تھیں، ساری صلاحیتیں اسی میں استعمال ہوئی تھیں، اب موت کے وقت بیٹوں سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ میرے بعد تم کس کی پوجا کرو گے!

یہ ایک واقعہ پہلے پیش آیا ہے، تو آخر اس واقعہ کو قرآنِ پاک میں کو خصوصیت کے ساتھ ایک نرالے انداز میں کیوں ذکر کیا گیا؟ دراصل اس سے ہم لوگوں یعنی

قیامت تک آنے والی امتِ محمد یہ کو ایک سبق دینا منظور ہے کہ ایک آدمی جب دنیا سے جارہا ہو تو اس کو اپنی اولاد اور اپنے خاندان کے متعلق اگر فکر کرنی ہے تو کیا کرے؟

آج کے دَور کی تصویر کشی

ہم اور آپ تصور کریں کہ کسی کو معلوم ہو جائے کہ میرے دنیا سے جانے کا وقت آچکا ہے، ڈاکٹروں نے بھی کہہ دیا، اپنی صحت کو دیکھتے ہوئے خود اس کو بھی اندازہ ہو گیا، گھر والے بھی سمجھ رہے ہیں کہ یہ زیادہ دنوں کا مہمان نہیں ہے، دس بارہ گھنٹہ کی مہمانی ہے، ایسے وقت میں وہ سب کو جمع کرے کہ فلاں بیٹا دبئی میں ہے، فلاں سعودیہ میں ہے، فلاں انگلینڈ میں ہے؛ ان سب کو بلالو۔ آج اگر کوئی آدمی اپنی اولاد کو جمع کرے تو ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سچ بتاؤ کہ وہ کیا کہے گا؟ باپ اگر فیکٹری کا مالک ہے تو کہے گا کہ دیکھو بیٹا! بڑی محنت سے میں نے یہ فیکٹری قائم کی ہے، اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے، اپنی ساری زندگی اس کے اندر لگائی ہے، دیکھنا! میرے بعد اس کو برباد مت کر دینا، دشمنوں کو ہنسنے کا موقع مت دینا، بلکہ اور زیادہ ترقی ہو ایسی شکلیں اختیار کرنا، مل جل کر کے کام کرنا۔ یہی کہے گا نا!

اگر وہ کسان ہے اس کی کئی ایکڑ زمین ہے تو وہ کہے گا: یہ ساری زمینیں، یہ سب باغات جو نظر آرہے ہیں، یہ سب کچھ نہیں تھا، بنجر پڑا ہوا تھا، میں نے بڑی محنتیں کی ہیں، رات دن اس کے پیچھے ایک کر دیا ہے، اب یہ سب تمہارے لیے چھوڑ کر جارہا ہوں، دیکھنا! کہیں برباد نہ کر دینا۔ آج اگر کوئی آدمی نصیحتیں کرے گا تو یہی کرے گا، اور کیا کرے گا؟ ہمارا مزاج ہی ایسا بنا ہوا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ قرآنِ پاک میں ذکر کر کے بتلایا کہ یہ سب چیزیں وصیت کی نہیں ہیں کہ فیکٹریوں میں اضافہ کرنا،

زمینوں کو ترقی دینا، تجارت بڑھا دینا، آج اگر دس لاکھ کا ٹرن اوور (TurnOver) ہے تو پچاس لاکھ کا کر دینا؛ بلکہ فکر کی چیز اگر ہے تو یہ ہے کہ میرے بعد میری اولاد کون سا دین اختیار کرے گی؟ کس کی عبادت کرے گی؟

حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے کیا یہ گمان ہوسکتا تھا کہ وہ کسی اور خدا کی عبادت کریں گے؟ یہ تو نبیوں کی اولاد تھی، ان کا باپ نبی، دادا نبی، پردادا نبی، دادا کا بھائی نبی؛ پھر بھی حضرت یعقوب علیہ السلام ان سے پوچھ رہے ہیں کہ میرے بعد کس کی پوجا کروگے؟ ان سے اور کچھ توقع کی ہی نہیں جاسکتی تھی، اس کے باوجود تاکید کے واسطے پوچھا جارہا ہے، اور بیٹوں نے بھی جو جواب ان کی شایانِ شان تھا وہی دیا: ''نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰـهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ'' ابا جان! آپ بے فکر رہیے، آپ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد آپ کے معبود ہی کی ہم عبادت کریں گے۔ پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے آباء واجداد حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہم السلام کا جو معبود ہے اسی کی عبادت کریں گے، وہ کون ہے؟ ''إِلٰهاً وَاحِداً'' وہی ایک معبود اللہ تعالیٰ۔ اس طرح پوری وضاحت کردی گئی، اب اس کے بعد تو کچھ پیچیدگی باقی ہی نہیں رہی تھی، پھر بھی آگے فرمایا: ''وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ'' اور ابا جان! ہم اسی کا حکم مانیں گے، اور اسی کی بات پر چلیں گے۔ اس طرح سے بیٹوں نے اپنے والد کو مکمل اطمینان دلا دیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام جیسے پیغمبر کو اپنی اولاد کے متعلق -جن میں ایک اللہ کا نبی ہے- یہ فکر لاحق ہے کہ میرے بعد میری اولاد کس کی عبادت کرے گی، اور کون سا دین اختیار کرے گی؛ تو کیا اِس زمانہ میں ہمیں اپنی اولاد کے متعلق یہ فکر نہیں ہونی چاہیے؟ آج تو اس فکر کی اور زیادہ سخت ضرورت ہے۔ اس لیے

حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری طرف سے اس کا اہتمام ہونا چاہیے، اور ایسی وصیت سے پہلے اولاد کے لیے ایسی کوشش بھی ہونی چاہیے۔

اب آگے وصیت کے متعلق کچھ روایتیں پیش کرتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت

۷۱۲:-فمنها حديث زيد بن أرقم رضي الله تعالى عنه -الَّذِي سبق في بَابِ إكرام أَهْلِ بَيْتِ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم- قَالَ: قَامَ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فِينَا خَطِيباً، فَحَمِدَ الله، وَأَثْنَى عَلَيْهِ، وَوَعَظَ وَذَكَّرَ، ثُمَّ قَالَ: ((أَمَّا بَعْدُ، أَلاَ أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ رَسُولُ رَبِّي فَأُجِيبَ، وَأَنَا تَارِكٌ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ، أَوَّلُهُمَا: كِتَابُ اللهِ، فِيهِ الْهُدَى وَالنُّورُ، فَخُذُوا بِكِتَابِ اللهِ وَاسْتَمْسِكُوا بِهِ))، فَحَثَّ عَلَى كِتَابِ اللهِ، وَرَغَّبَ فِيهِ، ثُمَّ قَالَ: ((وَأَهْلُ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي)) (رواه مسلم، وَقَدْ سَبَقَ بِطُولِهِ.)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے درمیان خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، پہلے آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان فرمائی اور لوگوں کو نصیحت کی، اللہ تعالیٰ کی یاد دلائی، اور فرمایا: حمد وصلوٰۃ کے بعد! اے لوگو، سنو! میں ایک انسان ہوں، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایلچی اور بلانے والا میرے پاس آئے اور میں اس کے بلاوے پر لبیک کہوں (یعنی موت کا فرشتہ آئے گا تو مجھے دنیا سے جانا ہوگا) اس لیے میں تمہارے درمیان دو مضبوط چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں (ان کو اگر تم مضبوطی سے پکڑ لو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے) ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب (یعنی قرآن پاک کہ) اسی میں ہدایت کا راستہ، لوگوں کے لیے رہنمائی اور روشنی موجود ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پکڑو اور مضبوطی کے

ساتھ اس کو تھامے رہو (مطلب یہ ہے کہ اس پر عمل کرو۔ پکڑنے اور تھامنے سے ہاتھ میں پکڑنا مراد نہیں ہے، بلکہ عمل کرنا مراد ہے) چناں چہ نبیٔ کریم ﷺ نے لوگوں کو قرآنِ پاک پر عمل کے لیے خوب ابھارا اور ترغیب دی۔ اور دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں، کہ ان کے سلسلہ میں مَیں تمہیں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں (یعنی ان کے حقوق کو بھی ادا کرنا)

دیکھو! یہاں نبیٔ کریم ﷺ کو جب یہ اندازہ ہوا کہ میرے دنیا سے جانے کا وقت اب قریب آ رہا ہے تو آپ نے امت کو یہ وصیت فرمائی، اسی مناسبت سے اس روایت کو یہاں پیش کیا ہے۔

مناسبِ حال معاملہ اور نصیحت

۷۱۳:- وعن أبي سليمان مالك بن الحُوَيْرِث رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: أَتَيْنَا رسولَ الله ﷺ وَنَحْنُ شَبَبَةٌ مُتَقَارِبُونَ، فَأَقَمْنَا عِنْدَهُ عِشْرِينَ لَيْلَةً، وَكَانَ رسولُ الله ﷺ رَحِيماً رَفِيقاً، فَظَنَّ أَنَّا قد اشْتَقْنَا أَهْلَنَا، فَسَأَلَنَا عَمَّنْ تَرَكْنَا مِنْ أَهْلِنَا، فَأَخْبَرْنَاهُ، فَقَالَ: ((ارْجِعُوا إِلَى أَهْلِيكُمْ، فَأَقِيمُوا فِيهِمْ، وَعَلِّمُوهُمْ وَمُرُوهُمْ، وَصَلُّوا صَلاَةَ كَذَا فِي حِيْنِ كَذَا، وَصَلُّوا كَذَا فِي حِيْنِ كَذَا، فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلاَةُ فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ وَلْيَؤُمَّكُمْ أَكْبَرُكُمْ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

زاد البخاري في رواية لَهُ: ((وَصَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي)).

وَقَوْلُه: ((رحِيماً رَفِيقاً)) رُوِيَ بِفاءٍ وقافٍ، وَرُوِيَ بقافين.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت مالک بن حُوَیرِث رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ (یعنی یہ اور ان کے قبیلہ کے کچھ نوجوان) نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے حال یہ کہ ہم سب ہم عمر اور نوجوان تھے (یہ لوگ اپنے علاقہ سے خاص دین سیکھنے کے لیے

حاضر ہوئے تھے) ہم نے نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں بیس روز قیام کیا، اور نبیٔ کریم ﷺ بڑے مہربان اور نرم دل تھے۔ جب بیس روز ہو گئے تو حضورِ اکرم ﷺ نے محسوس کیا کہ ہمارے دلوں میں ہمارے گھر والوں کا شوق پیدا ہوا ہے (ایسا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب ان کو گھر والے یاد آرہے ہیں) تو حضور ﷺ نے ہم سے پوچھا کہ تمہارے گھر پر کون کون ہے؟ (ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے؛ یہ ساری تفصیلات حضور ﷺ نے پوچھیں) ہم نے آپ کو سب تفصیل بتلائی (تو حضور ﷺ سمجھ گئے کہ ان کو گھر کی یاد آرہی ہے اس لیے کہ بیس دن ہو گئے تھے) تو حضور ﷺ نے از خود ارشاد فرمایا: بھائیو! تم لوگ گھر جاؤ (اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم و تربیت اور تبلیغ وغیرہ امور کے اندر جس آدمی کو لگایا جائے اس میں اس کے مزاج اور اس کی طبیعت کے تقاضوں کا بھی خیال رکھا جائے، ان سے ہٹ کر اگر کچھ کرنے جاؤ گے تو پھر یہ چیز نبھے گی نہیں، اور اس میں استقامت نہیں ہوگی۔ دیکھو! ان کو فقط بیس دن گزرے تھے، لیکن نبیٔ کریم ﷺ نے ان کے مزاجوں سے محسوس کیا کہ اب ان کے دلوں میں گھر کا خیال آرہا ہے، تو حضور ﷺ نے از خود پوچھ لیا کہ گھر پر کس کو چھوڑ کر آئے ہو، ساری تفصیل سننے کے بعد آپ نے فیصلہ کیا کہ اب تم لوگ گھر جاؤ) اور اپنے خاندان کے لوگوں میں قیام کرو، اور (یہاں جو سیکھا ہے وہ) ان کو سکھاؤ (مقامی کام کرو) ان کو اللہ کی باتوں کا حکم کرو، اور فلاں وقت میں فلاں نماز اور فلاں وقت میں فلاں نماز پڑھو (پانچوں وقت کی نماز کے اوقات بتلائے) اور جب نماز کا وقت آئے تو ایک آدمی اذان کہے، اور تم میں جو بڑا ہے وہ تمہاری امامت کرائے۔

افادات:- دیکھو! جب یہ لوگ رخصت ہو رہے تھے تو نبیٔ کریم ﷺ نے ان کو نماز کی اور خاندان والوں کو دین سکھلانے کی تاکید فرمائی، اور نماز کا طریقہ بتلایا۔ اس روایت کو لا کر بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ جب کسی سے جدائی کا وقت آئے تو اس کے

مناسبِ حال نصیحت کرنی چاہیے۔ جیسے: آپ اپنے بچے کو مدرسہ میں پڑھنے کے لیے بھیج رہے ہوں تو ظاہر ہے کہ اس کے مناسبِ حال بات یہی ہے کہ اس سے کہا جائے کہ بیٹا! وہاں جا کر محنت سے پڑھنا۔ اگر آپ کا لڑکا بڑا ہے اور وہ تجارتی سفر کے لیے بیرون جا رہا ہے، یا ملک ہی میں کہیں لمبی ٹور پر جا رہا ہے، تو اس کے مناسب آپ نصیحت کریں گے، مثلاً: سفر میں نماز کا خیال رکھنا، اپنے آپ کو گناہوں سے بچانا، برائیوں سے دور رہنا، اور اپنے کام کی طرف توجہ دینا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ جب بھی کسی سے جدائی کا وقت آئے، تو اس کو اس کے مناسبِ حال نصیحت کی جائے، خاص طور پر دین کی حفاظت کی طرف توجہ دلائی جائے۔

اپنی دعاؤں میں ہمیں مت بھولیو

۷۱۴:-وعن عمرَ بن الخطاب رضی اللہ تعالےٰ عنہ قَالَ: اسْتأذَنْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم في العُمْرَةِ فَأَذِنَ، وقال: ((لاَ تَنْسَانَا يَا أُخَيَّ مِنْ دُعَائِكَ)) فقالَ كَلِمَةً ما يَسُرُّنِي أنَّ لِي بِهَا الدُّنْيَا ۔ وفي رواية قَالَ: ((أَشْرِكْنَا يَا أُخَيَّ في دُعَائِكَ))

(رواہ أبو داود والترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عمرہ کے لیے جانے کی اجازت طلب کی، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت مرحمت فرمائی، اور کہا: اے میرے پیارے بھائی! اپنی دعاؤں میں ہمیں مت بھولیو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا جملہ ارشاد فرمایا کہ ساری دنیا ملتی تو اس سے وہ خوشی نہ ہوتی جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوئی۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ بڑا بھی اپنی چھوٹے سے دعا کی درخواست کرے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کوئی آدمی کسی ایسی جگہ پر جا رہا ہو جس

کے متعلق یہ گمان ہو کہ وہاں دعا قبول ہوتی ہے، تو ان جانے والوں سے دعا کی درخواست کرنی چاہیے۔ باب کے عنوان میں یہ بھی تھا: ان کے لیے دعا کرنا اور ان سے اپنے لیے دعا کی درخواست کرنا۔ تو کوئی آدمی کسی بھی سفر میں جارہا ہو تو چوں کہ مسافر کی دعا قبول ہوتی ہے، تو اس سے بھی دعا کی درخواست کی جائے۔

کسی کو رخصت کرتے وقت کی دعائیں

۷۱۵:-وعن سالم بنِ عبدِ الله بنِ عمر: أنَّ عبدَ اللهِ بن عُمَرَ رضی اللہ عنہما كَانَ يَقُولُ للرَّجُلِ إِذَا أَرَادَ سَفَراً: أُدْنُ مِنِّي حَتَّى أُوَدِّعَكَ كَمَا كَانَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يُوَدِّعُنَا، فَيَقُولُ: ((أَسْتَوْدِعُ اللهَ دِينَكَ، وَأَمَانَتَكَ، وَخَوَاتِيمَ عَمَلِكَ))

(رواه الترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت سالم- جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے ہیں ان- سے روایت ہے کہ جب کوئی آدمی سفر کا ارادہ رکھتا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آتا تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے کہ: مجھ سے قریب آؤ تاکہ میں تم کو اسی طرح رخصت کروں جس طرح نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم کو رخصت فرماتے تھے، پھر یہ دعا دیتے تھے: **"میں اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دیتا ہوں تیرے دین کو، تیری امانت کو، اور تیرے اعمال کے انجام کو"** (اور جو چیز اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دی جائے وہ کبھی ضائع نہیں ہوا کرتی)

افادات:- معلوم ہوا کہ سفر میں جانے والے اپنے ساتھیوں کو اپنے پاس سے اس طرح رخصت کرنا چاہیے۔

۷۱۶:-وعن عبدِ الله بن يزيدَ الخَطْمِيِّ الصحابِيِّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: كَانَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم إِذَا أَرَادَ أَنْ يُوَدِّعَ الجَيْشَ، قَالَ: ((أَسْتَوْدِعُ اللهَ دِينَكُمْ،

وَأَمَانَتَكُمْ، وَخَواتِيمَ أَعْمَالِكُمْ)) (حدیث صحیح، رواه أبو داود وغيره بإسناد صحيح.)

اس روایت میں بھی اوپر والی دعا کا تذکرہ ہے کہ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی لشکر کو رخصت فرماتے تھے تو یہی دعا دیتے تھے۔

۷۱۷:-وعن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَقَالَ: يَا رسولَ الله! إِنِّي أُرِيدُ سَفَراً، فَزَوِّدْنِي، فَقَالَ: ((زَوَّدَكَ اللهُ التَّقْوَى)) قَالَ: زِدْنِي قَالَ: ((وَغَفَرَ ذَنْبَكَ)) قَالَ: زِدْنِي، قَالَ: ((وَيَسَّرَ لَكَ الْخَيْرَ حَيْثُمَا كُنْتَ))

(رواه الترمذي، وقال: حديث حسن)

ترجمہ مع مختصر تشریح:-حضرت أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں سفر کا ارادہ رکھتا ہوں، آپ مجھے (دعا اور نصیحت کا) توشہ دیجیے۔ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تجھے تقویٰ سے مالا مال فرمائے (اس سے معلوم ہوا کہ سفر کرنے والے کو دعا دینی چاہیے) اس نے پھر درخواست کی کہ: اے اللہ کے رسول! مزید (دعا) دیجیے۔ تو نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تیرے گناہوں کو معاف کرے۔ اس نے پھر درخواست کی کہ: کچھ اور (دعا) دیجیے، تو نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو جہاں کہیں بھی رہے اللہ تعالیٰ تیرے لیے بھلائی کے راستے آسان کردے۔

افادات:-اوپر نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دعا کی درخواست کی تھی اور یہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا دی۔ معلوم ہوا کہ جو رخصت ہو رہا ہو اس کو دعا دینی بھی چاہیے اور اس سے دعا کی درخواست بھی کرنی چاہیے۔ یہ بھی آداب میں سے ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

الاستِخارة والمشاورة

استخارہ اور مشورہ کرنا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللہ تَعَالَی: وَشَاوِرۡھُمۡ فِی الۡأَمۡرِ (آل عمران: ۱۵۹)

وقال تَعَالَی: وَأَمۡرُھُمۡ شُوۡرَی بَیۡنَھُمۡ (الشوریٰ: ۳۸) أي: یَتَشَاوَرُوۡنَ بَیۡنَھُمۡ فِیۡهِ.

مشورہ کی اہمیت

دو چیزیں ہیں: استخارہ اور مشورہ۔ استخارہ؛ اللہ تبارک وتعالیٰ سے کیا جاتا ہے، اور مشورہ؛ امانتدار، سمجھدار، خیرخواہ اور تجربہ کار آدمی سے کیا جاتا ہے۔ مشورہ کے سلسلہ میں آیت پیش کی ہے: وَشَاوِرۡھُمۡ فِی الۡأَمۡرِ (آل عمران: ۱۵۹) اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا حکم دیا کہ اہم معاملات میں آپ حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیجئے۔ حالاں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جو علم، عقل، سمجھ، اور سوجھ بوجھ عطا فرمائی تھی؛ وہ اعلیٰ، کامل ومکمل تھی، نوعِ انسانی میں کسی کے لیے بھی وہ علم، عقل وسمجھ اور ایسا کمال متصوّر نہیں ہوسکتا، اور ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ گویا عالَمِ غیب سے علوم کا القاء مختلف طریقوں سے ہوتا ہی رہتا تھا، اس کے باوجود اہم معاملات میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشورہ کا حکم دیا گیا۔ گویا اس طریقہ کو اللہ تعالیٰ انسانوں میں اور امتِ مسلمہ کے اندر جاری فرمانا چاہتے ہیں، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا حکم دیا گیا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی اپنی رائے چھوڑ دیتے تھے

اسی لیے اہم معاملات میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادتِ شریفہ تھی کہ مشورہ فرماتے تھے، بلکہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ کسی معاملہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی رائے

ہوتی، لیکن مشورہ میں بات رکھی گئی اور لوگوں کا زیادہ رجحان دوسری بات کی طرف دیکھا تو آپ ﷺ دوسری بات کو اختیار فرما لیتے۔ یا کسی کی طرف سے کوئی بات پیش کی گئی اور حضورِ اکرم ﷺ نے محسوس کیا کہ اسی کو اختیار کیا جانا چاہیے، تو اگرچہ آپ کی اپنی رائے دوسری ہوتی تھی، اس کے باوجود ان کی رائے کو اختیار فرما لیتے۔

غزوۂ اُحد کے مشورہ کا منظر

چناں چہ غزوۂ اُحُد کے موقع پر جب نبیٔ کریم ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ مکہ والے ایک لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کے ارادہ سے روانہ ہو چکے ہیں، تو اس لشکر کے ساتھ مقابلہ کہاں ہو؟ اس سلسلہ میں نبیٔ کریم ﷺ نے مشورہ کے لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کیا۔ مشورہ کے لیے بیٹھنے سے پہلے حضورِ اکرم ﷺ نے ایک خواب بھی دیکھا تھا کہ میں ایک محفوظ قلعہ میں ہوں، ایک گائے ذبح کی جارہی ہے، اور اپنی تلوار کو آپ نے ہلایا اور سونتا، تو اس کا اگلا حصہ ٹوٹ کر گر گیا، پھر دوبارہ اس کو حرکت دی تو وہ پہلے سے زیادہ عمدہ نظر آنے لگی۔ محفوظ قلعہ سے اشارہ مدینہ منورہ کی آبادی کی طرف تھا کہ اگر اس میں رہ کر مقابلہ کیا جائے گا تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی آدمی محفوظ قلعہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کرے، اور جو گائے ذبح ہوتے ہوئے دیکھی، اس سے اشارہ ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف تھا جو اس غزوہ کے موقع پر شہید ہوئے تھے۔ اور پہلی مرتبہ جو تلوار سونتی تو اس کا اگلا حصہ ٹوٹ گیا اس سے بھی اشارہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اسی جماعت کی طرف تھا جو شہید ہوئی، اور دوبارہ اس کو سونتا اور پہلے سے عمدہ نظر آئی، اس سے اس کے بعد کی جو کامیابیاں ملنے والی تھیں ان کی طرف اشارہ تھا۔

خیر! نبیٔ کریم ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو مشورہ کے لیے مسجدِ نبوی ہی میں جمع کیا،

اور مشورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جو بات پیش فرمائی اس سے تمام حضرات نے یہی سمجھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ ہی میں رہ کر مقابلہ کرنے کو ترجیح دے رہے اور پسند فرمارہے ہیں، خواب میں بھی اسی کی طرف اشارہ تھا، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی رائے شریف بھی یہی تھی۔

غزوۂ بدر کا مختصر خاکہ

لیکن بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جن کو غزوۂ بدر میں مقابلہ کے لیے میدان میں آنے کا موقع نہیں ملا تھا، ان کی دلی تمنائیں تھیں کہ اگر موقع ملے تو ہم بھی اللہ کے واسطے اور دینِ اسلام کے واسطے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دے کر بہادری کے جوہر دکھلائیں۔ ان کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقع اس لیے نہیں ملا تھا کہ غزوۂ بدر اچانک پیش آیا تھا، پہلے سے ایسی کوئی بات ذہنوں میں نہیں تھی کہ دشمن سے مقابلہ ہوگا۔ مکہ والوں کا ایک تجارتی قافلہ شام سے واپس آرہا تھا جس کے تعاقب میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابۂ کرام کو لے کر روانہ ہوئے تھے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھی وہم وگمان میں نہیں تھا کہ مکہ مکرمہ سے کوئی لشکر روانہ ہوگا اور اس سے مقابلہ کی نوبت آئے گی، بس اچانک مقابلہ کی نوبت آگئی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس قافلہ کے تعاقب کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہونے والے تھے، تو آپ نے اعلان فرمایا کہ کون تیار ہے؟ معلوم ہوا ہے کہ مکہ والوں کا ایک تجارتی قافلہ شام سے واپس آرہا ہے، اور مکہ جارہا ہے، اس وقت وہاں جو موجود تھے وہ اسی حالت میں تیار ہوگئے، بعضوں نے کہا کہ ہم ذرا تیاری کرلیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں! جو موجود اور تیار ہیں وہ آجائیں۔ بہر حال! تین سو تیرہ کے قریب صحابہؓ روانہ ہوئے، اور بعد میں جو ہوا وہ ہوا۔ تو یہ سب کچھ اچانک ہوا تھا، اس لیے بہت سوں کو شرکت کا موقع نہیں ملا تھا اور ان کی تمنائیں دل ہی دل میں رہ گئی تھیں۔

افسوس کا تدارک

اسی لیے بدر کے واقعہ کے بعد بعض حضراتِ صحابہ کو جیسے حضرت اُنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چچا حضرت اُنس بن نضر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تو بہت زیادہ افسوس رہ گیا تھا، وہ کہنے لگے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے دشمنوں سے پہلا ہی مقابلہ تھا، افسوس کی بات ہے کہ میں اس میں شریک نہ ہوسکا، اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے آئندہ دشمن کے مقابلہ میں آنے کا موقعہ دیا تو اللہ تعالیٰ دیکھ لیں گے کہ میں کیا کرتا ہوں، یعنی میں برابر دشمن کا مقابلہ کروں گا۔ یہ انہوں نے قسم کھا کر کہا تھا۔ اور پھر غزوۂ احد کے موقع پر انہوں بہادری کے ایسے جوہر دکھلائے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ جو انصار میں بڑے بہادر اور ایسے ہی سخت مزاج سمجھے جاتے تھے جیسے مہاجرین میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، وہ۔ فرماتے ہیں کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر ایک وقت حضرت اُنس بن نضر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تلوار لے کر آگے بڑھ رہے تھے، میرے پاس سے گزرتے ہوئے کہنے لگے: اے معاذ! کدھر چلے، میرے ساتھ چلو، اُدھر اُحد پہاڑ کی طرف جنت کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے، یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے اور دشمن کا مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: انہوں نے ایسا مقابلہ کیا تھا کہ میری بھی ہمت نہیں ہوئی۔

غزوۂ اُحد کا مشورہ

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں بہت سوں کو شرکت کا موقع نہیں ملا تھا، اس لیے ان کی دلی تمنائیں تھیں کہ آئندہ اگر ایسا موقع آئے گا تو ہم بھی اللہ کے واسطے اور دین اسلام کے واسطے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیں گے۔ اس وقت جب مشورہ کے لیے بیٹھے اور معلوم ہوا کہ مکہ سے لشکر روانہ ہوا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا رجحان اور ارادہ ظاہر فرما

دیا کہ مدینہ منورہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ چناں چہ عبداللہ بن اُبی جو منافقین کا سردار تھا اور ظاہری طور پر اسلام لے آیا تھا، وہ ایک تجربہ کار صاحبِ رائے آدمی تھا، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لانے سے پہلے مدینہ والوں نے اسی کو اپنا سردار اور بادشاہ بنانا طے کر لیا تھا، لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کر کے یہاں تشریف لائے اور اسلام پھیلا تو اس کا سارا نظام گڑبڑ ہو گیا، اسی کا تو اس کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حسد تھا کہ ان کے آنے سے میرا سارا کھیل بگڑ گیا، اسی پر وہ جلتا اور کڑھتا تھا، اور اسی وجہ سے اس میں منافقت آئی تھی۔ خیر! اس سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشورہ لیا، تو اس نے یہ مشورہ دیا کہ آج تک مدینہ کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ باہر کے کسی دشمن نے جب بھی حملہ کیا اور مدینہ کے رہنے والوں نے مدینہ میں رہ کر ان کا جواب دیا، تو مدینہ والے کبھی ناکام نہیں ہوئے اور دشمن کو ہمیشہ منھ کی کھانی پڑی۔ اور اس نے یہ بھی کہا کہ اگر اندر رہ کر مقابلہ کریں گے تو مرد تو باہر نکل کر دشمن سے لڑیں گے اور عورتیں بھی چھتوں سے دشمنوں پر پتھراؤ کر سکیں گی۔ لیکن جن کو غزوۂ بدر میں موقع نہیں ملا تھا ان کی رائے یہ تھی کہ باہر میدان میں جا کر جواب دینا چاہیے، اندر رہ کر مقابلہ کرنا تو ہماری بزدلی سمجھی جائے گی۔ نوجوان پارٹی اسی طرف تھی، اور ان کی طرف سے مطالبہ تھا کہ مدینہ منورہ سے باہر جا کر مقابلہ کیا جائے، کچھ بڑوں نے بھی اس رائے میں ان کا ساتھ دیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اگر مدینہ سے باہر جا کر مقابلہ کا فیصلہ نہ کیا گیا تو میں کھانا نہیں کھاؤں گا، جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ ان لوگوں کا شوق اور جذبہ یہ ہے، تو آپ نے فیصلہ کر دیا کہ ٹھیک ہے! مدینہ سے باہر جا کر مقابلہ کریں گے۔

وہ جمعہ کا دن تھا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو جمعہ کی نماز پڑھائی اور تقریر فرمائی، جس میں اللہ کے راستہ میں دشمن کے مقابلہ میں بہادری کے جوہر دکھلانے کے

لیے ترغیب دی، اسی میں عصر کا وقت ہو گیا، تو عصر کی نماز پڑھا کر آپ ﷺ اپنے حجرۂ مبارکہ میں تیاری کے واسطے تشریف لے گئے، جب آپ ﷺ اندر تشریف لے گئے تو یہ نوجوان جنہوں نے مدینہ منورہ سے باہر جا کر مقابلہ پر اصرار کیا تھا، ان کو دوسروں نے سمجھایا کہ حضورِ اکرم ﷺ کا رجحان کیا تھا وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا؟ تم نے بلا وجہ حضور ﷺ کی مرضی کے خلاف اتنا زور لگایا کہ آپ کو یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ مطلب یہ ہے کہ بڑوں نے ان کو ذرا ڈانٹا اور متنبہ کیا تو ان کی بھی سمجھ میں بات آئی کہ بات تو ٹھیک ہے۔ اب حضورِ اکرم ﷺ تو تیاری کے واسطے حجرۂ مبارکہ میں تشریف لے گئے تھے، اس لیے آپ ﷺ زرہ پہن کر، تلوار ہاتھ میں لے کر، ترکش اور کمان لٹکا کر میدانِ جنگ میں جانے کی پوری تیاری فرما کر جب باہر تشریف لائے، تو ان نوجوانوں نے -جن کو اصرار کرنے پر لوگوں نے سمجھایا تھا- عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہماری طرف سے آپ کی بے ادبی اور گستاخی ہوئی، آپ کا رجحان اور ارادہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، ہم لوگوں نے اصرار کیا جس کی وجہ سے آپ نے یہ فیصلہ فرمایا، اگر آپ کا ارادہ ہو تو مدینہ ہی میں رہ کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ فرما دیجیے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ کا نبی جب ایک مرتبہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے میدان میں نکلیں گے، تو پھر مقابلہ کیے بغیر واپس نہیں لوٹتا، اب تو میں تیار ہو کر آ گیا ہوں۔ اسی کو قرآنِ پاک میں بتلایا گیا: ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ﴾ پہلے اچھی طرح مشورہ کر لو، پھر جب کوئی فیصلہ کر لیا اور ارادہ مضبوط ہو گیا؛ تو اب اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔

اس کو مشورہ کہتے ہیں

آج کل تو ایک مصیبت یہ بھی ہو گئی کہ مشورہ مشورہ نہیں رہا، بلکہ پہلے سے فیصلہ کر لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں طلبہ کا کوئی معاملہ پیش آتا ہے اور مہتمم صاحب کو لگتا

ہے کہ یہ قابو میں نہیں آئے گا، تو مہتمم صاحب ان سے کہتے ہیں کہ جا کر مفتی صاحب سے مشورہ کرلو۔ وہ میرے پاس آتے ہیں، جب میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہوا؟ تو وہ پوری بات بیان کر دیتے ہیں کہ ایسا ایسا ہوا ہے، اور ایسا کرنے کا ارادہ ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ آپ نے تو فیصلہ کرلیا، اب مشورہ کس بات کا کرنے آئے ہو؟ جب ایک چیز طے کرلی، تو اب مشورہ کا سوال ہی نہیں رہا۔ مشورہ کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ نے کوئی چیز طے نہیں کی، بلکہ پہلے اپنی بات رکھ دی، اب اس پر لے دے ہوگی، اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے؛ اس کو مشورہ کہتے ہیں۔

اس کا نام مشورہ نہیں

لیکن آج کل عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اپنی طرف سے ایک چیز کا فیصلہ کرلیا جاتا ہے، پھر دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کے واسطے مشورہ ہوتا ہے کہ میں فلاں مولانا صاحب کے پاس گیا تھا تو انہوں نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا۔ ارے بھائی! تم کو تو یہی کرنا تھا، بس مشورہ کا تو بہانہ ہے، اس کا نام مشورہ نہیں ہے۔ مشورہ تو یہ ہے کہ آدمی کوئی فیصلہ نہ کرے، اپنی بات پوری دیانتداری کے ساتھ ان کے سامنے رکھ دے۔ اتنا ضروری ہے کہ جس سے مشورہ کیا جائے وہ آدمی امانتدار ہو، حدیثِ پاک میں آتا ہے: "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" (سنن ابوداود: بابٌ فِي الْمَشُوْرَةِ) اور جس سے مشورہ لیا جارہا ہے اس کی بھی ذمہ داری ہے کہ مشورہ لینے والے کے حق میں جس چیز کو وہ بہتر سمجھتا ہو اسی چیز کا مشورہ دے، چاہے اس میں مشورہ دینے والے کا بھی نقصان ہوتا ہو۔

مشورہ کے بعد کیا ہوا فیصلہ نہ بدلے

خیر! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مشورہ میں پہلے سے فیصلہ نہیں کیا جاتا اور فیصلہ

کر لینے کے بعد اس کو بدلا نہیں جاتا۔ ہمارے یہاں ایک مصیبت یہ بھی ہوگئی ہے کہ فیصلہ کر لینے کے بعد بیوی نے کچھ کہہ دیا، عورتوں نے دو باتیں کہہ دیں کہ یوں کرو تو پہلا فیصلہ بدل دیتے ہیں کہ اچھا چلو! یوں کر لیتے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کوئی تیسرا آیا اس نے کچھ اور کہا تو پھر فیصلہ بدل دیا، اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ہمارے کسی کام میں برکت نہیں ہوتی۔ اسلام کا طریقہ یہ نہیں ہے۔ اس لیے پہلے سے اچھی طرح مشورہ ہونا چاہیے، اور اس مشورہ میں جب ایک فیصلہ ہوگیا تو اب دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے، لیکن آپ اسی فیصلہ کے مطابق چلیے، سیدھی سادی بات ہے ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ﴾ جب فیصلہ کر لیا تو اب اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے آگے بڑھو۔

عورتوں سے مشورہ

عام طور پر جب عورتوں کے سامنے بات آتی ہے تو پھر بڑے بڑے سمجھدار بھی اپنا فیصلہ بدل ڈالتے ہیں، اگر ان سے مشورہ کرنا ہے تو پہلے سے ان کے سامنے بھی بات رکھو۔ ویسے عام طور پر عورتوں سے مشورہ لینے کو پسند نہیں کیا گیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو فرماتے ہیں: "شَاوِرُوْهُنَّ وَخَالِفُوْهُنَّ" ان سے مشورہ کرو اور اس کی مخالفت کرو (۱) اگرچہ عورت بھی کبھی کبھی اچھا مشورہ دیا کرتی ہے، ایک واقعہ یاد آ گیا تو سنا دیتا ہوں۔

صلحِ حدیبیہ کے موقعہ پر جب صلح ہوگئی جس میں انہوں نے ایک شرط یہ بھی

---

(۱) وَقَدْ وَرَدَ: شَاوِرُوهُنَّ وَخَالِفُوهُنَّ كَذَا فِي الْمِرْقَاةِ. قُلْت: قَالَ صَاحِبُ مَجْمَعِ الْبِحَارِ فِي كِتَابِهِ تَذْكِرَةِ الْمَوْضُوعَاتِ فِي الْمَقَاصِدِ، شَاوِرُوهُنَّ وَخَالِفُوهُنَّ لَمْ أَرَهُ مَرْفُوعًا، وَلَكِنْ رُوِيَ عَنْ عُمَرَ: "خَالِفُوا النِّسَاءَ فَإِنَّ فِي خِلَافِهِنَّ الْبَرَكَةَ". بَلْ رُوِيَ عَنْ أَنَسٍ رَفْعُهُ لَا يَفْعَلَنَّ أَحَدُكُمْ أَمْرًا حَتَّى يَسْتَشِيرَ فَإِنْ لَمْ يَجِدْ مَنْ يَسْتَشِيرُهُ فَلْيَسْتَشِرْ اِمْرَأَةً ثُمَّ لِيُخَالِفْهَا فَإِنَّ فِي خِلَافِهَا الْبَرَكَةَ. (تحفة الاحوذی۔ حدیث رقم: ۲۱۹۲)

لگائی تھی کہ اگرچہ مسلمان احرام باندھ کر آئے ہیں لیکن اس سال تو ان کو عمرہ کے لیے بیت اللہ جانے نہیں دیں گے، البتہ آئندہ سال آ کر تین دن یہاں رہ کر عمرہ کر سکتے ہیں، اور سوائے تلواروں کے اور کوئی ہتھیار ساتھ میں نہ لائیں اور وہ تلوار بھی نیام میں ہونی چاہیے۔ اور بھی شرائط تھیں جو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منظور فرمالیں اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فیصلہ کرلیا کہ ٹھیک ہے اس سال واپس جائیں گے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ صلح بہت گراں گزری، کہنے لگے کہ ہم عمرہ کے لیے وہاں سے یہاں تک آگئے ہیں، اب یہ ہم کو کیوں روکتے ہیں، ہم لڑلیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی ضبط نہ ہوسکا اور عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ نبیٔ برحق نہیں؟ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بیشک۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: پھر یہ ذلت کیوں گوارا کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں اللہ کا رسول اور برحق نبی ہوں، اس کے حکم کے خلاف نہیں کرسکتا اور وہ میرا معین اور مددگار رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ کا طواف کریں گے؟ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں! لیکن میں نے یہ کب کہا تھا کہ اسی سال طواف کریں گے، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے اور ان سے بھی یہی عرض کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی لفظ بلفظ وہی جواب دیا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلا تھا۔ بہرحال! حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لڑائی نہیں ہونے دی اور صلح کرلی۔ جب یہ طے ہوگیا کہ واپس جانا ہے تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضراتِ صحابہ کو حکم دیا کہ اپنے جانور ذبح کردو، سر منڈوادو، اور احرام کھول دو۔ لیکن سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے سنا ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت تکلیف ہوئی کہ میں ایک چیز کا حکم دے رہا ہوں، لیکن کوئی آگے ہی نہیں بڑھتا، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سنا ہی نہ

ہو۔ آپ ﷺ اپنے خیمے میں تشریف لے گئے۔

اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا اس سفر میں ساتھ تھیں، حضور ﷺ نے ان کو سارا واقعہ بیان فرمایا کہ ایسا ہوا۔ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے جو بات کہی وہ انہوں نے سنی ہی نہیں، اس لیے کہ یہ صلح ان کو اتنی ناگوار ہوئی ہے کہ ان کے دماغ ماؤف ہو چکے ہیں (جب کسی چیز کا غم زیادہ ہوتا ہے تو آدمی کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں) اس لیے ان لوگوں نے کچھ سنا ہی نہیں ہے، آپ ان کو یہ حکم نہ دیجئے کہ جانور ذبح کر کے بال کٹوا دو، اور احرام کھول دو، بلکہ آپ ان کے سامنے اپنا جانور ذبح کیجئے، بال منڈوا دیجئے اور اپنا احرام کھول دیجئے، جب وہ آپ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھیں گے تو خود بخود آپ کی اتباع کریں گے۔ چناں چہ حضورِ اکرم ﷺ باہر تشریف لائے اور جانور ذبح کیا آپ کو قربانی کرتا ہوا دیکھ کر سب لوگ اپنے جانوروں کو ذبح کرنے کے لیے ایسے لپک پڑے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ دیں گے۔

آمدم برسرِ مطلب

تو بات چل رہی تھی کہ جس سے مشورہ کیا جائے وہ تجربہ کار، سمجھ دار، امانت دار اور خیر خواہ ہو۔ حضورِ اکرم ﷺ سے بڑھ کر کس کی عقل کامل ہو سکتی ہے اور آپ سے بڑھ کر کس کا علم کامل اور مکمل ہو سکتا ہے، پھر آپ پر باری تعالیٰ کی طرف سے وحی بھی آتی تھی، اس کے باوجود باری تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم دیا گیا: ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ'' اور حضور ﷺ نے اس حکم پر عمل کیا، اور بہت سی مرتبہ آپ ﷺ کا اپنا رجحان کچھ اور ہوتا تھا اس کے باوجود آپ ﷺ نے دوسروں کی رائے پر فیصلہ کیا جیسا کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر ہوا۔

صدیق کی رائے صادق

اسی طرح صلحِ حدیبیہ کے موقع پر جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھ کر روانہ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے سے بُسر بن سفیان نامی ایک جاسوس کو مکہ مکرمہ بھیجا تا کہ وہ مکہ والوں کے حالات سے باخبر کرے، جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غدیر الاشتات (ایک جگہ کا نام ہے) پر پہنچے تو آپ کے جاسوس نے آ کر اطلاع دی کہ تمام مکہ والے جمع ہو گئے ہیں اور اطراف سے تمام قبائل کو بھی جمع کرلیا ہے، اور دودھ دینے والی اونٹنیوں اور پانی کا انتظام کرلیا ہے، اور انہوں نے طے کیا ہے کہ جو ہونا ہو وہ ہو، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اور خالد بن ولید- جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، ان- کو مقدمۃ الجیش کے طور پر دو سو سواروں کو لے کر روانہ کر دیا ہے جو مقامِ غُمیم میں پہنچ گئے ہیں، جب یہ اطلاع نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملی تو آپ نے مشورہ کے لیے حضراتِ صحابہ کو جمع کیا کہ ایسی اطلاع آئی ہے، اب بتاؤ! کیا کرنا ہے؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی رائے پیش کی کہ میرے ذہن میں تو یہ آتا ہے کہ مکہ کے آس پاس کے جو قبیلے والے مکہ والوں کا ساتھ دینے کے واسطے پہنچے ہوئے ہیں، ان کے علاقے لڑنے والوں سے خالی ہو گئے ہیں، ہم ان کے علاقوں پر جا کر حملہ کر دیں، جب ان کو اطلاع ملے گی کہ مسلمانوں نے ہمارے علاقوں پر حملہ کیا ہے تو وہ مکہ والوں کو چھوڑ کر اپنے علاقوں کی حفاظت کے لیے آ جائیں گے، اور اگر نہیں آئیں گے تو نقصان اُٹھائیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم اور آپ تو مدینہ منورہ سے عمرہ کے ارادے سے نکلے ہیں، اس لیے ہم تو عمرہ کے لئے آگے بڑھتے رہیں، ہم کو ان کے کسی علاقہ پر حملہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں! اگر مکہ مکرمہ

میں داخل ہونے سے کوئی ہمیں روکے گا تو ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔حضور ﷺ نے ان کی رائے قبول فرمالی۔

اس واقعہ سے میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حضورِ اکرم ﷺ کو مشورہ کا حکم بھی دیا گیا اور بہت سے مواقع پر دوسروں کی رائے اپنی رائے سے مخالف تھی پھر بھی حضور ﷺ نے ان کی رائے قبول فرمالی۔اس طرح آپ ﷺ نے ایک سنت جاری فرمائی کہ اہم معاملات میں خاص طور پر مشورہ کرنا چاہیے،اور جو حضرات کسی بھی لائن کے ذمہ دار ہیں ان کو تو اور زیادہ اہتمام کرنا چاہیے، جیسے: گھر کا ذمہ دار ہو تو اس کو چاہیے کہ گھر کے دوسرے افراد جو مشورہ کے قابل ہوں، ان سے مشورہ کرے۔یا خاندان کے دوسرے جو خیر خواہ لوگ ہوں،ان سے مشورہ کرے۔جماعت کا کام ہے تو اس کے ذمہ داروں سے مشورہ کریں۔

بہر حال! مشورہ ایک بہت اہم چیز ہے،اور اس کی خاص تاکید فرمائی گئی ہے، اسی کو حدیثِ پاک میں حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَا خَابَ مَنِ اسْتَخَارَ، وَلَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ (المعجم الأوسط:۶۶۲۷) جس نے استخارہ کیا وہ کبھی ناکام نہیں ہوگا، اور جس نے مشورہ کیا وہ کبھی پچھتائے گا نہیں۔اس سے مشورہ اور استخارہ دونوں کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب انہی دو چیزوں کی اہمیت کو بتلانے کے لیے قائم کیا ہے۔دو آیتیں مشورہ والی پیش فرمائی ہیں اور روایت استخارہ والی لا رہے ہیں۔ان میں سے ایک آیت ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (آل عمران:۱۵۹) ہوئی، اور دوسری آیت ہے ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾ (الشوریٰ:۳۸) اہلِ ایمان کے معاملات آپس کے مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔گویا مشورہ کو ایمان والا ہونے کی علامت بتلایا گیا۔اس لیے ضروری ہے کہ مشورہ ہو،اس کے اندر بڑی برکتیں ہیں، جہاں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، وہاں اس کے بڑے اچھے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

استخارہ کی تعلیم اور اس کی اہمیت

۷۱۸:-وعن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: كَانَ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يُعَلِّمُنَا الاسْتِخَارَةَ فى الأُمُورِ كُلِّهَا، كَالسُّورَةِ مِنَ القُرْآنِ، يَقُولُ: إِذَا هَمَّ أَحَدُكُمْ بِالأَمْرِ، فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ مِنْ غَيْرِ الفَرِيضَةِ، ثُمَّ لِيَقُلْ: اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ، وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ العَظِيمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ، وَتَعْلَمُ وَلَا أَعْلَمُ، وَأَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ. اللَّهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ "هَذَا الأَمْرَ" خَيْرٌ لِي فى دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي (أَوْ قَالَ) عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ، فَاقْدُرْهُ لِي وَيَسِّرْهُ لِي، ثُمَّ بَارِكْ لِي فِيهِ. وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ "هَذَا الأَمْرَ" شَرٌّ لِي فى دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي (أَوْ قَالَ) عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ؛ فَاصْرِفْهُ عَنِّي، وَاصْرِفْنِي عَنْهُ، وَاقْدُرْ لِيَ الخَيْرَ حَيْثُ كَانَ، ثُمَّ أَرْضِنِي بِهِ. (قَالَ): وَيُسَمِّي حَاجَتَهُ. (رواه البخاری.)

ترجمہ:-حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم لوگوں کو تمام معاملات میں استخارہ کرنا اس طرح سکھاتے تھے جیسے قرآنِ پاک کی سورت سکھاتے تھے۔ چناں چہ فرماتے تھے کہ جب تمہیں کوئی معاملہ پیش آئے تو چاہیے کہ (اگر مکروہ وقت نہ ہو تو) دو رکعت نفل پڑھے، اس کے بعد یہ دعا پڑھے: اے اللہ! میں تیرے علم کے ذریعہ سے تجھ سے خیر کا سوال کرتا ہوں، اور تیری طاقت سے میں طاقت چاہتا ہوں۔ اے اللہ! میں تیرے بڑے فضل کا سوال کرتا ہوں، اس لیے کہ تو قدرت رکھتا ہے، میرے اندر تو قدرت اور طاقت نہیں ہے، اور سارا علم تو تیرے پاس ہی ہے، میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ اور تو غیب کی باتوں کو بھی جاننے والا ہے۔ اے اللہ! اگر تیرے علم میں یہ ہے کہ "یہ کام" جس کا میں ارادہ کر رہا ہوں، اس میں میرے لیے میرے دین کے اعتبار سے، دنیوی زندگی کے اعتبار سے، اور انجام کار اور نتیجہ کے اعتبار سے بھلائی ہے، یا فوری طور پر میرے

اس کام میں بھلائی ہے؛ تو اے اللہ! اس کام کو میرے لیے مقدر فرما دے، اور اس کام کو میرے لیے آسان بھی کر دے اور پھر اس کام میں میرے لیے برکت رکھ دے۔ اور اے اللہ! اگر تو نے اپنے علم میں یہ بات طے کی ہے کہ "یہ کام" میرے لیے میرے دین کے اعتبار سے، اور میری دنیوی زندگی کے اعتبار سے، اور میرے انجام کار کے اعتبار سے برا ہے اور اس میں میرے لیے بھلائی نہیں ہے؛ تو اے اللہ! اس کام کو مجھ سے پھیر دے، اور مجھے اس سے پھیر دے۔ اور پھر بھلائی جہاں کہیں بھی ہو، اس کا میرے لیے فیصلہ کر دے، پھر مجھے اس پر راضی کر دے۔

اہتمامِ استخارہ کی وجہ

افادات:- حضورِ اکرم ﷺ قرآنِ پاک کی سورتیں جس اہتمام اور تاکید سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو سکھاتے تھے، اسی اہتمام اور تاکید کے ساتھ استخارہ اور اس کی دعا بھی صحابہ کو سکھاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں نے اپنے اہم معاملات کے فیصلے کرنے کے لیے عجیب وغریب طریقے اختیار کر رکھے تھے، جن کی بنیادیں صرف توہمات اور خیالات پر تھیں اور ان کو بڑی اہمیت دے رکھی تھی، حضورِ اکرم ﷺ نے زمانۂ جاہلیت میں رائج ان توہّمات پر مبنی سارے طریقوں کو منع فرما دیا، اور ایک بہترین چیز امت کو عطا فرمائی۔

کہانت

وہ مختلف طریقے کیا تھے جو اس زمانہ میں رائج تھے؟

ایک طریقہ "کہانت" تھا۔ "کاہن" وہ آدمی کہلاتا ہے جو مستقبل کی خبریں بتائے؛ جس کو ہم جوتشی کہتے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں کاہنوں کا بڑا رواج اور دَور دورہ تھا کوئی قبیلہ ایسا نہیں تھا جس میں کوئی کاہن نہ ہو اور وہ قبیلے والے اپنے اہم معاملات میں

اس کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور چوں کہ وہ دعویدار ہوتا تھا کہ آئندہ جو باتیں پیش آنے والی ہیں وہ مَیں جانتا ہوں، اس لیے لوگ اس سے پوچھتے تھے کہ مثلاً: ہم اپنے لڑکے کی شادی فلاں جگہ کرانا چاہتے ہیں، ٹھیک رہے گا یا نہیں؟ پھر وہ اپنے حساب سے کہتا کہ، ہاں صحیح ہے؛ تو وہ کرتے تھے۔ یا کوئی پوچھتا کہ: ہم یہ تجارت کرنا چاہتے ہیں، فلاں کاروبار شروع کرنا چاہتے ہیں، فلاں سفر کرنا چاہتے ہیں، ایسے مختلف اہم کاموں کے سلسلہ میں کاہنوں کے پاس جاتے تھے اور کاہن ویسے ہی مشورہ نہیں دیتا تھا، بلکہ جانے والا پہلے اس کی خدمت میں ہدیہ پیش کرتا تھا جو عام طور پر سو درہم ہوتے تھے، یہ معمولی رقم نہیں ہوتی تھی بلکہ بڑی رقم ہوتی تھی، اس کے بعد وہ اپنی حاجت پیش کرتا تھا کہ مَیں اس مقصد کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ یہ جو رقم پیش کی جاتی تھی اسی کو حدیث میں ''**حُلْوَانُ الْکَاہِن**'' کاہن کی شیرینی اور مٹھائی کہا گیا ہے۔ ہماری زبان میں بھی مٹھائی بول کر مٹھائی مراد نہیں لی جاتی، جیسے: کہتے ہیں کہ بھائی! مٹھائی لاؤ یعنی کوئی چیز لاؤ۔ اور حضورِ اکرم ﷺ نے حرام کمائی کی جو چیزیں بتلائی ہیں اس میں ''حلوان الکاہن'' بھی ہے، یعنی کاہن کی خدمت میں اس مقصد کے لیے جو کچھ پیش کیا جاتا تھا؛ چوں کہ ایک غلط کام کے لیے ہوتا تھا، اس لیے وہ کمائی بھی حرام ہے۔

زَجْر

دوسرا طریقہ ''زَجْر'' کا تھا، یعنی کبھی کسی کام کا ارادہ کرتے تھے تو جانوروں کی آوازیں سنتے تھے۔ اس زمانہ میں بعض قبیلہ کے لوگ ایسے ہوتے تھے جو جانوروں کی آوازوں کے ماہر ہوتے تھے، وہ ان کی آواز سن کر بتاتے تھے کہ اس جانور کی اس آواز کا مطلب یہ ہے کہ تم کو یہ کام نہیں کرنا چاہیے، اس میں کامیابی نہیں ہوگی، کبھی کہتے کہ کرو؛

کامیابی ہوگی۔ اسی طرح باہر نکلے اور کوئی جانور سامنے سے گزر گیا، جیسے: بلّی سامنے سے گزری، تو سمجھتے تھے کہ یہ کام نہیں کرنا ہے، آج بھی ایسا ہوتا ہے کہ بلّی اگر راستہ کاٹ جائے تو بعض لوگ واپس گھر میں گھس جاتے ہیں، یعنی تمہاری قسمت کا سارا فیصلہ اس بلّی ہی نے کر ڈالا۔ جب ہمارا ایمان تقدیر پر ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ طے کر چکے ہیں، تو بلّی کے گزر جانے سے اس میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے؟ اسی کو ''زجر'' والا طریقہ کہتے تھے۔

تَطَیُّر اور طِیَرہ

ایک تیسرا طریقہ بھی تھا، جس کو ''**تَطَیُّر اور طِیَرہ**'' کہتے ہیں، یعنی شگون اور فال لینا۔ اس میں یہ کرتے تھے کہ گھر سے باہر نکلے اور کوئی پرندہ بیٹھا ہوا دیکھا تو کنکر مار کر اس کو اڑاتے تھے، اگر وہ اُڑ کر دائیں طرف گیا تو سمجھتے تھے کہ اس کام میں کامیابی ہوگی اور بائیں طرف جاتا تو سمجھتے تھے کہ ناکامی ہوگی۔ دائیں طرف جانے والے پرندے کو یہ لوگ ''**سوانح**'' کہتے تھے، اور بائیں طرف جانے والے کو ''**بوارح**'' کہتے تھے۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ یہ معاملہ عقل کے بالکل خلاف ہے یا نہیں! ایک جانور اگر اُڑا، تو اس کو تمہارے کام سے کیا لینا دینا۔ وہ اگر دائیں طرف اڑا تو کامیابی اور بائیں طرف اڑا تو ناکامی؛ یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ عقل اس کو تسلیم کر سکتی ہے؟ یہ سب توہّمات ہیں، اسلام ایسی چیزوں کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اسلام تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین و توکل اور بھروسہ کرنے اور اسی سے امیدیں قائم کرنے کا سبق دیتا ہے۔

اسْتِقْسَام بِالْأَزْلَام

ایک اور طریقہ ''**إِسْتِقْسَام بِالْأَزْلَام**'' کا تھا۔ تیروں کے پاسے ڈالے جاتے تھے۔ ویسے تیر میں تو آگے لوہے کا نوکیلا حصہ اور پیچھے پَر ہوتا ہے، لیکن اس کام

کے لیے جو تیر ہوتے تھے اس میں آگے اور پیچھے کچھ نہیں ہوتا تھا، صرف لکڑی ہوتی تھی، اور ایسے کل سات تیر ہوتے تھے۔ ایک تیر پر لکھا ہوتا تھا: ''أَمَرَنِي رَبِّيْ'' مجھے میرے رب نے اس کام کو کرنے کا حکم دیا۔ دوسرے پر لکھا ہوتا تھا: ''نَهَانِيْ رَبِّيْ'' مجھے میرے رب نے اس کام سے منع کیا۔ یہ دو تیر ہوئے، تین تیر اور ہوتے تھے، ایک پر لکھا ہوتا تھا: ''وَاحِدٌ مِّنْكُمْ'' دوسرے پر ہوتا تھا: ''مِنْ غَيْرِكُمْ'' تیسرے پر لکھا ہوتا تھا: ''مُلْصَقٌ''۔ دو تیر اور ہوتے تھے، ایک پر لکھا ہوتا تھا: ''اَلْعَقْلُ'' اور دوسرے پر لکھا ہوتا تھا: ''اَلْغَفَلُ''؛ اس طرح کل سات تیر ہوئے۔

عام طور پر ان کے یہاں کوئی جھگڑا کسی کے نسب کے بارے میں ہوتا کہ یہ تمہارے قبیلے سے ہے یا نہیں؛ تو اس جھگڑے کے لیے تو وہ تین تیر استعمال کئے جاتے تھے۔ اور اگر کسی کے قتل کا معاملہ ہو، اور اس سے خون بہا اور دیت لینی ہو، تو اس کے لیے اخیری دو تیر استعمال کئے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ اور کوئی بھی اہم کام ہوتا تھا تو اس کے لیے پہلے والے دو تیر استعمال ہوتے تھے۔ اور چوں کہ وہ لوگ بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے، اور ہر قبیلے کا ایک بت ہوا کرتا تھا، اور وہ بت جس مکان اور بت خانے میں رکھا ہوتا تھا اس کے پجاری کی بہت ساری ذمہ داریاں اور ڈیوٹیاں ہوتی تھیں، ان میں سے ایک ذمہ داری اور ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ لوگوں کے معاملات میں مشورہ دے اور فیصلہ کرے۔ یہ سب تیر الگ الگ تھیلوں میں اس پجاری کے پاس اسی بت خانے میں رکھے ہوتے تھے۔ اب مثلاً: کسی کو سفر کرنا ہوتا تو وہ مندر کے اس پجاری کے پاس جاتا اس کو ہدیہ پیش کرتا، پھر سوال کرتا کہ: ایک تجارتی سفر کا ارادہ ہے، اس سلسلہ میں کیا فیصلہ ہے؟ تو وہ دو تیر والا چمڑے کا ایک تھیلا نکالتا۔

اور بعض روایتوں میں ہے کہ وہ دو تیر نکال کر اس پر کپڑا ڈال دیتا تھا، آنکھیں

بند کر کے کچھ بڑ بڑا کر ایک تیر اُٹھاتا تھا اور اس پر دیکھتا کہ کیا لکھا ہوا ہے، اگر وہ تیر ہوتا جس پر ''أَمَرَنِي رَبِّيْ'' لکھا ہوتا تھا کہ مجھے میرے رب نے اس کام کو کرنے کا حکم دیا؛ تو کہتا یہ سفر کرو، اس میں کامیابی ہے۔ اور اگر دوسرا تیر نکلتا جس پر لکھا ہوتا تھا ''نَهَانِيْ رَبِّيْ'' مجھے میرے رب نے اس کام سے منع کیا؛ تو کہتا کہ یہ سفر کرنے جیسا نہیں ہے۔ اور یہاں رب بول کر وہی بت مراد ہوتا تھا جو اس مندر میں رکھا ہوتا تھا، اور اس کی بنیاد توہّم پر تھی۔ یہ سارے طریقے زمانۂ جاہلیت میں رائج تھے، اور اس کا بڑا رواج تھا۔

ایک غلط رواج

آج کل بھی فال کے نام پر بہت کچھ کیا جاتا ہے، جیسے: بعض لوگ کرتے ہیں کہ قرآن کھولو، ایک دو صفحات اِدھر اُدھر سے دیکھ کر کہتے ہیں کہ، یہ کرو، اور یہ مت کرو۔ ان سے پوچھیے کہ یہ طریقہ کہیں کسی حدیث میں آیا ہے؟ بالکل نہیں۔ اور بعض طریقے تو زمانۂ جاہلیت والے طریقوں سے بالکل مشابہ ہو جاتے ہیں، اس لیے ان سارے طریقوں کو چھوڑ کر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے استخارہ کا طریقہ بتایا ہے؛ وہ کرو۔

استخارہ کی لغوی تحقیق

استخارہ عربی زبان کا لفظ ہے، اور عربی زبان کے مصدر استفعال سے ہے۔ اب اس کا مادہ کیا ہے؟ تو بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ استخارہ ''خیر'' سے مشتق ہے، 'سین' اور 'تاء' طلب کا معنیٰ دینے کے لیے آتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ سے خیر اور بھلائی طلب کرنا۔ گویا جو کام کرنا ہے اس میں اللہ تعالیٰ سے خیر کا سوال کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلایا۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مادہ ''خِيَرَةٌ'' ہے، جس کا معنیٰ ہے انتخاب اور فیصلہ۔ جیسے قرآنِ پاک میں ہے:

﴿مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ﴾ تو استخارہ یعنی اللہ تعالیٰ سے فیصلہ مانگنا کہ اے اللہ! میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں، تو ہی اس کام میں میرے لیے فیصلہ کردے کہ مَیں کروں یا نہ کروں۔

استخارہ کن کاموں میں کیا جائے؟

"إِذَا هَمَّ أَحَدُكُمْ بِالأَمْرِ"، یعنی جب تم کو کوئی معاملہ پیش آئے۔ یہاں کون سا معاملہ مراد ہے؟ تو سمجھنا چاہیے کہ ایک تو روز مرّہ کے معاملات ہوتے ہیں جن کو امورِ عادیہ کہا جاتا ہے، جیسے: کھانا، پینا، سونا، دوکان اور کاروبار پر جانا وغیرہ؛ اس کے لیے استخارہ نہیں کیا جائے گا، یہ تو روز مرّہ کے امورِ عادیہ ہیں۔

کچھ کام وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور شریعت کی طرف سے لازم اور ضروری کئے گئے ہیں، جیسے: پنج وقتہ نماز پڑھنا، روزے رکھنا، حج کرنا وغیرہ۔ تو اب مَیں حج کروں یا نہ کروں؟ ایسا استخارہ نہیں کیا جائے گا۔ جب تم پر حج فرض ہو گیا ہے تو وہ تو کرنا ہی کرنا ہے، اس میں استخارہ کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ مَیں نماز پڑھنے کے لیے جاؤں یا نہ جاؤں؟ یہ استخارہ کی چیز نہیں ہے۔ جو چیز شریعت کی فرض وواجب کی ہوئی ہے؛ اس میں استخارہ کیا کرنا؟

کچھ کام حرام اور ممنوع ہیں، ان کے بارے میں استخارہ کرنا کہ مثلاً: فلاں جگہ ڈاکہ ڈالنا ہے؛ جاؤں یا نہ جاؤں؟ جیسے: بعض لوگ (لاٹری کا) نمبر پوچھنے کے لیے جاتے ہیں۔ ارے بھائی! یہ تو حرام کام ہے جو کرنے کا ہے ہی نہیں۔ تو جو حرام اور ناجائز کام ہیں ان کے لیے بھی استخارہ نہیں ہے۔

استخارہ تو ان کاموں میں ہوتا ہے جو جائز ہیں، یا کم از کم مستحب ہیں کہ جن کے کرنے میں ثواب ہے، اور نہ کرنے میں کوئی گناہ نہیں، جیسے: فلاں گاؤں میں مسجد بنانی ہے، تو بناؤں یا نہ بناؤں؟ اس کا استخارہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ مسجد نہ بنانے پر

کوئی گناہ ہونے والا نہیں ہے۔ یا مسجد تو بنانی ہی ہے لیکن کون سے گاؤں یا شہر میں بناؤں، اس کا استخارہ کر سکتے ہیں۔ تو استخارہ ناجائز کام کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ جائز اور مباح کام کے لئے ہوتا ہے۔ مثلاً: آپ کاروبار کرنا چاہتے ہیں، اب کون سا کاروبار کروں، کپڑوں کی دلالی کا کروں، دوکان کھولوں، ہوٹل کھولوں، فلاں کام کروں، یا فلاں کروں؛ کئی چیزیں آپ کے سامنے ہیں اور مختلف لوگوں نے مختلف باتیں رکھی ہیں کہ تمہارے لیے فلاں چانس ہے، اور فلاں چانس بھی ہے، اور وہ سب جائز کام ہیں؛ تو اب آپ استخارہ کیجئے، پھر فیصلہ کیجئے۔ یا مثلاً: کوئی سفر درپیش ہے، اور اس کے معاملہ میں تردد ہے کہ کروں یا نہ کروں۔ یا مثلاً: نکاح کا معاملہ ہے، لڑکی کا رشتہ کرنا ہے، اور تردد ہے کہ کروں یا نہ کروں؛ تو اس سلسلہ میں استخارہ کر لیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی اہم کام ہو، جو روزمرّہ کا نہ ہو، بلکہ زندگی میں ایک آدھ بار کیے جانے والے کاموں میں سے ہو؛ ایسے کاموں میں آدمی کو چاہیے کہ استخارہ کرے، بس! شرط یہ ہے کہ وہ جائز کام ہو۔

مسنون استخارہ

''دو رکعت نفل پڑھے'': اور یہ یاد رہے کہ ایسا بھی ضروری نہیں ہے کہ سوتے وقت ہی ہو، کبھی بھی نماز پڑھ کر دعا کر لیجئے، بس مکروہ وقت نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں! یہ ہے کہ اطمینان اور یکسوئی والا استخارہ وہ ہے کہ رات کو سونے سے پہلے دو رکعت پڑھ کر دعا کرلی جائے، پھر سنت کے مطابق دائیں کروٹ پر رخ کر کے سو جائے، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے، اس دعا کے پڑھنے کے بعد سو جانے والی بات کسی حدیث میں نہیں آئی ہے، اگر آپ نے دو رکعت نماز پڑھ کر استخارہ والی دعا پڑھ لی، تو مسنون استخارہ ہو گیا اور حدیث پر عمل ہو گیا۔ یہ یاد رہے۔

دعا کے آداب

حدیث میں دعا کے آداب آئے ہیں، تو آداب کا تقاضہ ہے کہ اس دعا سے پہلے ان کا بھی لحاظ کرلیا جائے۔ دعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ دعا کی شروعات اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء سے کی جائے، جیسے: کسی کے نام درخواست لکھتے ہیں اور عرضی لے کر جاتے ہیں تو اپنی بات پیش کرنے سے پہلے اس کے القاب وآداب لکھے جاتے ہیں کہ، آپ ایسے ہیں اور ویسے ہیں، لوگوں کی حاجتوں کی طرف توجہ کرنے والے ہیں، مَیں بھی آپ کی خدمت میں اس امید پر یہ درخواست پیش کررہا ہوں کہ اس کو آپ قبول فرمائیں گے۔ یہ پورا ایک طریقہ ہے، اسی کو تمہید کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی حمد بہت پسند ہے، اس لیے دعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی جائے۔

یہ سب حمد وثناء ہی ہے

بعض لوگ سوچتے ہیں کہ حمد کے لیے عربی کے الفاظ کہاں سے یاد کریں؟ تو بھائی الحمد شریف تو سب کو یاد ہی ہوتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی حمد ہی ہے، نماز میں پڑھی جانے والی ثناء بھی حمد ہی ہے، تیسرا اور چوتھا کلمہ بھی اللہ تعالیٰ کی حمد ہی ہے، آیت الکرسی بھی حمد ہی ہے، ان میں سے کوئی بھی پڑھ لو۔ یہ سب آسانی کے لیے بتلا رہا ہوں، اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء آ گئی۔ پھر دعا کو قبولیت سے قریب کرنے والی چیز نبیٔ کریم ﷺ پر درود ہے، اس لیے حمد وثناء کے بعد درود پڑھو، سب سے اعلیٰ درود وہی ہے جو نماز کے اندر پڑھا جاتا ہے جس کو درودِ ابراہیمی کہتے ہیں، اس کے علاوہ بھی دوسرے درود پڑھنا چاہو تو پڑھو، اس کے بعد پھر استخارہ والی یہ دعا پڑھو۔

دعائے استخارہ کی تشریح

’’أَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ‘‘ اے اللہ! میں تیرے علم کے ذریعہ تجھ سے خیر کا سوال کرتا ہوں۔ جیسے: کوئی ہم سے زیادہ جاننے والا ہوتا ہے تو ہم اس سے کہتے ہیں کہ بھائی! اس سلسلہ میں آپ ہی بتاؤ۔ تو اللہ تعالیٰ کا علم ساری چیزوں کو محیط ہے، تو اس میں آدمی اللہ تعالیٰ سے خیر و بھلائی یا فیصلہ مانگتا ہے۔

’’وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ‘‘ اور تیری طاقت سے میں طاقت چاہتا ہوں۔ ہم لوگوں نے اپنا ذہن ایسا بنالیا کہ ہماری سوچ اسباب و وسائل تک محدود ہوگئی۔ جیسے: ایک آدمی تجارت کرنا چاہتا ہے، تو اس کے لیے جگہ اور جتنے کونٹیکٹ (Contact) ضروری ہیں وہ، اور ایڈ ورٹائز وغیرہ؛ یہ ساری چیزیں اختیار کرلیتا ہے، پھر وہ آدمی سمجھتا ہے کہ اب میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ یہیں آ کر ہم سے غلطی ہوجاتی ہے، حالاں کہ ایک مؤمن کی نظر ان اسباب و وسائل کی طرف نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہونی چاہیے، اسباب و وسائل کو سبب کے درجہ میں اختیار کرے، لیکن نظر مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہی ہونی چاہیے، بھروسہ و اعتماد اسی پر ہو، کرنے والا وہی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ’’عَرَفْتُ رَبِّيْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ‘‘ میں نے اپنے رب کو اپنے پختہ ارادوں کے ٹوٹنے پر پہچانا۔ آدمی کیسے کیسے پکّے ارادے کرتا ہے اور اس کے لیے کیسی لمبی چوڑی پلاننگ کرتا ہے، لیکن ساری پلاننگ زلزلہ کے ایک جھٹکے میں ختم ہوجاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے انسان کی ساری پلاننگ کی کیا حیثیت ہے؟

جب جیب کٹی

ایک آدمی گھوڑا خریدنے جارہا تھا، کسی نے پوچھا: کہاں جارہے ہو؟ کہا: گھوڑا

خریدنے۔ پوچھنے والے نے کہا: ان شاء اللہ کہو۔ تو وہ کہتا ہے: اس میں ان شاء اللہ کیا کہنا! میرے پاس پیسے ہیں، بازار جارہا ہوں، وہاں گھوڑے بکنے کے لیے آئے ہیں، میں خریدنے کے لیے جارہا ہوں، اگر پسند آگیا تو لے لوں گا؛ اب اس میں کیا باقی رہ گیا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے بھائی! جاؤ۔ دوسرے دن بازار لگنے والا تھا، یہ آدمی گیا، رات میں ایک مسافر خانہ میں آرام کیا، اسی میں اس کی جیب کٹ گئی۔ صبح اُٹھ کر دیکھتا ہے تو پیسے ہی نہیں ہیں، اب کیا گھوڑا خریدتا! واپس لوٹ رہا تھا، وہی آدمی ملا تو پوچھنے لگا کہ بھائی! کیا ہوا؟ گھوڑا نہیں خریدا؟ تو یہ کہتا ہے: بس! ان شاء اللہ میں جارہا تھا، ان شاء اللہ وہاں پہنچا، ان شاء اللہ رات کو سو گیا، ان شاء اللہ صبح جب اُٹھا تو دیکھا کہ ان شاء اللہ میری جیب کٹ گئی تھی، تو ان شاء اللہ اب میں واپس ہورہا ہوں۔ جب جیب کٹی تو سبق سمجھ میں آگیا، اور ایسا آیا کہ جہاں ان شاء اللہ نہیں کہنا چاہیے وہاں بھی ان شاء اللہ منھ سے نکل رہا ہے۔

دعائے استخارہ کی روح

اسی لیے اسباب اختیار کرنے کے بعد بھی مؤمن کی نگاہ اور اعتماد تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہی پر ہونی چاہیے؛ اسی کا نام توکل ہے۔ اور اعلیٰ درجہ کا توکل یہی ہے کہ بظاہر سب کچھ نظر آرہا ہے، ایک پائی کی بھی کمی نہیں ہے، دل کا یقین کہتا ہے کہ یہ کام ہوکر رہے گا؛ پھر بھی اس پر بھروسہ نہ ہو۔ مؤمن تو ہر وقت یہی کہتا کہ اگر اللہ تعالیٰ کرے گا تو ہوگا۔ استخارہ کی دعا میں یہی سکھایا گیا ہے۔ توکل یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد و بھروسہ، تفویض یعنی اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرنا۔ جیسے: ہمارا چھوٹا بچہ کہتا ہے کہ اباجان! میرے پاس یہ سب کچھ ہے، لیکن آپ جو فیصلہ کریں گے، میں تو اسی پر چلوں گا؛ تو آپ اندازہ لگائیے کہ باپ کو اس بچہ کے ساتھ کیسا تعلق ہوگا؟ پھر باپ پوری

کوشش کرے گا کہ یہ کام پورا ہونا ہی چاہیے۔تو ہم جب اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردیں گے اور کہیں گے کہ: اے اللہ! میں نے یہ اسباب تو اپنی جگہ پر اختیار کرلیے، لیکن میرے علم اور میری قدرت کی کیا حیثیت ہے، تیرا علم تیری قدرت اور تیرا فیصلہ ہی سب کچھ ہے، تو جو کرے اسی پر میں آس اور امید لگائے ہوئے بیٹھا ہوں؛ تو پھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کیا کرتا ہے۔

دراصل نبیٔ کریم ﷺ کی تعلیمات ہر مؤمن کا مزاج یہی بنانا چاہتی ہے۔ اسباب کے اختیار کرنے سے منع نہیں کیا، بلکہ اسباب کا حکم دیا کہ اسباب اختیار کرو، لیکن نظر ان اسباب پر نہیں ہونی چاہیے، بلکہ نظر اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونی چاہیے۔اسی کو کہتے ہیں: ''وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ'' اے اللہ! تیری طاقت سے مَیں طاقت حاصل کرنا چاہتا ہوں، میرے اندر قدرت اور طاقت ہی کہاں ہے، قدرت والا تو تو ہی ہے، تیری ذات ہی سے مَیں مدد و قدرت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

''وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ'' اور اے اللہ! میں تیرے بڑے فضل کا سوال کرتا ہوں، میرا تجھ پر کوئی حق نہیں ہے۔کیا بندے کی اللہ تعالیٰ پر کوئی زبردستی ہے؟ وہ دے تو اس کا فضل ہے، اور اگر نہ دے تو اس سے چھین کر کون لے سکتا ہے؟ اس لیے کہا کہ: اے اللہ! تیرا فضل بہت بڑا ہے، اسی فضلِ عظیم کا مَیں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔

آگے فرمایا: ''فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ'' اس لیے کہ تو قدرت رکھتا ہے، میرے اندر تو کوئی قدرت اور طاقت نہیں ہے۔

''وَتَعْلَمُ وَلَا أَعْلَمُ'' اور سارا علم تو تیرے پاس ہے، مَیں تو کچھ جانتا بھی نہیں، اس کام کا آئندہ کیا نتیجہ ہونے والا ہے، اور آگے پیچھے، اندر باہر اس کے کیا اثرات ہیں؛ وہ سب تو جانتا ہے، مَیں تو جانتا بھی نہیں۔

''وَأَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ'' اور تو تو غیب کی باتوں کو بھی جاننے والا ہے۔

دعا کا عجیب وغریب انداز

یہ سب کہنے کے بعد اب آگے کہا جا رہا ہے کہ: اے اللہ! اگر تیرے علم میں یہ ہے کہ ''یہ کام'' جس کا میں ارادہ کر رہا ہوں، اس میں میرے لیے میرے دین کے اعتبار سے، دنیوی زندگی کے اعتبار سے، انجام کار اور نتیجہ کے اعتبار سے بھلائی ہے؛ تو اس کام کو تو میرے لیے آسان کر دے، اور میری تقدیر میں لکھ دے۔ دیکھو! جتنی بھلائیاں ہو سکتی ہیں، وہ سب مانگ لیں۔

اور بعض روایتوں میں ہے کہ فوری طور پر میرے اس کام میں میرے لیے دنیا اور آخرت میں بھلائی ہے، تو اے اللہ! اس کام کو میرے لیے مقدر فرما دے، اور اس کا فیصلہ کر دے کہ یہ کام ہو جائے، اور اس کام کو میرے لیے آسان بھی کر دے، پھر اس کام میں میرے لیے برکت رکھ دے۔ اور اے اللہ! اگر تو نے اپنے علم میں یہ بات طے کی ہے کہ ''یہ کام'' میرے لیے میرے دین، میری دنیوی زندگی، اور میرے انجام کار کے اعتبار سے برا ہے، اس میں میرے لیے بھلائی نہیں ہے، تو اس کام کو مجھ سے پھیر دے، اور مجھے اس سے پھیر دے، اور پھر بھلائی جہاں کہیں بھی ہو، اس کا میرے لیے فیصلہ کر دے، اور پھر مجھے اس پر راضی کر دے۔

بہت سی مرتبہ کوئی بات ہماری بھلائی کی ہوتی ہے، لیکن ہمارا دل اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا، پھر بعد میں کہتے ہیں کہ یار وہی ٹھیک تھا۔ اس لیے کہا کہ اس وقت میں اس کو دل سے مان لوں۔

غور کیجئے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیسا کیسا مانگا ہے! کیسی عجیب وغریب چیزیں

ہیں ! ایک بندہ جب اپنے کسی کام میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح سوال کرے گا کہ گویا اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرر ہا ہے اور اس کے بعد آگے بڑھ رہا ہے، تو اندازہ لگائیے کہ کبھی وہ ناکام ہوسکتا ہے؟ اور اگر خدانہ کرے کبھی ظاہری طور پر کوئی ناکامی ہوئی؛ تب بھی اس کا دل مطمئن رہے گا۔ "ھٰذَا الْأَمْرَ" کہتے وقت اس کام کا دل میں تصور کرلے، یا زبان سے اس کام کو بولے۔ یہ استخارہ کا طریقہ ہے۔

دیکھئے ! نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیسی بہترین تعلیم دی ہے! ایک بندے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بالکلیہ جوڑ دیا، جیسا کہ پہلے بچہ کی ایک مثال دی تھی۔ اسی طرح ہمارا نوجوان بیٹا ہے جس کے پاس سب کچھ ہے، اس میں ساری صلاحیتیں ہیں اس کے باوجود سب کچھ ابا کے حوالہ کردے کہ آپ جو کہیں گے وہی ہوگا، تو اباجان کبھی کوئی ایسی شکل سوچیں گے ہی نہیں جس میں ناکامی ہو، بلکہ اس کو پورے طور پر کامیاب کرا کر ہی رہیں گے۔ اسی طرح بندہ جب اپنے آپ کو پورا اللہ تعالیٰ کے حوالہ کردے گا اور اللہ تعالیٰ ہی سے توفیق مانگے گا اور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر چلے گا؛ تو پھر وہ ضرور کامیاب ہوگا۔

استخارہ کے بعد پتہ کیسے چلے؟

اب استخارہ کے بعد فیصلہ خواب میں نظر آنا چاہیے یا نہیں؟ تو یہ دھیان رہے کہ خواب کا نظر آنا تو کوئی ضروری نہیں ہے۔ ہاں ! کبھی آ بھی جاتا ہے کہ آدمی اس کام کو کرتے ہوئے دیکھتا ہے، گویا اشارہ ہوتا ہے کہ یہ کام کرو، کبھی اس کام سے دور ہوتے ہوئے اور بچتے ہوئے دیکھتا ہے، یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ کام مت کرو۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔

اور اگر کوئی خواب تو نظر نہیں آیا، مگر استخارہ کرنے سے پہلے اس کام کو کرنے کا آپ کے دل میں جو خیال تھا وہ استخارہ کے بعد اور زیادہ جم گیا اور مضبوط ہوگیا، وہ

خیال اور قوی ہوگیا؛ یہ بھی اس بات کی علامت ہے کہ اس کام کو کرو۔ یا اس کام کا ارادہ استخارہ کے بعد کم ہوگیا؛ تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ مت کرو۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ استخارہ کے بعد اپنے کسی محسن سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ کرو، تو یہ علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس استخارہ کے نتیجہ میں اس کے دل میں ڈالا ہے کہ اس سے کہو کہ اس کام کو کرے؛ لہٰذا اس کو کرلو۔ یا اس نے منع کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں منع کرنے کا خیال ڈالا، یہ اسی استخارہ کا اثر ہوتا ہے؛ لہٰذا مت کرو۔

استخارہ کتنے دن؟

اب استخارہ کتنے دنوں تک کیا جائے؟ تو فقہاء نے لکھا ہے کہ سات دن تک کیا جائے، اور اگر جلدی ہو تو ایک ہی دن میں سات مرتبہ یہ دعا پڑھ لی جائے۔

اور بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ یہ دعا پڑھ لینے کے بعد وہ کام کرڈالو، جو خیر ہوگی وہی کام اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ سے کروائے گا۔

دوسرے سے استخارہ کرایا جاسکتا ہے؟

تو اس سلسلہ میں مَیں نے کسی کتاب میں دیکھا نہیں ہے، اور پہلے پہل جب میں نے سنا کہ کسی دوسرے سے استخارہ کروایا جاتا ہے، تو مجھے بھی عجیب وغریب لگا کہ اپنا کام ہے اور دوسرے سے کیسے استخارہ کروایا جائے؟ لیکن اپنے بزرگوں میں سے بعض کے یہاں سنا کہ فلاں صاحب نے ان سے استخارہ کروایا اور انہوں نے کرکے دیا تو پھر ہم بھی ماننے والے بن گئے۔ ورنہ کسی کتاب میں مَیں نے یہ طریقہ دیکھا نہیں ہے کہ اپنا استخارہ دوسرے سے کرواؤ۔ یہاں اہلِ علم موجود ہیں، ان میں اگر کسی نے کسی کتاب میں دیکھا ہو، تو مجھے بھی بتادیں؛ تاکہ میرے علم میں اضافہ ہوجائے۔

استحباب الذہاب الیٰ العید الخ

عید کی نماز کے لیے مختلف راستوں سے آنا جانا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب کا عنوان

آداب کا بیان چل رہا ہے، ایک اور ادب بتلایا جا رہا ہے کہ: عید کی نماز کے لیے جاتے ہوئے اور واپسی میں، اسی طرح بیمار کی خبر گیری اور عیادت کے لیے جانے آنے میں، اسی طریقہ سے حج کے لیے، اللہ کے راستہ میں جہاد کے لیے، جنازہ کی شرکت کے لیے، اور جتنے بھی نیکی کے کام ہیں، ان سب میں مستحب یہی ہے کہ اگر ایک راستہ سے جائے تو دوسرے راستہ سے لوٹے؛ تاکہ نیکی کی جگہیں زیادہ سے زیادہ ہو جائیں۔

قیامت کی کچہری کے گواہ

دراصل یہ بات تو قرآنِ پاک کی آیت اور احادیث سے ثابت ہے کہ بندے کے اعمال کے متعلق قیامت میں اللہ تعالیٰ جن گواہوں کو قائم فرمائیں گے، ان میں زمین کے وہ حصے بھی ہوں گے جہاں اس نے وہ اعمال کیے تھے۔ آدمی جو بھی اعمال کرتا ہے ان کے متعلق مختلف گواہ قیامت کے دن پیش کیے جائیں گے، جیسے: کورٹ کا دستور ہے کہ مجرم کے خلاف ثبوت مہیا کیے جاتے ہیں اور ان ثبوت کو پیش کرنے کے بعد اس کے اوپر جرم ثابت کیا جاتا ہے، پھر سزا کا فیصلہ سنایا جاتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی یہی کارروائی کی جائے گی، اگرچہ اللہ تعالیٰ ساری چیزیں جانتے ہیں، وہ دانا و بینا ہیں، سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ حجت قائم کرنے کے لیے بندوں کے خلاف گواہ پیش کریں گے، اور ان گواہوں کے ذریعہ ان کے گناہوں کو ثابت کیا جائے گا، اور اس کے بعد سزا سنائی جائے گی۔ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا﴾ اس دن زمین اپنی خبریں سنائے گی۔ اس کے

متعلق مفسرین لکھتے ہیں کہ جو بھی اعمال اچھے یا برے اس نے زمین پر کیے ہیں، قیامت کے روز زمین کا وہ حصہ اور ٹکڑا اس کے متعلق گواہی دے گا۔

اسی طرح دوسرے گواہ انسان کے اعضاء ہوں گے وہ بھی گواہی دیں گے۔ اس لیے کہ جب آدمی کو پیش کیا جائے گا اور اس نے گناہ کیے ہوں گے تو دنیا کی طرح مجرم اوّلِ وہلہ میں از خود اپنے گناہ کا اقرار نہیں کرے گا، اس کی کوشش یہی ہوگی کہ ان سے انکار کردے، پھر جب دیکھے گا کہ انکار سے بات بننے والی نہیں ہے، اور میرے خلاف چاروں طرف سے گواہ قائم ہو چکے ہیں، اگر انکار کروں گا تب بھی میری بات سنی جانے والی نہیں ہے؛ تو پھر مجبوراً اقرار کرے گا۔

تطبیقِ آیات

بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کچھ سوالات کیے کہ قرآنِ پاک کی کچھ آیتوں میں آپس میں تعارض ہے، ایک آیت سے ایک بات معلوم ہوتی ہے اور دوسری آیت سے دوسری بات ثابت ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ اس نے کہا: قرآنِ پاک کی بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے گفتگو کریں گے اور بات چیت ہوگی۔ اور بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاموشی سی طاری ہوگی، کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اور بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے گناہوں سے انکار کریں گے کہ ہم نے کبھی کفر و شرک نہیں کیا تھا: ”وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ“، اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پہلے تو وہ لوگ خاموش رہیں گے، لیکن اس کے بعد دیکھیں گے کہ لوگوں کو طلب کیا جاتا ہے اور ان سے پوچھا جاتا ہے،

اس موقع پر اہلِ ایمان کو بھی طلب کیا جائے گا اور لوگوں سے چھپا کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو سوالات کیے جائیں گے کہ تم نے یہ عمل کیا تھا؟ یہ عمل کیا تھا؟ بندۂ مؤمن اس کا اقرار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کے گناہوں کو معاف کر دو۔ یہ دیکھ کر کفار آپس میں کہیں گے کہ یہاں تو معاملہ بہت آسان ہے، جو بات کہی جاتی ہے اس کو مان لیا جاتا ہے۔ چناں چہ وہ اسی بنیاد پر انکار کریں گے؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی زبان پر مہر لگا دی جائے گی، پھر ان کے ہاتھ اور دوسرے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ ان گواہی دینے والوں میں زمین کے حصے بھی ہوں گے جہاں وہ عمل کیے تھے۔ (بخاری شریف، کتاب التفسیر: سورہ حم سجدہ)

زمین وآسمان روتے ہیں

بلکہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آدمی کا جب انتقال ہوتا ہے تو زمین کے جن حصوں پر وہ نیک اعمال کرتا تھا اور اس کے نیک اعمال آسمان کے جن دروازوں سے اوپر پہنچائے جاتے تھے، زمین کا وہ حصہ اور آسمان کا وہ دروازہ اس کی موت پر روتے ہیں۔ اسی کو قرآن نے کہا کہ ''ان کافروں کی ہلاکت پر زمین اور آسمان نہیں روئے'' (سورۂ دخان) اس کی تفسیر میں حضراتِ مفسرین نے لکھا ہے کہ اہلِ ایمان جو نیک اعمال کرنے والے ہوتے ہیں ان کی موت پر زمین روتی ہے، اور زمین کے وہ حصے جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتا تھا؛ وہ بھی روتے ہیں (شعب الایمان: ۳۰۱۸) اس لئے کہ زمین کے جس حصہ پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے، وہ خوش ہوتی ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے استعمال کیا گیا۔ تو جب بندۂ مؤمن مر جاتا ہے تو زمین کا وہ حصہ اور جگہ ویران ہو جاتی ہے؛ لہٰذا وہ روتی ہے۔ مسلمان کی موت پر چاہے انسان روئے یا نہ

روئے، لیکن وہ جگہ ضرور روتی ہے، اور آسمان کے جن دروازوں سے اعمال جاتے تھے وہ بھی روتے ہیں۔

زیادہ گواہ تیار کرلو

مطلب یہ ہے کہ یہ ساری جگہیں گواہی دیتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ ساری چیزیں نوٹ کی جاتی ہیں۔ اسی لیے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اللہ کی تسبیح کو انگلیوں پر گنا کرو، کیوں کہ وہ قیامت کے دن گواہی دیں گی (ترمذی: باب ماجاء فی عقد التسبیح بالید. ابوداود: باب التسبیح بالحصی) جہاں وہ گناہوں کو بتائے گی، وہیں وہ یہ بھی بتائے گی کہ ان پر تم نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا تھا۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ زمین کے وہ حصے جہاں پر آدمی عبادت کرتا تھا وہ بھی اس کے حق میں گواہی دیں گے۔ اس لیے شریعت کی نگاہ میں یہ بات مطلوب ہے کہ آدمی زیادہ سے زیادہ زمین کے حصے اپنی گواہی کے لیے تیار کرے۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ آدمی فرض نماز پڑھنے کے بعد تھوڑی سی جگہ بدل کر نفل اور سنت پڑھتا ہے، اس میں جہاں اور بہت ساری حکمتیں ہیں، وہیں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس طرح گویا دو جگہیں قیامت کے دن آپ کے حق میں گواہی دیں گی۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے کہ: عید کی نماز کے لیے جاتے ہوئے ایک راستہ استعمال کرو اور واپسی میں دوسرے راستہ سے لوٹو؛ یہ مستحب ہے۔ چوں کہ عید کی نماز ایک عبادت ہے، اس کی ادائیگی کے لیے جب آدمی جائے گا تو کوئی نہ کوئی راستہ تو اختیار کرے گا۔

عمل چھوٹا سا؛ فضیلت بڑی

اسی طرح بیمار کی خبر گیری اور عیادت کے لیے جانے آنے میں بھی مختلف راستہ

اختیار کرنا پسندیدہ ہے۔ کسی بیمار کی بیمار پرسی بھی بہت بڑا نیکی کا کام ہے۔ آج کل اس کی طرف سے بھی بہت غفلت برتی جاتی ہے، اگر کچھ تعلق ہو تو کر لیتے ہیں، ورنہ نہیں کرتے، حالاں کہ ایک مؤمن کا دوسرے مؤمن پر حق ہے، اس لئے اہلِ محلہ اور اہلِ مسجد میں سے کسی کے متعلق جب دیکھیں کہ وہ نظر نہیں آرہا ہے، تو حق ہے کہ اس کی عیادت کے لیے جائیں؛ اس پر بڑا ثواب ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ کوئی آدمی کسی بیمار کی عیادت کے لیے صبح کے وقت گیا تو شام تک ستر ہزار (۷۰۰۰۰) فرشتے اس کے لیے دعا کرتے ہیں اور کوئی شام کو گیا تو صبح تک ستر ہزار (۷۰۰۰۰) فرشتے دعا کرتے ہیں۔ حدیثِ پاک میں یہاں تک آتا ہے کہ کوئی آدمی جب کسی مریض کی عیادت کے لیے جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں دوڑتا ہوا جاتا ہے۔ ایک چھوٹا سا عمل ہے؛ لیکن اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

یہ اہتمام صرف عید میں نہیں

اس لیے بیمار کی عیادت، حج، اللہ کے راستہ میں جہاد اور جنازہ کی شرکت کے لیے اور اس جیسے جتنے بھی نیکی کے کام ہیں، ان کے لیے اگر آپ جا رہے ہیں تو کوئی نہ کوئی راستہ تو اختیار کرنا ہی پڑے گا، اس لیے وہاں سنت یہی ہے کہ اگر ایک راستہ سے جائے تو دوسرے راستہ سے لوٹے۔ یہ حکم صرف عید کی نماز کی سنت نہیں ہے، آج کل لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں، اس لیے عید کی نماز کے لیے اس کا اہتمام بھی کرتے ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ عید کی نماز کے علاوہ تمام عبادات کے کاموں میں یہی حکم ہے۔ جنازہ کی شرکت، بیمار کی عیادت وغیرہ؛ سارے نیکی کام کے لیے ایک راستہ سے جائیں اور دوسرے راستہ سے لوٹیں۔ اس کی وجہ وہی ہے کہ آدمی جب چل کر ان

راستوں سے گزرے گا تو قیامت میں زمین کے وہ حصے آپ کے حق میں گواہی دیں گے کہ: اے اللہ! یہ بندہ عید کی نماز پڑھنے کے لیے مجھ پر سے چل کر گیا تھا، اور واپس لوٹتے وقت مجھ پر سے چل کر لوٹا تھا۔ بیمار کی عیادت کے لیے مجھ پر چل کر گیا تھا اور وہاں سے واپسی میں مجھ پر سے چل کر لوٹا تھا۔ یہ بھی آداب میں سے ہے۔ اس لیے جب ان اعمال کو انجام دیں تو ساتھ ساتھ ان چیزوں کا بھی اہتمام کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات نمونہ ہے

نیکی کے جتنے بھی اعمال بتائے گئے ہیں ان کو انجام دینے کے طریقے بھی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتائے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو نمونہ بنا کر بھیجا ہے، اس لیے ہر کام کو اسی طریقہ کے مطابق انجام دینے کی کوشش کرنی چاہیے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتائے ہیں؛ تب ہی وہ عمل مقبول ہوگا۔ جیسے: اگر آپ کسی جگہ پر کسی چیز کے بنانے کا آرڈر (Order) دیں اور آپ نے اس کا ایک نمونہ بھی دے رکھا ہے، پھر اگر بنانے والا اس نمونہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر کرے گا تو آپ اس چیز کو (Reject) اور رَد کر دیں گے کہ یہ ہمارے آرڈر کے مطابق نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ نمونہ میں ذرا سا بھی فرق نہیں آنا چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہر عمل کے واسطہ نمونہ بنایا ہے، قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ آپ کی ذات انسانوں کے لیے نمونہ ہے، جب نمونہ ہے تو پھر ہر چھوٹے بڑے عمل میں اسی کو دیکھا جائے گا، تبھی وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوگا۔ اس لیے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل

۷۱۹:- عن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: كَانَ النبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم إِذَا كَانَ يومُ عيدٍ خَالَفَ

الطَّرِيقَ. (رواہ البخاری)

قَوْله: ((خَالَفَ الطَّرِيقَ)) يعنى: ذَهَبَ فى طريقٍ، وَرَجَعَ فى طريقٍ آخَرَ.

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب عید کا دن ہوتا تھا تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عید کی نماز کے لیے ایک راستہ سے تشریف لے جاتے تھے اور دوسرے راستہ سے واپس تشریف لاتے تھے۔

افادات:- اس کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ عبادت کی جگہ زیادہ سے زیادہ ہو۔

۷۲۰:- وعن ابن عُمَرَ رضی اللہ عنہما أَنَّ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم كَانَ يَخْرُجُ مِنْ طَرِيقِ الشَّجَرَةِ، وَيَدْخُلُ مِنْ طَرِيقِ الْمُعَرَّسِ. وَإِذَا دَخَلَ مَكَّةَ، دَخَلَ مِنَ الثَّنِيَّةِ الْعُلْيَا، وَيَخْرُجُ مِنَ الثَّنِيَّةِ السُّفْلَى. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب حج کے لیے یا جہاد کے لیے یا کسی اور کام کے لیے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے جاتے، تو شجرہ والے راستہ سے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے، اور مُعَرَّس والے راستہ سے مدینہ منورہ میں واپس داخل ہوتے تھے (گویا داخل ہونے کے لیے الگ راستہ اور نکلنے کے لیے دوسرا راستہ اسی مقصد کے لیے اختیار کیا گیا، اور ان سفروں میں حج کے بھی اسفار ہوتے تھے، تو) جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حج یا عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے تھے تو مکہ کا جو بالائی حصہ یعنی جنۃ المُعلی والا راستہ ہے، اُدھر سے آپ مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے تھے اور وہ جو ذیلی راستہ ہے، اُدھر سے واپس لوٹتے تھے (گویا اس طریقہ سے آپ نے یہ تعلیم دی کہ آدمی ایک راستہ سے جائے اور دوسرے راستے سے آئے۔ لہٰذا ہم اپنے تمام عبادت کے کاموں میں اس کا اہتمام کریں)۔

استحباب تقديم اليمين في كل ما هو من باب التكريم

ہر اچھے کام میں دائیں طرف سے شروع کرنا مستحب ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

استحباب تقديم اليمين فى كل مَا هو من باب التكريم كالوضوءِ وَالغُسۡلِ وَالتَّيَمُّمِ، وَلُبۡسِ الثَّوۡبِ وَالنَّعۡلِ وَالخُفِّ وَالسَّرَاوِيلِ وَدُخولِ الۡمَسۡجِدِ، وَالسِّوَاكِ، وَالاكۡتِحَالِ، وَتقليم الأظۡفار، وَقَصِّ الشَّارِبِ، وَنَتۡفِ الإبۡطِ، وَحَلقِ الرَّأسِ، وَالسّلامِ مِنَ الصَّلاَةِ، وَالأكۡلِ، والشُّربِ وَالمُصافحَةِ وَاسۡتِلاَمِ الحَجَر الأَسۡوَدِ والخروجِ منَ الخلاءِ، والأخذ والعطاء، وغيرِ ذَٰلِكَ مِمَّا هُوَ فى معناه. ويُسۡتَحَبُّ تَقديمُ اليسارِ فى ضدِ ذَٰلِكَ، كالامۡتِخَاطِ وَالبُصَاقِ عن اليسار، ودخولِ الخَلاءِ، والخروج من المَسۡجِدِ، وخَلۡعِ الخُفِّ والنَّعۡلِ والسراويلِ والثوبِ، والاسۡتِنۡجَاءِ وفِعلِ المُسۡتَقۡذرَاتِ وأشۡبَاه ذَٰلِكَ

عنوان کی وضاحت

ایک اور ادب بتلا رہے ہیں کہ جو اچھے اور عزت کے کام سمجھے جاتے ہیں ان کو انجام دینے میں داہنی طرف سے شروعات ہونی چاہیے۔ ایک آدمی وضو کرنا چاہتا ہے تو پہلے داہنا ہاتھ دھوئے، پھر بایاں ہاتھ دھوئے۔ اسی طرح جہاں جہاں دایاں اور بایاں ممکن ہو؛ وہاں ایسا کرے۔ اور جہاں دایاں بایاں ممکن نہ ہو، تو وہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی حال غسل کا ہے کہ جب غسل کے لیے بیٹھے تو بدن کے دائیں حصہ پر پہلے پانی ڈالے، پھر بائیں حصہ پر ڈالے۔ اسی طرح تیمم میں جب ہاتھوں پر ہاتھ پھیرے تو پہلے سیدھے ہاتھ پر، پھر اُلٹے ہاتھ پر پھیرے۔

اسی طرح جب کپڑے پہنے تو ازار میں پہلے سیدھا پیر پھر اُلٹا پیر ڈالے، پہلے سیدھی آستین پھر اُلٹی آستین پہنے۔ جوتے پہننے میں بھی پہلے سیدھا پیر پھر اُلٹا پیر۔ موزہ میں بھی پہلے دائیں پھر بائیں میں پہنے۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دعا و درود پڑھ لے اور پہلے سیدھا پیر، پھر اُلٹا پیر داخل کرے۔ جب مسواک کرے تو پہلے داہنی جانب پھر بائیں جانب۔ سرمہ لگانے میں پہلے داہنی جانب، پھر بائیں جانب۔ ناخن کاٹنے میں پہلے دایاں ہاتھ، پھر بایاں ہاتھ، پہلے دایاں پیر، پھر بایاں پیر۔ اسی طرح جب مونچھیں کاٹے تو دائیں طرف سے شروع کرے اور بائیں جانب ختم کرے۔ بغل کے بالوں کو اکھاڑنے میں بھی اس کا خیال رکھے۔ بغل کے بالوں کو اکھاڑنا مسنون ہے، اگر کسی آدمی کے لئے بال کا اکھاڑنا ممکن نہیں ہے کہ اکھاڑنے میں تکلیف ہوتی ہے؛ تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ویسے اگر عادت ڈال لی جائے تو پھر آسان ہو جاتا ہے، اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اُکھاڑنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بغل میں بدبو نہیں رہتی۔

نماز کا سلام جب پھیرا جائے گا تو پہلے دائیں طرف، پھر بائیں طرف۔ کھانے میں بھی اپنے سامنے جو چیز ہے اس میں سے دائیں طرف سے، دائیں ہاتھ سے کھائے۔ پینے میں بھی دائیں ہاتھ سے پیے۔ مصافحہ کرنے میں ہاتھ ملاتے ہیں، تو اس میں بھی دایاں ہاتھ ملائے۔ حجرِ اسود کو بوسہ دے تو دائیں طرف سے بوسہ دیں گے، بیت الخلاء سے باہر نکلنے میں پہلے دایاں پیر، پھر بایاں پیر۔ کوئی چیز آپ لے رہے ہیں، یا دے رہے ہیں، تو لینے میں دایاں ہاتھ سے لیں، اور دینے میں بھی دایاں ہاتھ استعمال کریں۔ بہت سے لوگ ان چیزوں کی طرف دھیان نہیں دیتے، اس کی وجہ سے معاملہ اُلٹ جاتا ہے۔ اصل ضرورت اس کی ہے کہ کچھ دنوں تک دھیان اور توجہ سے ان کاموں کو کیا جائے تو ان شاء اللہ خود بخود عادت پڑ جائے گی، بچوں کو بھی اسی کی

عادت ڈالی جائے، کچھ دنوں تک اگر اس کی عادت ڈالیں گے تو خود بخود وہ اسی طرح کرنا شروع کر دیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر ایسا کام جس میں عزت کا پہلو نکلتا ہو، اس میں دائیں طرف سے شروعات کیا کریں۔ اور اگر معاملہ اُلٹا ہے کہ اس میں عزت کا پہلو نہیں ہے تو اس صورت میں پہلے بائیں طرف سے کیا جائے گا۔ چناں چہ آپ ناک صاف کرنا چاہتے ہیں، تھوکنا چاہتے ہیں، تو دائیں طرف نہیں تھوکیں گے، بلکہ بائیں طرف تھوکیں گے، اور بیت الخلاء میں داخل ہوں گے تو پہلے بایاں پیر اندر رکھیں گے، پھر دایاں پیر۔ مسجد میں داخل ہونا تو عزت کی چیز ہے، لیکن مسجد سے نکلنا اس کے برعکس ہے، اس لیے پہلے بایاں پیر نکالیں گے، پھر دایاں پیر۔ استنجاء بائیں ہاتھ سے کریں گے۔ اسی طرح جتنے بھی کام ہیں ان کے اندر اسی بات کا خیال رکھا جائے۔ تو جتنے بھی اچھے کام ہیں ان میں ادب یہ ہے کہ آدمی دائیں طرف سے شروع کرے، اور جو اس کے برعکس ہے اس میں بائیں طرف سے شروع کرنا چاہیے۔ یہ ایک عنوان قائم کیا ہے، اور اس کے تحت اسی کے متعلق آیتیں اور روایتیں پیش کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک آیت پیش کی ہے: ﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَءُوا كِتَابِيَهْ﴾ (الحاقة: ۱۹) جو اللہ کے نیک بندے ہوں گے ان کو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ گویا داہنے ہاتھ میں نامۂ اعمال کا دیا جانا؛ یہ ان کی نجات کی علامت قرار دیا۔ اور وہ اتنے خوش ہوں گے کہ مارے خوشی کے لوگوں کو بتاتے پھریں گے، جیسے: کسی آدمی کا رِزَلٹ آیا، اور وہ اعلیٰ نمبر سے کامیاب ہوا؛ تو وہ اس کو بند کر کے جیب میں نہیں رکھ دیتا، بلکہ دوستوں کو بتاتا پھرتا ہے کہ دیکھو! یہ میرا رزَلٹ آیا ہے۔ ویسے ہی اس آیت میں ہے کہ جس کو اس کا

نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ لوگوں سے کہے گا کہ: لو! میرا نامۂ اعمال پڑھو۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پسند

۷۲۱:-وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: كَانَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم يُعْجِبُهُ التَّيَمُّنُ فی شَأْنِهِ كُلِّهِ: فی طُهُورِهِ، وَتَرَجُّلِهِ، وَتَنَعُّلِهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ہر اچھے کام (جو عزت واکرام اور نعمت کے سمجھے جاتے ہیں، ان) میں دائیں طرف سے ابتداء کرنا پسند تھا۔ چناں چہ آپ جب وضو فرماتے تھے تو دائیں طرف سے شروع کرتے تھے (دایاں ہاتھ، پھر بایاں ہاتھ۔ دایاں پیر، پھر بایاں پیر۔ اسی طرح غسل کرنے میں جیسا کہ بتلایا گیا) اور سر پر کنگھا کرنے میں پہلے دائیں طرف، پھر بائیں طرف (ڈاڑھی میں کنگھی کرتے تو پہلے دائیں طرف، پھر بائیں طرف کرتے۔ یہی سنت اور مستحب طریقہ ہے) اور جوتے پہننے میں بھی پہلے دائیں پیر میں، پھر بائیں پیر میں پہنتے تھے۔

افادات:- چند دنوں تک اس کا اہتمام کرنا پڑتا ہے، یہاں تک کہ جب آدمی کی طبیعت اس کی عادی بن جاتی ہے تو اس کے بعد خود بخود عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے، شروع میں ذرا توجہ رکھنی پڑتی ہے۔ اور اگر توجہ اور اہتمام نہیں رکھتے تو شیطان اُلٹا ہی کرواتا ہے، اسی لیے لوگ جب مسجد سے نکل رہے ہوں تو کھڑے ہو کر دیکھیے، جو توجہ کر کے جوتے پہننے والے ہوں گے، وہی دایاں جوتا پہلے پہنیں گے، ورنہ شیطان اُلٹا ہی ڈلوائے گا۔ اسی طرح مسجد میں آنے والے جب جوتے نکالتے ہیں؛ وہاں بھی شیطان اُلٹا ہی کرواتا ہے۔ اس لئے چند دنوں تک کچھ توجہ کرنی پڑے گی۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل

۷۲۲:-وعنها قالت: كَانَتْ يَدُ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اليُمْنَى لِطُهُورِهِ وَطَعَامِهِ، وَكَانَتِ الْيُسْرَى لِخَلَائِهِ وَمَا كَانَ مِنْ أَذًى.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دایاں ہاتھ غسل وغیرہ اور کھانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اور استنجاء، یا کوئی گندی چیز ہوتی (مثلاً: ناک صاف کرنی ہوتی، تو) بایاں ہاتھ استعمال ہوتا تھا۔

یہی تو کمالِ نبی ہے

افادات:- یہ سب زندگی کے آداب ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکھائے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق اپنی امت کے ساتھ ایسا تھا جیسے ایک شفیق اور مہربان باپ کا اپنی اولاد کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ باپ اپنے بچوں کو ہر ہر چیز سکھاتا ہے، اگر وہ نہیں سکھائے گا تو بچوں کو یہ سب آداب معلوم بھی نہیں ہو سکیں گے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی انداز اور طریقۂ تربیت غیروں کے لیے باعثِ اعتراض بنا۔ ابن ماجہ شریف میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ ایک یہودی نے ایک مرتبہ ان سے بطور استہزاء و مذاق کہا: ''إِنِّيْ أَرىٰ صَاحِبَكُمْ يُعَلِّمُكُمْ كُلَّ شَيْءٍ حَتّٰى الْخِرَاءَةَ'' میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے ساتھی (یعنی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم کو ہر چیز سکھاتے ہیں، یہاں تک کہ پیشاب پاخانہ کا طریقہ بھی سکھاتے ہیں؟ اس کے جواب میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: جی ہاں! نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قضائے حاجت کے موقعہ پر کیا کرنا چاہیے وہ بھی ہمیں بتایا کہ ہم قبلہ کی طرف رخ کر کے نہ بیٹھیں، دائیں ہاتھ سے استنجاء نہ کریں، تین سے کم پتھر پر اکتفاء نہ کریں، لید اور ہڈی وغیرہ

سے استنجاء نہ کریں (ابن ماجہ:۳۱۶) گویا آپ ﷺ نے ہر ہر چیز بتائی اور اس کی تعلیم بھی دی کہ بیٹھنے میں کیسی ہیئت اختیار کریں، کون سے ہاتھ سے استنجاء کریں، کون سے ہاتھ سے نہ کریں؛ یہی تو آپ ﷺ کا کمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے آپ کو بھیجا تھا اس میں چھوٹی سے چھوٹی بات بھی آپ ﷺ نے نہیں چھوڑی جس کی طرف متوجہ نہ کیا ہو۔ یہ سب وہی تعلیمات ہیں۔ اسی لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے عملی طور پر بتلایا کہ کون سے کام دائیں ہاتھ سے کیے جاتے ہیں، اور کون سے کام بائیں ہاتھ سے کیے جاتے ہیں۔ اگر ہمارا بچہ بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا ہے، یا گلاس پکڑتا ہے، تو ہم اس کو ٹوکتے نہیں، حالاں کہ اس کو محبت سے ٹوکا اور بتایا جانا چاہیے کہ: بیٹا! ایسا نہیں کیا کرتے۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہر ہر چیز بتلائی ہے، لیکن آج کل ہم لوگوں کا مزاج ایسا بنتا جا رہا ہے کہ ایسی کوئی چیز ہو تو کہتے ہیں کہ یہ تو ہماری شان کے خلاف ہے۔

آج کل کی بدتہذیبی کی بڑی وجہ

آج کل عام طور پر بدتہذیبی اور بے ادبی عام ہوتی جا رہی ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ ماں باپ اور بڑوں کی طرف سے تربیت اور ادب سکھانے کے معاملہ میں کوتاہی برتی جاتی ہے، وہ یوں سمجھتے ہیں کہ اس کو یہ بات کیا کہی جائے؟ نہیں بھائی! ان کو ہر ہر چیز بتلانی چاہیے، اگر باپ اپنے بیٹے کو نہیں سکھائے گا تو آخر اس کو کب آئے گا؟ پھر اگر بیٹا اسی طرح رہے گا تو بعد میں لوگ باپ ہی پر الزام دیں گے کہ باپ نے اس کو کھانے پینے کا طریقہ بھی نہیں سکھایا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے۔ آگے روایت آئے گی وہاں معلوم ہوگا کہ نبیٔ کریم ﷺ چھوٹوں اور بڑوں ہر

ایک پر برابر نگرانی رکھتے تھے، اگر کسی سے کوئی چیز ادب کے خلاف ہو جاتی، تو فوراً آپ اس پر تنبیہ فرماتے تھے، ٹوکتے تھے اور نصیحت فرماتے تھے۔

تربیت کا مؤثر ترین طریقہ

آج ہمارا معاملہ یہ ہو گیا ہے کہ پہلے تو ٹوکتے نہیں ہیں، نہ اس کو درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر اگر لوگوں کی طرف سے کچھ کہا جاتا ہے تو غصہ میں آکر اس کی پٹائی شروع کر دیتے ہیں۔ تربیت کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ چھوٹوں کو محبت سے بتلایا جاتا ہے، بلکہ چھوٹا ہو یا بڑا؛ کوئی بات آپ جتنی محبت سے ان کو بتائیں گے، اس پر اتنی ہی زیادہ اثر انداز ہوگی۔

ایک صحابی کی روایت پہلے گزر چکی ہے کہ ایک مرتبہ نماز کے اندر کسی کو چھینک آئی، اس پر وہ نماز کی حالت میں ''یرحمک اللہ'' کہنے لگے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے لگے۔ یہ سوچ رہے ہیں کہ مجھ سے ایسا کیا کام ہو گیا کہ سب ایسا کہہ رہے ہیں۔ مَیں نے بولنا شروع کیا کہ مَیں نے ایسا کیا کہا، تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ ان کو معلوم نہیں تھا کہ نماز میں بول نہیں سکتے۔ پھر صحابہ نے اپنی رانوں پر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ خیر! یہ کہتے ہیں کہ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن مَیں رک گیا۔ پھر نماز کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے بلایا۔ وہ صحابی فرماتے ہیں: ''وَاللّٰهِ مَا ضَرَبَنِيْ وَلَا قَهَرَنِيْ وَلَا شَتَمَنِيْ'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے نہ مارا، نہ ڈانٹا، نہ مجھ پر غصہ کیا؛ بلکہ بڑی محبت سے فرمایا کہ: یہ نماز ہے اور نماز میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، اس میں دنیا کی باتیں اور دوسری چیزیں نہیں ہوتیں۔ اب غور کیجئے کہ وہ تو بڑا آدمی تھا، تو پھر چھوٹوں کو تو اور زیادہ محبت سے بتانے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم یا تو کہتے ہی نہیں، اور جب کہنے پر آتے ہیں تو ڈنڈا لے کر آگے بڑھتے

ہیں، ہمارا حال ایسا ہے:-

اگر غفلت سے باز آیا؛ جفا کی ❁ تلافی کی بھی ظالم نے؛ تو کیا کی

پہلے تو کہیں گے ہی نہیں، اور جب کہنے پر آئیں گے؛ تو پٹائی کریں گے۔ **گویا ہمیں پٹائی کے علاوہ تعلیم وتربیت کا اور کوئی طریقہ آتا ہی نہیں ہے، حالاں کہ یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں کسی عورت کو، کسی غلام کو، بلکہ کسی جانور تک کو نہیں مارا۔

شان کے خلاف نہیں

تو بات چلی تھی کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک یہودی نے اعتراض کے طور پر ایک بات کہی تھی کہ مَیں دیکھتا ہوں کہ تمہارے ساتھی تم کو ہر چیز سکھاتے ہیں، یہاں تک کہ پیشاب پاخانہ کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ آپ سید الانبیاء اور سید الاولین والآخرین ہیں، اگلوں پچھلوں کے سردار ہیں، لیکن کبھی آپ نے یہ نہیں سوچا کہ کیا مَیں ان کو پیشاب پاخانے کا طریقہ بتاؤں؟ یہ میری شان کے مطابق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو ہر چیز سکھانے کے لیے آئے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ پورا پورا امت کو سکھا دیا۔ آج کل ہمارا مزاج ایسا بنتا جارہا ہے کہ فلاں کام تو میری شان کے خلاف ہے، بلکہ اگر کوئی اس کی طرف دھیان دیتا ہو، تو دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ: ارے مولانا! آپ اس میں کیوں دخل دیتے ہیں؟ آپ کی شان تو بڑی اونچی ہے۔ خود تو کرتے نہیں، اور کوئی بے چارہ کررہا ہے، تو اس کو روکنے کی کوششیں کرتے ہیں۔

آپ بیتی

ہمارے یہاں مدرسہ میں کسی زمانہ میں طلباء کی نگرانی میرے ذمہ تھی، جب

نماز کے اور دوسرے اوقات میں مَیں دارالاقامہ (Boarding) میں جاتا تھا تو بعض لوگ کہتے تھے کہ: آپ حدیث کی بڑی بڑی کتابیں پڑھاتے ہیں؛ اور آپ وہاں جاتے ہیں؟ مَیں کہا کرتا تھا کہ: ہم نہیں جائیں گے تو کون جائے گا؟ اور ان بچوں کو کون سکھائے گا؟ ان کی نگرانی کون کرے گا؟۔

آج کل بچے جو بگڑتے جارہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی روک ٹوک نہیں ہے، ان کی نگرانی اور نگہداشت نہیں ہے۔ ان کو تو ہر ہر چیز پر نگرانی کی ضرورت ہے۔ ایک مرتبہ آپ کسی بچے کو ٹوکیں گے، اور جب وہ دیکھے گا کہ میری غلط حرکت پر ٹوکا جارہا ہے، تو پھر دوسری مرتبہ وہ چونکے گا، اور ایسا نہیں کرے گا۔ لیکن اگر اس نے دیکھ لیا کہ کوئی ٹوکنے والا نہیں ہے، تو دھیرے دھیرے معاملہ آگے بڑھتا جائے گا۔

تربیت کا اصل طریقہ

آپ احادیث کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کسی بھی بڑے یا چھوٹے کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش آتی تو نبیٔ کریم ﷺ اس پر فوراً تنبیہ فرماتے۔ وہاں کوئی مار پٹائی نہیں ہوتی تھی، بلکہ بس ٹوک دیا کرتے تھے کہ: یہ جو ہوا وہ مناسب نہیں ہوا، یوں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن آج کل ہمارا مزاج یہ بن گیا ہے کہ کسی کو کچھ کہو مت۔ اگر کہتے ہیں تو اُسے برا معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ کچھ کہنے کا ماحول ہی نہیں رہا۔ لیکن یاد رکھئے! پھر بھی اگر آپ کسی کو محبت سے کہیں گے تو وہ ضرور سنے گا، ڈانٹ ڈپٹ اور پٹائی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، حضور ﷺ کا مزاج اور تربیت کا طریقہ یہی تھا۔

عورتوں کی تعلیم وتربیت اور ہماری کوتاہیاں

۷۲۳:- وعن أم عطية رضی اللہ عنہا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لهن في غَسْلِ ابْنَتِهِ

زَیْنَبَ رضی اللہ عنہا : إِبْدَأْنَ بِمَیَامِنِھَا ، وَمَوَاضِعِ الْوُضُوءِ مِنْھَا.

ترجمہ:- حضرت اُم عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا جب انتقال ہوا (توان کو غسل تو عورتیں دے رہی تھیں، لیکن نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پردہ کے پیچھے سے ان کو غسل دینے کا طریقہ بتلا رہے تھے کہ اس طرح غسل دو) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرما رہے تھے کہ: ان کے دائیں طرف سے غسل دینا شروع کرو، اور وضو بھی دائیں طرف سے کراؤ۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ پردہ کے اہتمام کے ساتھ عورتوں کو بھی تعلیم دی جاسکتی ہے، لیکن ہماری تو پوری زندگی گزر جاتی ہے، کبھی ہم نے معلوم ہی نہیں کیا کہ گھر کی عورتیں کس طرح کپڑے دھوتی ہیں؟ کس طرح بچوں کو استنجاء کرواتی ہیں؟ بعض عورتوں کو تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی کپڑا اگر ناپاک ہوجائے تو اس کو اس طرح دھویا جائے کہ دھونے والا اپنی طاقت کے مطابق اس کو اتنا نچوڑے کہ اس میں قطرہ بھی باقی نہ رہے، دوسری اور تیسری مرتبہ بھی اسی طرح نچوڑے، جس کی وجہ سے بہت سی جگہوں پر تو کپڑے پاک ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

چھوٹے بچے ان کے ساتھ ہوتے ہیں، ان کا پیشاب پاخانہ کپڑوں پر گر جاتا ہے تو اس کو کس طرح صاف و پاک کیا جائے؛ اس کا طریقہ ان کو معلوم نہیں ہوتا، ان ساری چیزوں کی اپنے گھروں میں نگرانی کی ضرورت ہے۔ ایک دو مرتبہ بتلائیں گے تو وہ آسانی سے عمل کرنے لگ جائیں گی۔ ہم تو اِدھر دھیان ہی نہیں دیتے۔ بچہ اگر کہیں فرش پر پیشاب پاخانہ کردے، تو اس فرش کو کس طرح پاک کرتی ہیں؟ یا کپڑوں پر پیشاب پاخانہ کردے تو کپڑوں کو کس طرح پاک کرتی ہیں؟ چارپائی پر یا لحاف پر پیشاب پاخانہ کردے، تو اس لحاف کو کس طرح پاک کرتی ہیں؟ یہ سب کبھی ہم نے ان سے پوچھا؟

اس کی طرف توجہ ہی نہیں ہے۔ حالاں کہ یہ ساری چیزیں دھیان دینے کی ہیں، اگر یہ سب ہوگا تب ہی شریعت کی دوسری تعلیمات پر عمل ہوگا۔ جب پاکی وناپاکی کا ہی اہتمام نہیں ہوگا؛ تو پھر نمازیں کیسے درست ہوں گی اور دوسری باتیں کیسے ٹھیک ہوں گی؟

یہاں دیکھئے کہ نبیٔ کریم ﷺ کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے انتقال پر جو عورتیں ان کو غسل دے رہی تھیں، نبیٔ کریم ﷺ خود ان کو پردہ کی آڑ میں سے بیٹھ کر غسل کا طریقہ بتلا رہے ہیں کہ وضو اور غسل میں دائیں طرف سے ابتداء کرو۔

مردہ کو جب غسل دیتے ہیں تو پہلے اس کو وضو کرایا جاتا ہے، پھر بائیں کروٹ پر لٹا کر دائیں کروٹ پر پانی ڈالتے ہیں، پھر دائیں کروٹ پر لٹا کر بائیں کروٹ پر پانی ڈالتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے باقاعدہ طریقہ بتلایا اور اس میں بھی آپ نے دائیں طرف سے شروع کرنے کی تلقین فرمائی۔

ان چیزوں کی طرف بھی توجہ ہو

۷۲۴:-وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ :إِذَا انْتَعَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِالْيُمْنَى، وَإِذَا نَزَعَ فَلْيَبْدَأْ بِالشِّمَالِ. لِتَكُنِ الْيُمْنَى أَوَّلَهُمَا تُنْعَلُ، وَآخِرَهُمَا تُنْزَعُ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی جوتا پہنے، تو دائیں پاؤں سے شروع کرے، اور جب نکالے تو بائیں پاؤں سے شروع کرے؛ تاکہ دائیں پاؤں میں پہلے جوتا جائے اور آخر میں نکالا جائے۔

افادات:- آستین کو چڑھانے اور اُتارنے میں بھی یہی طریقہ ہے۔ جوتا پہننے کے لئے بھی نبیٔ کریم ﷺ نے اہتمام سے ہدایت دی۔ کیا ہم نے بھی اپنے بچوں کو

کبھی اس کی طرف متوجہ کیا؟ کیا ہم نے زندگی میں کبھی بھی اپنے بچوں کو بٹھا کر ان کو جوتا پہننے کا طریقہ بتایا؟ ہمیں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان تعلیمات کو سیکھنے کی ضرورت ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتنے اہتمام سے آدابِ زندگی ہمیں بتائے ہیں، تو ہم ان کی طرف سے اتنی غفلت کیوں برتیں؟ ہم ان کو سیکھنے اور سکھانے کا اہتمام نہیں کرتے، حالاں کہ یہ تو ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لئے اِدھر توجہ ہونی چاہیے۔

۷۲۵:- وعن حفصة رضی اللہ عنہا أنَّ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم كَانَ يجعل يَمِينَهُ لِطَعَامِهِ وَشَرَابِهِ وَثِيَابِهِ، وَيَجْعَلُ يَسَارَهُ لِمَا سِوَى ذٰلِكَ.

ترجمہ:- اُم المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دائیں ہاتھ کو کھانے، پینے اور کپڑوں کے لیے استعمال فرماتے تھے (مطلب یہ ہے کہ اچھے کاموں کے لئے استعمال کرتے تھے اور ان کی شروعات دائیں ہاتھ سے کرتے تھے) اور بائیں ہاتھ کو اس کے برعکس کام یعنی گندی چیزوں میں (مثلاً: قضائے حاجت وغیرہ کے لئے) استعمال فرماتے تھے۔

۷۲۶:- وعن أَبِي هُرَيرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ أنَّ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: إِذَا لَبِسْتُمْ، وَإِذَا تَوَضَّأْتُمْ، فَابْدَأُوا بِأَيَامِنِكُمْ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم لباس (کرتہ، پائجامہ وغیرہ) پہنو، یا وضو کرو؛ تو اپنی دائیں جانب سے شروع کرو۔

افادات:- اب ہم لوگ وضو میں تو اس کا اہتمام کرتے ہیں لیکن کپڑے پہننے میں بہت سے لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے، حالاں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمت کو بڑے اہتمام سے اس کی تاکید فرما رہے ہیں۔

۷۲۷:- وعن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ أنَّ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم أتى مِنىً، فَأتَى الْجَمْرَةَ

فَرَمَاهَا ثُمَّ أَتَى مَنْزِلَهُ بِمِنًى وَنحر، ثُمَّ قَالَ لِلحَلاَّقِ: ((خُذْ)) وأَشَارَ إِلَى جَانِبِهِ الأَيْمَنِ، ثُمَّ الأَيْسَرِ، ثُمَّ جَعَلَ يُعْطِيهِ النَّاسَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وفي رواية: لما رمى الجَمْرَةَ، وَنَحَرَ نُسُكَهُ وَحَلَقَ، نَاوَلَ الحَلاَّقَ شِقَّهُ الأَيْمَنَ فَحَلَقَهُ ثُمَّ دَعَا أَبَا طَلْحَةَ الأَنْصَارِيَّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ، ثُمَّ نَاوَلَهُ الشِّقَّ الأَيْسَرَ. فَقَالَ: (احْلِقْ) فَحَلَقَهُ فَأَعْطَاهُ أَبَا طَلْحَةَ، فَقَالَ: (اقْسِمْهُ بَيْنَ النَّاسِ).

ترجمہ:- حضرت اُنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج کے موقع پر منیٰ میں تشریف لائے تو جمرہ کے پاس تشریف لے گئے، اس کی رمی فرمائی، پھر منیٰ میں جہاں آپ کی قیامگاہ تھی وہاں تشریف لے گئے اور جانور ذبح کیا (قربانی کی) پھر بال کاٹنے والے سے فرمایا: میرے بال کاٹو، اس وقت آپ نے اپنے سر کے دائیں حصہ کی طرف اشارہ کیا، پھر بائیں طرف اشارہ کیا؛ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ بال لوگوں کو عطا فرمانے لگے۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت اُبوطلحہ اُنصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا کر بال ان کے حوالے کئے اور فرمایا: یہ لوگوں میں تقسیم کردو۔ چناں چہ انہوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بال مبارک لوگوں کے اندر تقسیم کئے۔

افادات:- اس سے ہمیں ایک بات یہ سیکھنے ملی کہ جب ہم کسی نائی کے پاس بال بنوانے جائیں، تو پہلے دائیں طرف، پھر بائیں طرف سے بال کٹوانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

کتاب آداب الطعام

کھانے کے آداب

باب التسمیۃ فی أولہ والحمد فی آخرہ

کھانے سے پہلے بسم اللہ اور کھانے کے بعد الحمد للہ پڑھنا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آدابِ زندگی

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہاں سے کھانے کے آداب بتلا رہے ہیں۔

جیسا کہ بتایا تھا کہ زندگی گزارنے کا جو عمدہ سے عمدہ طریقہ ہوسکتا ہے وہ پورا نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں سکھایا ہے۔ کھانا کھانا ہو تو کس طرح کھایا جائے، کوئی چیز پینی ہو تو کس طرح پی جائے، لیٹنا ہو تو کیسے لیٹیں، قضائے حاجت کیسے کریں، ''معاشرت'' یعنی لوگوں کے ساتھ مل جل کر جو زندگی گزارتے ہیں تو کس کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے، باپ کے ساتھ، ماں کے ساتھ، بھائی کے ساتھ، بہن کے ساتھ، بیوی کے ساتھ، پڑوسی کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کرنا چاہیے، اس کی ساری تفصیلات بتائی ہیں؛ یہی ''معاشرت'' کہلاتی ہے، اور یہ سب ''آدابِ معاشرت'' کہلاتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آج کل لوگوں نے دین کو صرف عبادت کے اندر محدود کر رکھا ہے کہ نماز روزہ وغیرہ جو عبادتیں ہیں ان کا اہتمام کیا جاتا ہے، اور ''معاشرت'' یعنی زندگی گزارنے کا جو طریقہ ہے اس کے متعلق تو یوں سمجھتے ہیں کہ شریعت نے کوئی ہدایت دی ہی نہیں ہے، اس معاملہ میں ہم آزاد ہیں جس طرح چاہیں کریں؛ حالاں کہ ایسی بات نہیں ہے۔ شریعت میں تو ہر ہر چیز کے متعلق مکمل تفصیلات بتلائی گئی ہیں۔

کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا فائدہ

۷۲۸:- وعن عُمَرَ بنِ أبي سَلمة رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ لی رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ((سَمِّ اللهَ، وَكُلْ بِيَمِينِكَ، وكُلْ مِمَّا يَلِيكَ)) متفقٌ عَلَيْهِ

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عمر بن اُبوسلمہ رضی اللہ عنہما (جو اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے صاحبزادہ ہیں، ان کے پہلے شوہر حضرت ابوسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پیدا ہوئے تھے، حضرت اُبوسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال کے بعد حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ ہوا تو یہ اپنے چھوٹے بچوں کو ساتھ لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے یہاں آئی تھیں، اس لیے حضرت عمر بن اُبوسلمہ رضی اللہ عنہما نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تربیت ونگرانی میں تھے ایک مرتبہ وہ کھانے کے لیے بیٹھے تھے، خود) فرماتے ہیں (کہ میرا ہاتھ اِدھر اُدھر گھومنے لگا، جیسے: بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ اِدھر ہاتھ مارا، اُدھر ہاتھ مارا۔تو) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجھے (تین چیزیں) بتلائیں [۱]: کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھو [۲]: اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ [۳]: اپنے سامنے سے کھاؤ (اِدھر اُدھر سے مت کھاؤ۔)

افادات:- باب کا عنوان بھی یہی قائم کیا ہے کہ کھانے کے معاملہ میں پہلا ادب یہ ہے کہ کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھے اور اللہ کا نام لے۔آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ روزی اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی مَیں استعمال کر رہا ہوں، کھا رہا ہوں، پی رہا ہوں، پہن رہا ہوں؛ یہ سب چیزیں کس کی دی ہوئی ہیں؟ جتنی بھی چیزیں ہیں ان سب میں پہلے یہ دیکھنا ہے کہ یہ ساری نعمتیں کہاں سے آئی ہیں؟ اللہ تعالیٰ ہی نے عطا فرمائی ہیں اور اسی کی دی ہوئی ہیں، تو جس نے مجھے دی ہے اسی کے نام سے میں اس کو استعمال کرنا شروع کروں۔کھانا جس نے دیا ہے تو کھانا شروع کرنے سے پہلے مجھے اسی کا نام لینا چاہیے، تبھی تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق پیدا ہوگا اور اس کا استحضار رہے گا، پھر اس کے احکامات پر عمل کی توفیق ہوگی، اور پھر اس کی ذات کے ساتھ رشتہ قوی ہوگا۔

مثلاً: ایک آدمی کو کھانا کھلایا جائے اور بتلایا جائے کہ فلاں صاحب کی طرف سے دعوت ہے، تو اس کے دل میں داعی کے متعلق شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، پھر شکر کا

یہی جذبہ داعی کے ساتھ محبت پیدا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، پھر اگر بار بار یہی سلسلہ ہوتا رہے تو یہی چیز آگے جا کر اس کی اطاعت وفرمانبرداری کی طرف آمادہ کرے گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرتے وقت آدمی اگر یہ سوچے کہ میں جو کھانا کھانے جارہا ہوں، یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے؛ تو اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ رشتہ مضبوط ہوگا۔

کیا ہم نے کبھی سوچا؟

اور کیا ہم نے کبھی سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے کھانے کے لیے کیسا عجیب وغریب نظام چلایا ہے؟ ہم روٹی توڑ کر کھاتے ہیں لیکن کیا کبھی سوچا کہ یہ روٹی کس طرح بنی؟ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے فضائلِ صدقات میں لکھا ہے کہ ایک بزرگ کے یہاں ایک شخص مہمان ہوئے، روٹیاں رکھی گئیں، تو جیسے بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ اُلٹ پُلَٹ کر دیکھتے ہیں کہ کون سی پکی ہے، اور کون سی جلی ہوئی ہے، تا کہ ان میں جو اچھی ہو اسی کو نکال کر کھائیں۔ انہوں نے بھی اُلٹ پُلَٹ کرنا شروع کی تو ان بزرگ نے کہا: کیا دیکھتے ہو؟ ایک روٹی جو تیار ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے، اس پر تین سو ساٹھ (۳۶۰) محنتیں لگ چکی ہیں۔

ظاہر ہے کہ آدمی ذرا سوچے تو سہی کہ دانہ زمین کے اندر بویا جاتا ہے، تو زمین میں بونے سے پہلے زمین کو ہَل کے ذریعہ نرم کیا جاتا ہے، پھر اس کے اندر کھاد ڈالی جاتی ہے، پانی ڈالا جاتا ہے۔ پھر جو پانی بارش کے ذریعہ سے آتا ہے، اس کے متعلق سوچے کہ بارش کیسے تیار ہوئی؟ سورج کی گرمی سمندروں کے اوپر پڑی، وہاں سے بھاپ اٹھی، بادل بنے، اور معلوم نہیں کیسے کیسے فرشتے ان بادلوں کو کہاں کہاں سے چلا کر کہاں لے گئے، اور کہاں انہوں نے پانی برسایا، پھر یہ پانی زمین کے اندر گیا، پھر زمین میں

بیج ڈالا گیا، اس کی پوری نگرانی کی گئی، پھر زمین سے کونپل نکلی۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھو کہ اس کی کونپل کتنی نازک ہوتی ہے کہ ایک چھوٹا سا بچہ بھی انگلی مار کر اس کو مسل کر رکھ دے، لیکن اللہ تعالیٰ نے سخت زمین کو پھاڑ کر اسے باہر نکالا، پھر وہ بڑھا اور اس کے اندر سے دانہ نکلا، اور اس دانہ کے اوپر سورج کی گرمی لگی، اس نے اس کو پکایا، اور نہ معلوم کیا کیا محنتیں ہوئیں، نگرانی اور چوکیداری کرنے والوں نے چوکیداری اور نگرانی کی، پھر اس کی کٹائی ہوئی، کھلیان لے جایا گیا، وہاں جانوروں کے ذریعہ سے دانے اور بھوسے کو الگ کیا گیا، پھر وہ بازار میں پہنچا، پہلے بڑے بیوپاری کے پاس گیا، پھر چھوٹے بیوپاری کے پاس گیا، اور پتہ نہیں کہاں کہاں ہوتا ہوا یہاں آیا، پھر چکّی میں پیسا گیا، اس کے بعد آٹا تیار ہوا اور اب اس کو پکایا گیا۔ آدمی سوچے تو سہی کہ ایک روٹی کے تیار ہونے میں کتنی محنتیں ہوئیں؟ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند ❁ تا تو نانے بہ کف آری و بہ غفلت نہ خوری

بادل، ہَوا، اور چاند و سورج؛ یہ سب اللہ تعالیٰ نے تمہاری خدمت کے لیے ایک نوکر کی طرح بے گار کے طور پر لگا رکھے ہیں۔ نوکر تو وہ ہوتا ہے جسے ہمیں تنخواہ بھی دینی پڑتی ہے، لیکن اگر کوئی حاکم کسی کو زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائے اور کہے کہ یہ کام کرو، اور اس کے اوپر کوئی مزدوری بھی نہ دی جائے؛ اسے بے گاری کہتے ہیں۔ تو اس کائنات کی جتنی بھی چیزیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے بے گار رکھ دی ہیں، یعنی ہماری خدمت کے لیے مقرر کی ہیں، اس پر ہمیں کوئی تنخواہ و معاوضہ نہیں دینا پڑتا۔ یہ سورج کی روشنی اور گرمی استعمال کر رہے ہیں، اگر بِل دینا پڑتا تو ہمارا کیا حال ہوتا؟ بجلی کا بِل ادا کرنے سے ہم عاجز ہو جاتے ہیں، تو سورج کی روشنی کا بِل کہاں ادا کر پاتے؟ اسی طرح ہَوا استعمال کر رہے ہیں اگر اس کا میٹر لگا دیا جاتا؛ تو ہمارا کیا حال ہوتا؟۔

تو یہ ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مفت میں مل رہی ہیں، اس لیے آدمی کھانا کھانے کے لیے جب بیٹھے تو اس کو سوچنا چاہیے کہ میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو استعمال کرنے جارہا ہوں، اسی لئے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمارہے ہیں کہ: جس ذات نے ہمیں یہ کھانا دیا ہے پہلے اسی کا نام لے کر کھانا شروع کرو، اور بسم اللہ پڑھو، تاکہ اس کے ساتھ تعلق قائم ہو، اس کی محبت دل کے اندر پیدا ہو۔ ہمارے سامنے تو جب کھانا آتا ہے تو ہم بھوک کی وجہ سے ایسے بے تاب ہوتے ہیں کہ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں، بسم اللہ بھی یاد نہیں رہتی، کبھی یہ سوچتے ہی نہیں کہ یہ کھانا کہاں سے آیا؟ حالاں کہ صرف ایک لمحہ کے لئے استحضار کرلینے کی ضرورت ہے۔ آدمی ذرا سوچے کہ اس وقت مجھ سے اللّٰہ کا نام کیوں بلوایا جارہا ہے!

ایک ہی نعمت میں کئی نعمتیں

ہمارے اکابر فرماتے ہیں: صرف کھانا ہی نعمت نہیں ہے، بلکہ جس وقت آدمی کھانا کھارہا ہے، اسی وقت اللہ تعالیٰ کی کئی اور نعمتوں کو بھی وہ استعمال کررہا ہے۔ جیسے: اگر کھانا بغیر لذت کا ملتا، تب بھی ہمیں کھانا ہی پڑتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اتنا ہی نہیں کیا کہ صرف کھانا دے دیا، بلکہ لذت والا کھانا دیا۔ تو خود کھانا ایک نعمت ہے، پھر جو لذت اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر رکھی وہ دوسری نعمت ہے۔ پھر عزت کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہمیں دے رہے ہیں، ورنہ ایسا ہوتا کہ بے عزتی کے ساتھ ڈال دیا جاتا جیسے: بعضوں کے سامنے ذلت کے ساتھ ڈال دیا جاتا ہے، ہمارے ساتھ ایسا تو نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بے عزتی کے ساتھ کھلایا۔ پھر بھوک دی، یہ مستقل ایک نعمت ہے، ورنہ کھانا بھی ہو، لذت بھی ہو، اور عزت کے ساتھ دسترخوان پر بٹھا کر ہمیں کھلائیں، لیکن ہمارے اندر کھانے کا تقاضہ ہی نہ ہوتا، بھوک ہی

نہ لگتی؛ تو کھانے کا کیا لطف آتا! معلوم ہوا کہ بھوک بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ پھر جس وقت ہم کھانا کھا رہے ہوتے ہیں تو عافیت کے ساتھ کھا رہے ہوتے ہیں۔ ورنہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو کھانا بھی ملا، لذت والا بھی ملا، عزت کے ساتھ ملا، بھوک بھی لگی ہوئی ہے، لیکن کوئی مصیبت آگئی، ایک دم سے کوئی عزیز بیمار ہوگیا، کسی پر ہارٹ کا حملہ ہوگیا؛ تو اب کھانا کھا رہے ہیں، لیکن بالکل بے دلی کے ساتھ کھا رہے ہیں، اس میں عافیت نہیں ہے، جب آدمی عافیت کے ساتھ کھانا کھاتا ہے تو پُرسکون انداز سے کھاتا ہے۔ اچھا! پھر دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کا مزہ بھی الگ ہی ہوتا ہے، اس لئے کہ اکیلے بیٹھ کر کھانے کی صورت میں اتنا نہ کھا پاتا، جتنا دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کھا سکتا ہے۔ تو غور کرو کہ اس ایک نعمت کے اندر بے شمار نعمتیں شامل ہوجاتی ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ آدمی ان سب چیزوں کو سوچے، جب آدمی یہ ساری چیزیں سوچے گا تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے گا، اور پھر اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق پیدا ہوگا، اسی تعلق کو پیدا کرنے کے لیے ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے اللہ کا نام لو۔

مضطر کو روزی پہنچانے کا سرکاری انتظام

اور واقعہ یہ ہے روزی کے معاملہ میں اگر آدمی غور کرے تو اس کو ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ روزی کے لیے کیسا عجیب وغریب انتظام فرماتے ہیں۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا سنایا ہوا ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں، ان کو یہ واقعہ افغانستان کے مجددی خاندان کے ایک بزرگ نے بتایا تھا، وہ اپنے خاندان کے بڑے صاحبِ رسوخ عالم بھی تھے، جس زمانہ میں ظاہر شاہ افغانستان کا حکمران تھا اس زمانہ میں ایک موقعہ پر ان کو بادشاہ کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ ہم آپ کو ایک خاص سفارت کے لیے

ایک خاص پیغام لے کر موسکو (Moscow) بھیجنا چاہتے ہیں، آپ تیاری کر لیں۔ چناں چہ انہوں نے تیاری کر لی، ہوائی جہاز کا سفر تھا، گھر والوں نے ان کو ایک بڑا سا ٹفن تیار کر کے دیا کہ ہوائی جہاز میں کھانا تو ملے گا، لیکن کیا معلوم وہ کیسا ہوتا ہے، اس لئے یہ کھانا ساتھ لے جائیے، بہت بڑے ٹفن میں بہت کچھ بنا کر دیا تھا۔ اچھا! ان کو یہاں سے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ پہلے آپ کو کابُل سے دوشنبہ (جو وہیں ایک مقام کا نام ہے) جانا ہے، پھر وہاں سے آگے جانے کی ہدایت وہیں سے دی جائے گی، پیغام آنے تک آپ کو ایئر پورٹ کے لاؤنج ہی میں انتظار کرنا ہے۔

یہ کہتے ہیں کہ میں دوشنبہ پہنچا اور لاؤنج میں بیٹھا ہوا اس انتظار میں تھا کہ آگے کیا ہدایت ملتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے شیشہ میں سے مَیں نے ایک منظر دیکھا کہ باہر ایک کوڑا دان تھا، اس کے پاس ایک عورت آئی اور کوئی چیز اُٹھا کر کپڑے میں لپیٹی اور جلدی جلدی جانے لگی۔ مَیں اُٹھا اور باہر نکل کر اس سے پوچھا: یہ کیا ہے؟ وہ کہنے لگی: یہ میرا معاملہ ہے۔ انہوں نے کہا: مجھے بتاؤ۔ جب دیکھا تو ایک مری ہوئی مرغی تھی جو اس عورت نے اٹھائی تھی، حالاں کہ وہ عورت شریف معلوم ہو رہی تھی، اس سے کہا: یہ کیوں لے جا رہی ہو؟ اس نے کہا: میری حالت ایسی ہے کہ میرے لیے اس وقت اس کا کھانا جائز ہے۔ فوراً ان کو خیال آیا، اس سے کہا کہ: اس کو پھینک دو اور ٹھہرو۔ پھر انہوں نے وہ ٹفن جو گھر سے ساتھ لائے تھے، جس میں وافر مقدار میں کھانا تھا وہ پورا اُٹھا کر اس عورت کے ہاتھ میں دے دیا کہ اس کو لے جاؤ، اور واپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ان کے نام کا اعلان ہوا، ان کو بلایا گیا اور بتایا گیا کہ آپ کو جس مقصد کے لیے وہاں بھیجا جا رہا تھا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اس لئے آپ واپس آجائیں، وہ واپس گھر آگئے اور سوچنے لگے کہ، آخر مجھے وہاں کیوں بھیجا گیا تھا؟ بہت سوچنے کے بعد نتیجہ یہی نکلتا ہے

کہ اس عورت کو ٹفن پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سرکاری طور پر یہ انتظام کیا تھا۔

دوسروں کے نام سے کھلاتے ہیں

اس لیے مَیں دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں کسی بڑے آدمی نے کہلوایا کہ فلاں وقت آپ کے یہاں آرہے ہیں، اور کھانا کھائیں گے، اس لیے ان بڑے آدمی کے شایانِ شان کھانا تیار کروایا جاتا ہے، لیکن وقت آنے پر اطلاع ملتی ہے کہ وہ نہیں آئیں گے، اور پھر دوسرے کچھ مہمان آجاتے ہیں، لہٰذا ان کے سامنے وہ کھانا رکھا جاتا ہے۔ اب یہ مہمان اگر پہلے سے اطلاع بھی کرتے تو ان کے لیے اتنا اہتمام نہیں کیا جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کو یہی سارے پکوان کھلانا منظور تھے تو دوسرے کے نام سے ان کے لئے انتظام کروایا گیا۔

چیونٹی کی روزی کا منظر

ہم نے اپنے بچپن میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ مضمون نگار نے تصورات کے اندر ایک عمدہ منظر قائم کیا تھا کہ افغانستان کے فلاں علاقہ میں بادام کا ایک باغ ہے، وہاں بادام لگے، جب سیزن آیا تو بادام اتارے گئے، ان کو بوریوں میں بھرا گیا، وہاں سے پاکستان لائے گئے، وہاں کے بازار میں بکے، ایک بیوپاری اسے ہندوستان لایا، دہلی کے کسی بازار میں فروخت ہوکر سورت آئے، اور سورت کے بیوپاری سے آپ نے خریدے، اپنے گھر لائے، پھر کسی مولوی صاحب کی دعوت کی تو اس میں زردہ پکایا جس میں وہی بادام ڈالا گیا، ان صاحب نے کھایا، اور کھاتے وقت دانتوں کے اندر اس بادام کے کچھ ذرّات رہ گئے، وہ واپس لوٹ رہے تھے، پلیٹ فارم پر بیٹھ کر خلال کر رہے تھے کہ اس خلال کے دوران ایک ذرّہ دانت میں سے نکلا، انہوں نے اسے

پھینکا، وہاں ایک چیونٹی تھی اس نے اس کو اُٹھالیا۔

یہ سارا ایک تصوراتی منظر قائم کیا گیا ہے جس سے وہ یہی بتانا چاہتا ہے کہ چیونٹی کی روزی تو اتنی سی ہی ہے، اس کو تھوڑا اکلو دو کلو چاہیے، اس کو تو ایک دو ذرّے ہی چاہئیں، اس کی روزی پہنچانے کا اللہ تعالیٰ نے کیسا عجیب انتظام کیا کہ اتنی دور ایک چیز پیدا ہوئی جو اس کی روزی تجویز تھی تو اس تک پہنچائی۔ کیا کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ اس چیونٹی کے منہ کے اندر جو ذرّہ پہنچا ہے، وہ کہاں سے کس طرح آیا؟ حقیقت کی دنیا میں اس سے بھی زیادہ عجیب واقعات رونما ہوتے ہیں؛ لیکن ہم غور نہیں کرتے۔

روزی کا انتظام؛ ہمارے بس کی بات نہیں

ہم بھی بہت سی مرتبہ کیلا کھا کر اس کا چھلکا پھینک دیتے ہیں اور کوئی بکری آ کر اس کو اُٹھا کر کھالیتی ہے۔ اب سوچنے کی ضرورت ہے کہ وہ کیلا کہاں تیار ہوا تھا، کہاں کہاں سے ہو کر ہمارے ہاتھ میں آیا، ہم نے کھایا اور چھلکا پھینکا، اور اس بکری نے کھایا اب بکری کی روزی تو یہی چھلکا ہے، اس کو کیلا نہیں کھانا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے لیے چھلکا ہی مقدر ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے یہ چھلکا کہاں سے بھجوایا؛ یہ سوچنے کی بات ہے۔ اس لیے صرف انسان ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کے واسطے- چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی، چیونٹی ہو یا بکری- روزی کا انتظام کیا ہے، ہر ایک کو اللہ تعالیٰ روزی پہنچا رہا ہے اور روزی پہنچانے کا اس نے جو ذمہ لے رکھا ہے اس کو وہ پورا کر رہا ہے۔ انسان اگر یہ چیز سوچے تو واقعہ یہ ہے اس میں اس کے لئے بڑی عبرت کا سامان موجود ہے، کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ یہ کام کر سکے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسی حکومت دی تھی کہ اس سے پہلے نہ کسی کو ملی اور نہ بعد میں کسی کو ملے گی۔ ایک مرتبہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: باری تعالیٰ! مَیں ایک سال کے لیے تمام مخلوق کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: اے سلیمان! یہ تمہارے بس کا کام نہیں ہے۔ کہا: ایک مہینے کی۔ کہا: نہیں کرا سکتے۔ کہا: ایک ہفتہ کی۔ کہا: نہیں کرا سکتے۔ کہا: ایک دن کی۔ تو کہا: نہیں کرا سکتے، لیکن اچھا چلو، تم کہتے ہو تو ایک دن کی کر کے دیکھ لو۔ انہوں نے کھانا پکوانا شروع کیا، ان کے تابع تو جنات بھی تھے، انہوں نے جنات اور انسان سب کو کام پر لگایا، اور تمام جگہوں سے بہت سارا کھانا منگوایا اور آٹھ روز تک پکوایا جاتا رہا۔ پھر سمندر کے کنارے دستر خوان لگایا گیا، اس لئے کہ اتنی بڑی جگہ اور کہاں ملتی۔ اور جو کھانا پکوایا تھا وہ سب وہاں رکھ دیا، پھر سوچا کہ کس سے شروعات کی جائے، تو خیال آیا کہ سمندر کی مخلوق سے ابتداء کی جائے، چناں چہ اعلان کرایا۔ ایک مچھلی باہر آئی اور ذرا سی دیر میں سب کچھ چٹ کر گئی اور کہنے لگی کہ اور کچھ ہے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام کہنے لگے: اب کیا چاہیے؟ اس نے کہا: ابھی تو میری بھوک باقی ہے۔ پھر اس مچھلی نے کہا: آج جو کھایا اس کا ڈبل روزانہ ایک وقت کھاتی ہوں اور جب سے میں پیدا ہوئی ہوں میرا اللہ مجھے دو وقت برابر کھلا رہا ہے، لیکن اے سلیمان! آج تمہاری دعوت کی وجہ سے مجھے بھوکا رہنا پڑا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کہنے لگے: روزی دینا اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، کسی انسان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ ہی تمام مخلوق کو روزی پہنچانے والا ہے۔

تو بسم اللہ پڑھنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ ویسے ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعہ

بندہ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک تعلق پیدا کیا جارہا ہے۔ صرف اپنے خیال، زاویہ نگاہ، اور سوچنے کے انداز کو بدلنے کی ضرورت ہے، اگر ادھر دھیان دیا جائے گا تو دھیرے دھیرے یہی چیز اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ بنے گی۔

اس روایت میں ایک ادب یہ بتلایا کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھی جائے۔ اور دیکھو! حضرت عمر بن اُبوسلمہ رضی اللہ عنہما چھوٹے بچے تھے، لیکن چھوٹا سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو چھوڑ نہیں دیا، بلکہ ان کو ہدایات دیں اور آداب سکھائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پچھلے کئی ابواب سے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی کے آداب سے متعلق نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو تعلیمات ہیں ان کو پیش کرنا شروع کیا ہے، چناں باب کا عنوان قائم کیا تھا: "التَّسۡمِیَۃُ فِیۡ أَوَّلِہٖ وَالۡحَمۡدُ فِیۡ آخِرِہٖ" کھانے سے پہلے اللہ کا نام لینا اور کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور تعریف بیان کرنا۔ یہ کھانے کے آداب میں سے ہے۔ اس باب میں کھانے کے آداب سے متعلق دو چیزیں بتائی ہیں۔ گزشتہ مجلس میں ایک آ چکی ہے، آج حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت پیش کررہے ہیں۔

شروع میں نہیں تو جب یاد آئے

۷۲۹:- وعن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمۡ فَلۡيَذۡكُرِ اسۡمَ اللّٰهِ تَعَالَى، فَإِنۡ نَسِيَ أَنۡ يَذۡكُرَ اسۡمَ اللّٰهِ تَعَالَى فِي أَوَّلِهِ، فَلۡيَقُلۡ: بسم اللّٰهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی جب کھانے کا ارادہ کرے؛ تو اللہ تعالیٰ کا نام لے، اور اگر کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو درمیان میں جب بھی اس کو یاد آئے: "بِسۡمِ اللّٰہِ أَوَّلَہٗ وَآخِرَہٗ" پڑھ لے۔

افادات:- صرف "بسم اللہ" کہا تب بھی سنت تو ادا ہو جائے گی، اور اگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پوری پڑھے تو بہت اچھا ہے اور عام طور پر کھانے سے پہلے یہ دعا پڑھی جاتی ہے: "بِسۡمِ اللّٰہِ وَبَرَکَۃِ اللّٰہِ" (المستدرک علی الصحیحین للحاکم/حدیث:۷۰۸۴) اصل تو یہ ہے کہ کھانے کا عمل جب شروع ہو، اس وقت اللہ کا نام لیا جائے؛ یہی مستحب اور

ادب ہے، لیکن اگر کوئی آدمی شروع میں اللہ کا نام لینا بھول جائے اور درمیان میں یاد آجائے تو یہ نہ سمجھے کہ میں تو محروم ہو گیا، بلکہ نبی کریم ﷺ نے اس کا بھی طریقہ بتادیا کہ درمیان میں جب یاد آجائے تو ''بِسْمِ اللّٰہِ أَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ'' پڑھ لے یعنی اللہ کا نام شروع میں بھی اور آخر میں بھی لیتا ہوں (سنن ابی داود، باب التَّسْمِيَةِ عَلَى الطَّعَامِ) ایک روایت میں یہ بھی ہے: ''بِسْمِ اللّٰہِ أَوَّلَهٗ وَأَوْسَطَهٗ وَاٰخِرَهٗ'' شروع میں، درمیان میں اور آخر میں اللہ کا نام لیتا ہوں۔ (تحفۃ الذاکرین بعدۃ الحصن الحصین من کلام سید المرسلین/ص: ۱۹۲)

بہرحال! نبی کریم ﷺ نے یہ بھی ایک طریقہ بتادیا۔ کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا کوئی فرض اور واجب نہیں ہے کہ اگر چھوٹ گیا تو اس کی قضاء کی جائے، لیکن ایک نیک عمل ہے، اور شریعت کی تعلیمات ہمیں یہ بتلاتی ہیں کہ جو کسی عمل کا اپنے آپ کو پابند بنائے، اس کو چاہیے کہ اپنے عمل پر اہتمام کے ساتھ پابندی کے ساتھ عمل کرتا رہے، اس کو چھوڑنے کی نوبت نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کسی ایک لائن اور طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری اور نیکیاں حاصل کرنے کی توفیق دی اور نیکی حاصل کرنے کا جو طریقہ آپ نے اپنی زندگی میں جس وقت جس اعتبار اور جس لائن سے بھی اپنا رکھا ہے، وہ طریقہ اگر کسی وجہ سے اپنے وقت پر چھوٹ گیا تو اس کو دوسرے وقت ادا کرلو، اگرچہ وہ فرض اور واجب نہیں، نہ اس کی قضاء واجب ہے، لیکن جب وہ نیکی کا ایک کام ہے جو ہم اپنے نامۂ اعمال میں اس وقت پر اندراج نہ کرسکے، اور درمیان یا اخیر میں یاد آگیا، تو اسی وقت پڑھ لیں۔

حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کا معمول

ہمارے بزرگوں نے اسی حکم سے ایک اور بات بتلائی ہے۔ ہمارے حضرت

مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خادمِ خاص حضرت مولانا ابراہیم صاحب پانڈور افریقی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: بعض مرتبہ سفر میں دیکھا کہ کسی وجہ سے حضرت کے نوافل جن کا معمول ہوا کرتا تھا وہ ادا نہیں ہو پائے، مثلاً: مغرب کے بعد اوابین کی عادت تھی، اور کسی وجہ سے وہ ادا نہ ہو پائے، جیسے: نماز کے بعد کچھ لوگوں سے ملنا ہے، یا بیان کا پروگرام رکھ دیا گیا ہے، اگر اوابین میں مشغول ہوتے ہیں تو جو لوگ سننے کے لیے بیٹھے ہیں ان کو انتظار کرنا پڑتا ہے، ان کو انتظار کی زحمت نہ ہو اس لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اپنی اوابین کو روک کر آدمی پروگرام میں مشغول ہو، تو مولانا فرماتے ہیں: حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ مغرب کے بعد وہ نوافل ادا کرنے کی نوبت نہیں آئی کیوں کہ عشاء تک بیان میں مشغولی رہی تو جب عشاء کی اذان ہوتی تھی تو عشاء کی سنتیں ادا فرماتے تھے اور ساتھ میں ان نوافل کو بھی ادا فرما لیتے تھے۔

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل

حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے تھے، ان کے متعلق لکھا ہے کہ: ایک مرتبہ کسی جگہ جا رہے تھے، مغرب کے بعد وہاں پہنچنا تھا، لیکن وقت پر نہیں پہنچ پائے، راستہ میں مغرب کی نماز پڑھنے کی نوبت آئی تو اس خیال سے کہ وہاں لوگ انتظار میں ہوں گے مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعت سنتِ مؤکدہ ادا کیں اور اوابین چھوڑ کر جہاں جانا تھا وہاں پہنچے، لوگ پہلے سے انتظار ہی میں تھے، بیان میں مشغول ہو گئے، اسی میں عشاء کا وقت آ گیا۔ عشاء کے بعد پھر کچھ دیر تک مشغولی رہی۔ بعد میں ساتھیوں سے پوچھا: بھائی! اوابین کا کیا ہوا؟ کہا: حضرت! وہ تو چھوٹ گئیں، اس لیے کہ پروگرام میں مشغول ہو گئے تھے، اگر اوابین میں مشغول ہوتے تو لوگوں کو

انتظار کی زحمت برداشت کرنی پڑتی، تو حضرت نے اپنے ماتحتوں کی تربیت کے لیے بتایا کہ جب عشاء کی اذان ہوئی تو اذان اور نماز کے درمیان میں جو وقت ملا تھا، ہم نے تو اس وقت اوابین بھی ادا کرلی۔ پھر فرمایا: اگر چہ یہ فرض اور واجب نہیں، لیکن جب ہم اس کے عادی ہوگئے ہیں کہ اپنے نامۂ اعمال میں روزانہ اتنی نفل کا ثواب لکھوائیں، تو آج کیوں خالی جانے دیں، اگر اس مقررہ وقت پر نہ لکھوا پائے تو بعد میں جب اللہ تعالیٰ موقعہ دے اس وقت اس کا اہتمام کرلینا چاہیے۔ بزرگوں سے یہی چیزیں سیکھنے کی ہوتی ہیں۔

ہمارے دیگر اکابر کو بھی دیکھا کہ وہ اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ کوئی معمول وقت پر ادا نہ ہو پایا تو دوسرے وقت میں اس کو- قضاء کی نیت سے نہیں، لیکن- ادا کرلیتے ہیں، اس لیے کہ جس نیک عمل کی پابندی کر رہے تھے، کیوں اس عمل سے محروم رہیں۔ اس روایت میں نبیٔ کریم ﷺ نے جو طریقہ بتایا کہ کھانے کے شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھی اور درمیان میں یاد آ گیا تو آدمی یہ سوچے کہ شروع میں تو نہیں پڑھ سکا تو اب درمیان میں تو پڑھ لوں۔

مسنون دعائیں؛ حفاظت کا ذریعہ

۷۳۰:- وعن جابرٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسول اللہ ﷺ يقولُ: إِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ بَيْتَهُ، فَذَكَرَ اللهَ تَعَالَى عِنْدَ دُخُولِهِ، وَعِنْدَ طَعَامِهِ، قَالَ الشَّيْطَانُ لِأَصْحَابِهِ: لَا مَبِيتَ لَكُمْ وَلَا عَشَاءَ. وَإِذَا دَخَلَ فَلَمْ يَذْكُرِ اللهَ تَعَالَى عِنْدَ دُخُولِهِ، قَالَ الشَّيْطَانُ: أَدْرَكْتُمُ الْمَبِيتَ؛ وَإِذَا لَمْ يَذْكُرِ اللهَ تَعَالَى عِنْدَ طَعَامِهِ، قَالَ: أَدْرَكْتُمُ الْمَبِيتَ وَالْعَشَاءَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے

ہوئے سنا: جب کوئی آدمی اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ کا ذکر کرتا ہے، دعا پڑھتا ہے، اور جب کھانے کے لیے بیٹھتا ہے تو اس وقت کی دعا پڑھتا ہے؛ تو شیطان اپنے لشکر سے کہتا ہے: اس گھر میں نہ تو قیام کی گنجائش ہے اور نہ کھانے کا کوئی انتظام ہے۔ اور جب آدمی اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ کا نام نہیں لیتا تو شیطان اپنے لشکر سے کہتا ہے: تم کو اس گھر میں ٹھکانہ تو مل گیا۔ اور جب کھانے کے لیے بیٹھتا ہے اور بسم اللہ نہیں پڑھتا، تو شیطان اپنے رفقاء سے کہتا ہے: ٹھکانہ بھی مل گیا اور کھانا بھی مل گیا۔

افادات:- لہٰذا جب آدمی گھر میں داخل ہو تو وہ دعا پڑھ لینی چاہیے جو نبیٔ کریم ﷺ نے ہمیں سکھائی ہے: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلِجِ، وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ، بِسْمِ اللهِ وَلَجْنَا، وَبِسْمِ اللهِ خَرَجْنَا، وَعَلَى اللهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا (سنن ابی داود: ۵۰۹۶) اگر دعا یاد نہ ہو تو اس کو لکھ کر گھر کے دروازہ پر لگا دو؛ تاکہ جب داخل ہو تو اس پر نظر پڑے تو یاد آجائے، ایک مدت تک جب یہ معاملہ رہے گا تو ان شاء اللہ عادت پڑ جائے گی، اور پھر آسان ہو جائے گا۔

پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ایک تو ان دعاؤں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ایک خاص نسبت پیدا ہوتی ہے، جب آدمی موقع بہ موقع، ہر کام میں ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کا نام لے گا اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں بیٹھے گی، اللہ کی ذات کے ساتھ تعلق قائم ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی یاد ہر وقت باقی رہے گی۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اس طرح آدمی اللہ تعالیٰ سے خیر مانگ رہا ہے، یعنی کہ میرا گھر میں داخل ہونا بھی بہتر اور اچھے انداز میں ہو۔ کیوں کہ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کی غیر موجودگی میں گھر میں کیا ہوا ہے، ہو سکتا ہے کہ گھر میں داخل ہوئے اور بیوی نے کہا کہ بچہ کو بخار ہے۔ جب پہلے ہی سے بہتری مانگ لی اور کوئی پریشان کن خبر سن لی

یا اور کوئی پریشانی سے واسطہ پڑا، تو چوں کہ پہلے ہی سے دعا مانگ لی ہے کہ بہترین داخل ہونا نصیب ہو، تو اللہ تعالیٰ خیر عطا فرمادیں گے۔ اس کے بعد جب گھر سے نکلنے کا وقت آئے تو اللہ تعالیٰ اچھے انداز سے نکلنا نصیب کرے۔ یہ نہیں کہ داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ بچہ بیمار ہے تو نکلنا بھی اچھا نہیں ہوا، اگر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ لی ہے تو دونوں چیزیں اچھے انداز میں مل جائیں گی، اور جیسا کہ پہلے بھی بتایا تھا کہ آپ ﷺ کی تعلیمات میں ان چیزوں کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

شیطانی اثرات کا توڑ

حضرات انبیاء ہدایت کے لیے دنیا میں آتے ہیں، اور اللہ کی مخلوق کا اللہ کی ذات سے تعلق قائم کرتے ہیں، ہر چیز میں اور ہر موقع پر ان کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ اپنے رب سے جڑے، اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق قائم ہو، اس کے لئے مختلف طریقے اور راستے بتلاتے ہیں۔ اور شیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے دور ہو، اس کا تعلق کم ہو، یا کٹ جائے۔ انسان کا بچہ جونہی دنیا میں قدم رکھتا ہے، اسی وقت سے یہ سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ روتا ہے، اس لیے کہ جب وہ دنیا میں قدم رکھتا ہے تو شیطان اس کے دل کو چھوتا ہے (بخاری شریف: باب وإني أعيذها بك وذريتها من الشيطان الرجيم) تو ایک نئی چیز جو آج تک اس کو پیش نہیں آئی تھی وہ اس کو پیش آتی ہے، جس کی وجہ سے وہ بچہ ایک طرح کا اجنبی پن محسوس کرتا ہے، اور روتا ہے۔

دراصل شیطان کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل پر وسوسہ اندازی کی قدرت دی ہے، اس سے زیادہ اور کچھ طاقت اس کے پاس نہیں، وہ ڈنڈا لے کر آپ سے گناہ نہیں

کروائے گا، اور نہ آپ کا ہاتھ پکڑ کر گناہ کروائے گا، اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف اتنی ہی طاقت دی گئی ہے کہ وہ انسان کے دل میں وسوسہ اندازی کرسکے، اور اسی کے ذریعہ وہ آدمی کو گناہوں پر آمادہ کرتا ہے۔ اب وہ ماں جس کے پیٹ میں بچہ ہے اس کے دل پر تو وسوسہ اندازی کرسکتا ہے، لیکن اس کو اتنی طاقت نہیں کہ جب تک وہ بچہ ماں کے پیٹ میں ہے اس کو ٹچ (Touch) بھی کرسکے، کیوں کہ وہ بچہ ابھی تک دنیا میں نہیں آیا ہے۔ جتنے انسان دنیا میں آچکے ہیں ان پر تو وہ اپنا تصرف کرسکتا ہے، لیکن اس بچہ پر نہیں، اس لیے کہ جب تک وہ ماں کے پیٹ میں ہے دوسرے عالم میں ہے، حالاں کہ وہ ماں کے پیٹ میں ہے، ماں کا دل بھی اندر ہے اور اس کا بھی دل اندر ہی ہے، لیکن ماں کے دل پر تصرف کرسکتا ہے، اس بچہ کے دل پر تصرف نہیں کرسکتا، کیوں کہ بچہ ابھی دنیا کی چیز نہیں بنا، لیکن اس کے پیدا ہوتے ہی شیطان پہنچ جاتا ہے اور اس کے دل کو ٹٹولنے لگتا ہے۔

شیطان اپنے کام میں بہت ہوشیار ہے، اس لیے کہ اس کی محنت کا میدان انسان کا دل ہے، اور نیا انسان دنیا میں آیا تو جہاں محنت کرنی ہے وہاں جائزہ لینے کے لئے پہنچ جاتا ہے۔ جیسے: چور جب کسی مکان میں چوری کرنے والا ہوتا ہے تو ایک دم سے وہاں نہیں پہنچ جاتا، بلکہ دو چار روز آگے پیچھے سے پلاننگ کرتا ہے، جائزہ لیتا ہے کہ وہ مکان کہاں ہے، اور کہاں سے داخل ہونا ہے، ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد وقت آنے پر وہ اپنا کام کرتا ہے۔ اسی طرح شیطان کا معاملہ بھی ہے کہ بچہ جب بڑا ہوگا اس وقت وہ مکلّف ہوگا، لیکن دنیا میں اس کے آتے ہی شیطان دیکھ لیتا ہے کہ میرا ایک نیا شکار دنیا میں آیا ہے، اس کا جائزہ لے لو۔ جیسے: دوا بنانے والی کمپنی اپنی دوا فروخت کرنے کے لیے سیلس مین رکھتی ہے، ان کو جیسے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی شہر میں کسی ڈاکٹر

نے نیا شفاء خانہ کھول دیا ہے، تو فوراً وہ پہنچ جاتے ہیں کہ ہماری محنت کا نیا میدان ہے، ان سے ملاقات کرتے ہیں۔ شیطان بھی جب دیکھتا ہے کہ کوئی نیا بچہ دنیا میں آیا ہے تو اس کے دل کو جا کر ٹٹولتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے اثرات کو دور کرنے کے لیے اس کا بدل رکھا ہے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ بچہ جب پیدا ہو تو جو آلائشیں ماں کے پیٹ سے لے کر نکلا ہے اس کو دھونے کے بعد غسل دے کر دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے۔ یہ اذان و اقامت کے جو کلمات کہلوائے جارہے ہیں وہ شیطان کے انہی اثرات کو دور کرنے کا کام کرتے ہیں جو اس بچہ کے دل کو چھونے کے نتیجہ میں آتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور اسلام کے بنیادی عقائد ہیں، ان کو گویا اس کے دل میں اتارنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بچہ اگرچہ ابھی کچھ جانتا نہیں ہے، لیکن اس کا دل ٹیپ ریکارڈر جیسا ہے، اس میں وہ چیز محفوظ ہوگی اور وقت آنے پر اپنا کام کرے گا۔

خود ہی موقع دیں؛ پھر پریشان ہوں!

اب شیطان اپنے اثرات ڈالنے، اپنی زمین ہموار کرنے اور وسوسہ اندازی کے واسطے ابھی سے محنت کر رہا ہے۔ جیسے کسی کے اوپر محنت کرنی ہوتی ہے، تو پہلے ماحول کو سازگار بنایا جاتا ہے، جب ماحول سازگار ہو جائے گا، اس کے بعد اس پر محنت کی جائے گی۔ اسی لئے اس حدیثِ پاک میں بتایا گیا کہ آدمی جب گھر میں داخل ہوتا ہے، تو شیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اللہ کا نام نہ لے، اس لیے کہ آدمی جب اللہ کا نام لئے بغیر گھر میں داخل ہوتا ہے تو شیطان کو بھی اندر آنے کا موقع مل جاتا ہے، وہ اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ آج رات تم کو یہاں ٹھہرنے کا موقع مل گیا، گویا قیام کی بکنگ

ہوگئی۔ پھر جب کھانے کے لیے بیٹھا اور بسم اللہ نہیں پڑھی تو کھانے کی بھی بکنگ ہوگئی۔ اب یہ ہوگا کہ جب شیطان پورے لشکر کے ساتھ گھر میں داخل ہو چکا، تو ویسے باہر رہ کر بھی وسوسہ اندازی کر سکتا تھا، لیکن اب وسوسہ سازی کے لیے جس قسم کا ماحول مطلوب ہے وہ اس کو حاصل ہو گیا، اب اور اچھے انداز میں وہ اپنی محنت کرے گا اور گمراہ کرے گا۔ پھر جب اس کو کھانا مل جائے گا تو اب کھانے میں شریک ہو جائے گا، اس لیے کھانے کی جو برکت اور نورانیت ہے وہ حاصل نہیں ہوگی، اس کے بعد شیطان کو مزید وسوسہ اندازی کا موقع مل جائے گا۔

اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: جب گھر میں داخل ہوؤ تو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر داخل ہونا اور جب کھانے کے لیے بیٹھو تو اللہ کا نام لینا، کیوں کہ شیطان کا کام ہے کہ وہ انسان کی ہر چیز میں اپنا حصہ لگانا چاہتا ہے، اس کے گھر میں، کھانے میں، رہائش گاہ میں؛ یہاں تک کہ مرد جب اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستری کرتا ہے، تو اس صحبت میں بھی شیطان شریک ہونا چاہتا ہے۔ اس لیے اس موقعہ پر بھی دعا سکھائی گئی ہے۔ وہ دعا یہ ہے: ''بِسْمِ اللہِ، اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطَان، وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مَارَزَقْتَنَا''

اسی طرح آدمی جب بیت الخلاء میں جاتا ہے تو وہاں بھی شیطان اس کی شرمگاہ سے کھیلنے کی کوشش کرتا ہے، اس وقت بھی تعلیم دی گئی کہ پہلے بسم اللہ کہو اور پھر یہ دعا پڑھو: ''اَللّٰھُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ'' یہ ساری دعائیں معمولی نہیں ہیں، بلکہ ان دعاؤں کے ذریعہ ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے قائم ہوتا ہے ،اور اسی کے ذریعہ شیطان کے حملوں سے حفاظت کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ ہم ان دعاؤں کا اہتمام نہیں کرتے، گویا کہ ہم نے خود شیطان اپنے اوپر حملہ کرنے کا موقع دیا، پھر جب شیطان کی وسوسہ اندازی ہوتی ہے تو پریشان ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم پہلے

سے شیطان کو ماحول سازگار بنانے اور اپنے اوپر حملہ کرنے کا موقعہ ہی کیوں دیں؟ اگر ان دعاؤں اور ان ساری تعلیمات کا اہتمام کریں گے تو اس کے حملوں سے محفوظ ہوجائیں گے، اور اگر تھوڑے بہت ہو بھی گئے تو جب اللہ تعالیٰ سے پناہ حاصل کریں گے تو شیطان کے شر سے جلدی اور آسانی سے بچ جائیں گے۔ اس لیے اس کا خاص اہتمام خود بھی کرنا چاہیے اور اپنے گھر والوں کے پاس بھی کرانا چاہیے۔

شیطان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں

۱۷۳۱:- وعن حُذَيْفَةَ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ كُنَّا إِذَا حَضَرْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طَعَاماً، لَمْ نَضَعْ أَيدِينَا حَتَّى يَبْدَأَ رَسُولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فَيَضَعَ يَدَهُ، وَإِنَّا حَضَرْنَا مَعَهُ مَرَّةً طَعَاماً، فَجَاءَتْ جَارِيَةٌ كَأَنَّهَا تُدْفَعُ، فَذَهَبَتْ لِتَضَعَ يَدَهَا فِى الطَّعَامِ، فَأَخَذَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِيَدِهَا، ثُمَّ جَاءَ أَعْرَابِيٌّ كَأَنَّمَا يُدْفَعُ، فَأَخَذَ بِيَدِهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: إِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْتَحِلُّ الطَّعَامَ أَنْ لا يُذْكَرَ اسْمُ اللهِ تَعَالَى عَلَيْهِ، وَإِنَّهُ جَاءَ بِهٰذِهِ الجاريةِ لِيَسْتَحِلَّ بِهَا، فَأَخَذْتُ بِيَدِهَا، فَجَاءَ بِهٰذَا الأَعْرَابِيِّ لِيَسْتَحِلَّ بِهِ، فَأَخَذْتُ بِيَدِهِ، وَالَّذِى نَفْسِى بِيَدِهِ، إِنَّ يَدَهُ فِى يَدِى مَعَ يَدَيْهِمَا.. ثُمَّ ذَكَرَ اسْمَ اللهِ تَعَالَى وَأَكَلَ.

ترجمہ:- حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جب کھانے کے لیے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کسی دعوت یا کھانے میں حاضر ہوتے تھے تو ہم کھانے کے لیے اپنے ہاتھ آگے نہیں بڑھاتے تھے یہاں تک کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھانا شروع فرمائیں۔ ایک مرتبہ ایک دعوت کے موقعہ پر ہم لوگ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ موجود تھے، کھانا دسترخوان پر چن دیا گیا، ابھی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھانا شروع نہیں فرمایا تھا، اپنا دستِ مبارک آگے نہیں بڑھایا تھا کہ ایک بچی

تیزی کے ساتھ آئی، ایسا معلوم ہورہا تھا کہ کوئی دھکے دے کر اس کو لا رہا ہے، اس نے کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا تو نبیٔ کریم ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا (یعنی اس کو کھانے نہیں دیا، اس لیے کہ اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی) اس کے بعد ایک دیہاتی تیزی سے آیا اور اس نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا تو حضورِ اکرم ﷺ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا (کھانے کے اندر ہاتھ ڈالنے نہیں دیا، اس لیے کہ اس نے بھی بسم اللہ نہیں پڑھی تھی) اس کے بعد حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کھانے پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، شیطان اس کھانے کو اپنے لیے حلال کر لیتا ہے۔ پھر حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے؛ شیطان کا ہاتھ ان دونوں کے ہاتھ کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع فرمایا۔

فوائدِ حدیث

افادات:- اس روایت سے مندرجۂ ذیل امور معلوم ہوئے:-

[۱]:- یہ بھی ادب میں سے ہے کہ بڑوں کے ساتھ جب کھانے کے لیے بیٹھے ہوں تو جب تک بڑے کھانا شروع نہ کریں، چھوٹوں کو کھانا شروع نہیں کرنا چاہیے، جب وہ شروع کریں تب دوسروں کو چاہیے کہ کھانا شروع کریں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضراتِ صحابہ کا یہی معمول تھا۔

[۲]:- یہ بھی معلوم ہوا کہ جو آدمی اپنے چھوٹوں کو اپنے ساتھ لے کر کھانے کے لیے بیٹھا ہو، اس کو چاہیے کہ ان کی نگرانی کرے کہ انہوں نے بسم اللہ پڑھی یا نہیں، اگر نہ پڑھی ہو تو ان کو کھانا کھانے نہ دے، ان کا ہاتھ پکڑ لے، اور کہے کہ پہلے بسم اللہ پڑھو، اس کے بعد کھانا شروع کرو۔ تربیت کا یہی تقاضہ ہے۔ دیکھیے! یہاں نبیٔ کریم ﷺ

نے اس بچی کا ہاتھ پکڑ لیا، اس لیے کہ اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بچوں کو ادب سکھانا چاہیے۔

آج کل تو ماں باپ اس کا اہتمام ہی نہیں کرتے، جب بچہ کی مرضی ہوگی تو کھائے گا، خادمہ اور نوکرانی اس کو کھلا دے گی، ماں باپ اپنی اپنی مرضی سے کھائیں گے۔ ماں باپ کو یہ پرواہ ہی نہیں کہ بچوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلائیں کہ ان کو کھانے کے آداب سے واقفیت ہو؛ حالاں کہ ماں باپ کے لیے ضروری ہے کہ باقاعدہ خود بیٹھ کر بچوں کو اپنے ساتھ بٹھائیں اور اس کا اہتمام کرائیں۔

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی کو چاہیے اپنے چھوٹوں اور ماتحتوں کی نگرانی کرے، ان کی طرف سے اگر ان آداب کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی ہو تو اس پر ٹوکے اور آئندہ آداب کے اہتمام کے ساتھ تمام کاموں کی ادائیگی کی تاکید کرے۔

۳:- دراصل شیطان اپنا ہاتھ ڈال کر اس کھانے کو اپنے لیے حلال کرنا چاہتا تھا، اس لیے وہ اس بچی کو دوڑاتا ہوا لایا، وہ چاہتا تھا کہ یہ بچی بغیر بسم اللہ پڑھے جلدی سے اس کھانے میں ہاتھ ڈال دے، تاکہ اس کو واسطہ بنا کر اس کھانے میں شریک ہو جائے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس تدبیر میں کامیاب نہیں ہوا تو دیہاتی کو لے آیا، وہ دوڑا ہوا آیا اور اس نے بھی بغیر بسم اللہ کہے ہاتھ آگے بڑھا کر کھانا چاہا، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا بھی ہاتھ پکڑ لیا، اس لیے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو کھانے دیتے تو شیطان اس کے ساتھ شریک ہو جاتا۔

شروع میں نہیں؛ تو اخیر میں سہی

۷۳۲:- وعن أُمَيَّةَ بن مَخْشِيٍّ الصحابيِّ رضی اللہ تعالٰی عنہ قَالَ: كَانَ رسولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جَالِسًا، وَرَجُلٌ يَأْكُلُ، فَلَمْ يُسَمِّ اللّٰهَ حَتّٰى لَمْ يَبْقَ مِنْ طَعَامِهٖ إِلَّا لُقْمَةٌ، فَلَمَّا رَفَعَهَا إِلٰى فِيهِ، قَالَ: بِسْمِ اللّٰهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ، فَضَحِكَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثُمَّ قَالَ: مَا زَالَ الشَّيْطَانُ يَأْكُلُ مَعَهُ، فَلَمَّا ذَكَرَ اسْمَ اللّٰهِ اسْتَقَاءَ مَا فِي بَطْنِهٖ. (رواہ أبوداود والنسائی)

ترجمہ:- حضرت اُمیّہ بن مخشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما تھے، ایک آدمی کھانا کھا رہا تھا، کھانے کے شروع میں اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی (اس لیے شیطان بھی کھانے میں اس کے ساتھ شریک تھا۔ اس آدمی کو تو نظر نہیں آرہا تھا لیکن نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیکھ رہے تھے) یہاں تک کہ اس کے کھانے میں سے ایک ہی لقمہ باقی بچا تھا کہ اس کو یاد آ گیا کہ میں نے شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھی ہے، لہٰذا اس نے فوراً کہا: "بِسْمِ اللّٰهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ"، یہ منظر دیکھ کر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہنس پڑے، پھر ارشاد فرمایا: شیطان برابر اس آدمی کے ساتھ شریک رہا، آخر میں جب اس نے یہ دعا پڑھی تو شیطان نے کھایا ہوا قے کر دیا (یعنی شیطان اس کھانے کو ہضم نہیں کر سکا۔)

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ اخیر میں بھی یاد آ جائے تو پڑھ لے۔ بعض لوگ سوچتے ہیں کہ شروع میں نہیں پڑھی تو اب اخیر میں کیا پڑھنی؟ یہ بھی شیطانی دھوکہ ہے۔ جو طریقہ ہمیں بتایا گیا ہے ہمیں تو اس پر عمل کرنا ہے۔ اس طرح کی سوچ اور خیال بھی شیطانی وسوسہ ہے، شیطان اپنے کھانے کو محفوظ کرنا چاہتا ہے۔

بعض لوگوں کا مزاج اعتراض والا ہوتا ہے اور آج کل عموماً ایسا مزاج بن گیا ہے کہتے ہیں کہ جب شیطان نے قے کر دی تو اس سے ہمیں کیا فائدہ ملا؟ ایک صاحب نے ایک مرتبہ یہی سوال کیا تھا۔ اس کا جواب ظاہر ہے کہ شیطان کو اس کھانے میں شریک ہونے کی وجہ سے وسوسہ اندازی کا اچھا موقع فراہم ہو جاتا ہے، اور شیطان کے اثرات کھانے میں آ جاتے ہیں، لیکن جب بسم اللہ پڑھ لی گئی، چاہے آخری لقمہ سے پہلے ہی

کیوں نہ ہو، اور شیطان نے قے کردی، تو اب شیطان کو اس راہ سے اس پر قابو پانے کا موقع نہیں ملے گا۔ معلوم ہوا کہ آخری لقمہ پر بھی یاد آجائے تو بسم اللہ پڑھ لی جائے۔

بسم اللہ کی برکت

۷۳۳:- وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: كَانَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَأكُلُ طَعَاماً فى سِتَّةٍ مِنْ أصْحَابِهِ، فَجَاءَ أعْرَابِيٌّ، فَأكَلَهُ بلُقْمَتَيْنِ. فَقَالَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: أما إنَّهُ لَوْ سَمَّى لَكَفَاكُمْ. (رواه الترمذی.)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھ رفقاء کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ ایک دیہاتی آیا اس نے دو لقموں میں کھانا ختم کر دیا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ آدمی اگر بسم اللہ پڑھتا تو یہ کھانا تم سب کو کافی ہو جاتا۔

افادات:- شیطان کے شریک ہونے سے کھانے کی برکت ختم ہو گئی۔ کھانے کی برکت یہی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کا نام لے، اور سب شریک ہونے والے بھی اللہ کا نام لیں؛ تاکہ شیطان کو کسی ایک کے واسطہ سے بھی کھانے میں شریک ہونے کا موقع نہ ملے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ مؤمن ایک آنت سے کھاتا ہے (یعنی کم غذا سے اس کا پیٹ بھر جاتا ہے) اور غیر مسلم سات آنت سے کھاتا ہے (خوب ڈٹ کر کھاتا ہے) (باب المؤمن یأکل فی معی واحد) آپ غور کرنا کہ ان کے کھانے کی مقدار مسلمانوں کے کھانے کی مقدار سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ آپ اگر چاہیں تو عملی طور پر تجربہ کر کے دیکھ لیں، وہ زیادہ ہی کھائیں گے۔ اور جو مسلمان بسم اللہ نہیں پڑھتے وہ بھی زیادہ ہی کھائیں گے۔ بسم اللہ پڑھ کر جو لوگ کھانے کا اہتمام کرتے ہیں تو کم غذا میں اللہ تعالیٰ ان کو سکون عطا فرما دیتے ہیں۔

اور بسم اللہ کو جتنے یقین کے ساتھ پڑھنے والا ہوگا اتنی ہی اس کے کھانے کی مقدار گھٹتی جائے گی۔اس لیے ہم اہل اللہ کو دیکھیں گے کہ کم غذا میں بھی ان کا کام چل جاتا ہے۔

دسترخوان اُٹھانے کی دعا

۷۳۴:-وعن أَبِي أُمَامَةَ رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم كَانَ إِذَا رَفَعَ مَائِدَتَهُ، قَالَ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ، غَيْرَ مَكْفِيٍّ، وَلَا مُوَدَّعٍ، وَلَا مُسْتَغْنًى عَنْهُ رَبَّنَا۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب دسترخوان اٹھاتے تو یہ دعا پڑھتے تھے: **”تمام تعریف اللہ کے واسطے ہے، بہت زیادہ پاکیزہ اور برکت والی تعریف۔اس کھانے کی شکرانہ کے ذریعہ سے کفایت نہیں کی گئی** (یعنی جیسا شکر کا حق ہے ویسا شکر ہم نے ادا نہیں کیا) **اور نہ اس کو چھوڑا جا رہا ہے۔اور اے ہمارے رب! نہ ہم اس سے بے پرواہی اختیار کر رہے ہیں۔“**

افادات:- انسان کی عادت ہے کہ اس کو جس چیز کی حاجت ہوتی ہے اور جس چیز کا وہ محتاج ہوتا ہے، اس کو حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوتا ہے، اور جب وہ چیز نظر آتی ہے تو لپک کر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس پر حملہ کر دے گا، لیکن جہاں اس کی اس سے ضرورت پوری ہوگئی کہ بس! اس چیز کی طرف سے بے پرواہی اختیار کر لیتا ہے۔کھانا؛ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، جب بھوک کی وجہ سے ہم کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں، اس وقت کھانے کی طرف ہماری طبیعت کی جو رغبت، میلان وکشش ہوتی ہے، وہ ظاہر ہے۔لیکن جب پیٹ بھر جاتا

ہے اور کھانے سے ہم اپنے ہاتھ کھینچتے ہیں، تو وہ کشش اور میلان جو شروع میں تھا اب باقی نہیں رہتا، اس کی وجہ سے کسی کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ کیا یہ کھانے کی طرف سے ایک طرح کا استغناء اور بے پرواہی ہے؟ اس دعا کے ذریعہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ عرض کررہا ہے کہ: اے اللہ! میں جو ہاتھ کھینچ رہا ہوں وہ اس لیے نہیں کہ مجھے ضرورت نہیں ہے، بلکہ مجھے تو اس کی ضرورت ہے، مَیں تو ابھی تھوڑی دیر (چار پانچ گھنٹے) کے بعد دوبارہ اسی احتیاج و بے چینی اور رغبت و میلان کے ساتھ کھانے کی طرف دوبارہ ہاتھ بڑھانے والا ہوں، اس وقت بے پرواہی کی وجہ سے ہاتھ نہیں ہٹایا جارہا ہے، اور اس کھانے کے شکرانہ کا جو حق تھا، وہ بھی ہم پوری طرح ادا نہیں کرسکے۔

گناہوں کی معافی کی بشارت

۷۳۵:- وعن معاذ بن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَنْ أَكَلَ طَعَاماً، فقال: **أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَطْعَمَنِي هٰذَا، وَرَزَقَنِيهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِنِّي وَلَا قُوَّةٍ**، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ. (رواہ أبو داود والترمذی)

ترجمہ:- حضرت معاذ بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کھانا کھائے پھر یہ دعا پڑھے: **تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا اور یہ کھانا مجھے میری کسی تدبیر اور طاقت کے بغیر روزی کے طور پر عطا فرمایا** (یعنی مجھ میں یہ طاقت نہیں تھی کہ میں یہ کھانا حاصل کرتا) تو اس کے پچھلے سارے گناہ معاف ہوجائیں گے۔

افادات:- کھانے کے دو ادب بتانے کے لیے یہ باب قائم کیا تھا، ایک تو شروع میں بسم اللہ پڑھنا یعنی اللہ کا نام لینا، اور آخر الحمد للہ یعنی اللہ کی تعریف وشکر ادا کرنا۔ پہلی مجلس میں بتاچکا ہوں کہ کھانے کی جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ کتنی

محنتوں کے بعد تیار ہوتی ہے، اگر ہم خود ان ساری محنتوں کو استعمال کر کے کھانا تیار کرنا چاہتے تو نہیں کر سکتے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا نظام ہے جس کے نتیجہ میں یہ ساری چیزیں ہم تک پہنچتی ہیں۔ اور ہم نے جو کھانا کھایا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہے، اس پر شکر تو ویسے بھی ادا کرنا چاہیے تھا، اس کی حمد وثناء ہمارے لیے ضروری ہے ہی، لیکن یہاں شکر ادا کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انعام دیا جاتا ہے کہ پچھلے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور گناہوں سے مراد صغیرہ گناہ ہیں، اس لیے کہ کبیرہ توبغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔ بہر حال! اس عمل پر گناہوں کی معافی کی بشارت بھی ہمیں سنائی جارہی ہے۔ غور کیجیے کہ کتنا آسان نسخہ ہے!

اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

باب لا یعیب الطعام واستحباب مدحه

کھانے میں عیب نہ نکالے اوراس کی خوبی بیان کرنے کا پسندیدہ ہونا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ کھانے کے آداب کا بیان چل رہا ہے، اسی سلسلہ میں آج ایک باب قائم کرتے ہیں: کھانے میں نہ کوئی عیب نکالے اور نہ کھانے کی برائی کرے۔ اور دوسری بات یہ کہ اس کی تعریف کرنے کا پسندیدہ ہونا۔

کچھ بھی بے کار نہیں قدرت کے کارخانہ میں

۷۳۶:- وعن أَبي هُريرة رضی اللہ تعالٰی عنہ قَالَ: مَا عَابَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طَعَامَاً قَطُّ، إن اشْتَهَاهُ أَكَلَهُ، وَإنْ كَرِهَهُ تَرَكَهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالٰی عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا، نہ کبھی اس کی برائی کی۔ اگر پسند ہوتا تو آپ اس کو تناول فرما لیتے اور کھا لیتے، اور اگر پسند نہ ہوتا تو اس کو چھوڑ دیتے۔

افادات:- کھانا؛ یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق ہے، اس کی نعمت ہے، اس کا ایک عطیہ ہے، تو حق یہ ہے کہ آدمی اس نعمت اور عطیے کے اوپر کوئی عیب نہ لگائے، اگر طبیعت کی رغبت ہے اور وہ چیز پسند ہے تو شوق سے کھائے، اور اگر پسند نہیں ہے تو اس کی برائی نہ بیان کرے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ اگر کھانا پسند نہیں ہے تو بس اس کی برائی کا دفتر کھول دیتے ہیں، ایسا کرنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق، اس کی نعمت اور عطیہ کی ناقدری کرتا ہے، آپ کو اگر پسند نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ چیز بے کار ہے:-

کچھ بھی بے کار نہیں قدرت کے کارخانہ میں ❁ نہیں ہے کوئی چیز نکمی زمانہ میں

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنی بھی چیزیں پیدا کی ہیں ان کی پیدائش میں کوئی نہ کوئی حکمت اور

مصلحت ضرور موجود ہے۔ ظاہری اعتبار سے وہ چیز چاہے کتنی ہی بری معلوم ہو، لیکن تکوینی اعتبار سے اس کا وجود اپنے اندر کسی نہ کسی فائدہ، حکمت اور مصلحت کو لیے ہوئے ہوتا ہے، سانپ اور بچھو جیسے موذی اور تکلیف دینے والے جانوروں کا وجود بھی مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کائنات میں جو پیدا کیا ہے، اس کا بھی کوئی مقصد اور مصلحت ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہی بخوبی جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کی مصلحتوں کا انسان کہاں احصاء کرسکتا ہے اور تمام مصلحتوں کو کہاں جان سکتا ہے؟ کوئی چیز اگر آپ کے اور ہمارے علم میں نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں

مکھی کی پیدائش کا ایک فائدہ

ایک متکبر بادشاہ ایک مرتبہ اپنے محل میں تکبر کے ساتھ تخت پر بیٹھا ہوا تھا، ایک مکھی آکر اس کی ناک پر بیٹھ گئی، اس نے اڑایا، پھر آکر بیٹھ گئی، پھر اڑایا، پھر آگئی۔ بعض مکھیاں ضدی ہوتی ہے کہ جتنا بھی اڑاؤ، واپس آکر بیٹھ جاتی ہے (ویسے مکھی کو عربی زبان میں ''ذُبَابٌ'' کہتے ہیں۔ ذَبَّ، یَذُبُّ کا معنیٰ کسی چیز کو بھگانا اور دور کرنا، اور ''آبَ، یَؤُبُ'' کا معنیٰ لوٹنا؛ تو ''ذُبَّ'' اور ''آبَ'' مل کر ''ذُبَابٌ'' بنا ہے، کُلَّمَا ذُبَّ آبَ یعنی اس کو بھگایا گیا تو وہ پھر لوٹ کر آئی، اسی سے عربی زبان میں اس کا نام ''ذُبَابٌ'' بنا ہے، اس کی خاصیت ہی یہ ہے کہ اس کو بھگاؤ تو وہ پھر آئے گی۔) تو اس بادشاہ نے اس کو دو تین مرتبہ بھگایا لیکن وہ پھر آکر بیٹھی تو وہ بادشاہ کہنے لگا: معلوم نہیں کہ اللہ میاں نے یہ مکھیاں کیوں پیدا کی ہیں؟ اس کے اندر کوئی منفعت تو ہے نہیں، صرف نقصان ہی نقصان نظر آتا ہے۔ ایک اللہ والے وہاں بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے کہا: اس کا ایک فائدہ اس سے بڑا اور کیا ہوسکتا ہے کہ تیرے جیسے مغرور اور متکبر انسان کے غرور کو توڑ رہی ہے،

اللہ تعالیٰ نے اس مکھی کے ذریعہ تجھے بتادیا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ چھوٹی سی معمولی مخلوق اگر تجھے ستانا چاہے اور تو اپنے آپ کو اس سے بچانا چاہے تب بھی اس کو روک نہیں سکتا۔ بار بار تو اسے بھگا رہا ہے اور وہ واپس آ کر بیٹھ رہی ہے، تجھ میں تو اتنی بھی طاقت نہیں کہ اسے اپنے پاس سے ہٹا سکے اور دربار سے نکال سکے، تو اس نے تیرے غرور اور تکبر کو خاک میں ملادیا، اس سے بڑا فائدہ اور کیا ہو سکتا ہے!

بچھو کے ذریعہ جان بچائی

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیرِ کبیر میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر بہت تفصیل سے کئی صفحات کے اندر لکھی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کو بیان کرتے ہوئے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بزرگ دریائے دجلہ کے کنارہ جا رہے تھے، انہوں نے ایک بڑا سا بچھو دیکھا جو تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اتنا بڑا بچھو یہاں کیسے آ گیا، تو یہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ کچھ دور کنارے کنارے چل کر جب آگے پہنچے تو دیکھا کہ دریا میں سے ایک کچھوا باہر آیا، یہ بچھو اس کے اوپر سوار ہو گیا اور وہ کچھوا دریا پار کرنے لگا۔ ان بزرگ نے دیکھا تو انہوں نے بھی سامنے والے کنارے پر جانے کے لیے ایک کشتی کرایہ پر لی، اس میں بیٹھے اور سامنے والے کنارہ پر پہنچے، تو وہ کچھوا بھی اس بچھو کو لے کر سامنے والے کنارہ پر پہنچ چکا تھا، وہاں وہ بچھو اُترا اور آگے بڑھنے لگا۔ یہ بزرگ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے، ایک جگہ جا کر دیکھا کہ ایک نوجوان شراب پی کر بے ہوش پڑا ہے اور اس کے پاس شراب کا گلاس پڑا ہوا ہے، اور ایک بڑا اژدہا اپنا پھن پھیلائے ہوئے اس کو کاٹنے کے لیے تیار ہے۔ اتنے میں یہ بچھو وہاں پہنچا اور ایک دم کود کر اس اژدہے کے پھن میں ایک ڈنک مارا جس کی وجہ سے وہ

اژدہا گرا اور مر گیا۔ پھر وہ بچھو وہاں سے واپس روانہ ہو گیا، دریا کے کنارے پر پہنچا، اسی کچھوے پر سوار ہوا اور وہ اس کو لے کر روانہ ہوا۔ یہ سارا قصہ ان بزرگ نے دیکھا تو سوچنے لگے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان دیکھو کہ بظاہر تو یہ جانور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی جان لیتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اسی کے ذریعہ انسانوں کی جان کی حفاظت کا بھی کام لیتے ہیں۔ جب وہ نوجوان ہوش میں آیا تو ان بزرگ نے اس کو بتایا کہ تو تو شراب کے نشے میں مدہوش تھا، اور تیری حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا ایسا انتظام کیا۔ یہ سن کر اس کو احساس ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے اسے توبہ کی توفیق دی۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کوئی بھی چیز دنیا میں بے کار نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی چیزیں دنیا میں بنائی ہیں وہ کسی نہ کسی مقصد اور منفعت کے لیے ہیں، اس میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور پوشیدہ ہے۔

پاخانہ کے کیڑے سے علاج!

ایک کتاب ''قلیوبی'' نامی ہمارے بچپن میں پڑھی تھی جس میں عجیب وغریب قصے لکھے ہوئے ہیں، ایک قصہ یاد آتا ہے۔ پاخانہ کا ایک کیڑا ہوتا ہے جو پیٹ کے اندر پیدا ہوتا ہے، جسے ہم لوگ کِرَم کہتے ہیں، پاخانہ کے ساتھ نکلتا ہے اور اسی میں چلا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ اس کو دیکھ کر ایک صاحب سوچنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کیوں پیدا کیا ہے، بے کار معلوم ہوتا ہے، اس کا کوئی مقصد تو سمجھ میں نہیں آتا، ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا۔ ایک مدت کے بعد اس کی آنکھ میں ایک بیماری ہو گئی، مختلف ڈاکٹروں اور حکیموں سے بہت علاج کرایا، بڑی رقمیں خرچ کیں، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ایک بہت پرانہ تجربہ کار طبیب تھا، کسی نے کہا کہ اس کا تجربہ بہت زیادہ ہے اس کے پاس جاؤ، وہ صاحب

اس کے پاس گئے، اس نے سارے حالات پوچھے، پھر کہا: پاخانہ کا جو کیڑا ہوتا ہے اس کو پیس کر آنکھ میں لگاؤ، کبھی کبھی یہ بیماری اس سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ وہ آدمی سمجھ گیا کہ میری زبان سے جو جملہ نکلا تھا تو اللہ تعالیٰ نے میری عبرت اور سزا کے لیے مجھے اس بیماری میں مبتلا کیا ہے۔ اس لیے ہمیشہ کچھ بھی بولنے میں آدمی کو بہت ہی احتیاط کرنی چاہیے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ''اَلْبَلَآءُ مُوَکَّلٌ بِالْمَنْطِقِ'' مصیبت بولنے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ بہت سی مصیبتوں کو ہم بول کر دعوت دیتے ہیں، کوئی بڑا بول آدمی بول دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو وہ پسند نہیں آتا، پھر اللہ تعالیٰ اس کے اسی بول پر اس کو آزمائش میں ڈال دیتے ہیں۔

یہ کس مرض کی دوا ہے؟

سید غوث علی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ تھے ان کے حالات میں ''تذکرۂ غوثیہ'' نامی ایک کتاب ہے، اس میں ان کے ملفوظات کے اندر ایک لطیفہ لکھا ہے کہ: ایک چھپکلی ایک دیوار پر لٹکی ہوئی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا تو باری تعالیٰ سے عرض کیا: یا اللہ! اس کو کیوں پیدا کیا؟ یہ کس مرض کی دوا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! یہ چھپکلی بھی کب سے مجھ سے یہی پوچھ رہی ہے کہ: اے اللہ! موسیٰ کو آپ نے کیوں پیدا کیا؟ یہ کس مرض کی دوا ہے؟ اگرچہ یہ تو ایک لطیفہ ہے، لیکن سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ جیسے: ہم بچوں کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں، تو وہ بچے بھی ہمارے متعلق بہت کچھ تبصرے کرتے ہیں جن کو کبھی کبھی سننے کی ضرورت ہے، اس سے آدمی کو پتہ چل جاتا ہے۔

کھانے کی نعمت، اور ہمارا طرزِ عمل

خیر! مَیں نے عرض کیا تھا کہ کھانا اللہ تعالیٰ کی نعمت اور عطیہ ہے، اس کا دیا ہوا

رزق ہے، اور اس میں بڑی مصلحتیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے جب اس کو پیدا کیا اس وقت اپنی توجہ اس کی طرف منعطف فرمائی، اس سے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ہمیں اگر وہ چیز پسند نہیں ہے اور اچھی نہیں لگتی ہے، تو نہ کھائیں، کوئی زبردستی تو نہیں ہے، لیکن اس کی برائی بیان کرنے میں اپنی زبان کو اور وقت کو لگانے کی آپ کو کس نے اجازت دی؟ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ کا معمول بتایا کہ آپ کو اگر وہ چیز پسند آتی تو کھا لیتے اور اگر پسند نہ آتی تو چھوڑ دیتے۔ اسلام نے یہی تعلیم دی ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں اللہ تعالیٰ کا رزق ہیں، اس کی قدر اور تعظیم کرنی چاہیے، ادب کرنا چاہیے۔

آج کل تو کھانے کی ایسی بے عزتی ہوتی ہے کہ اللہ کی پناہ! جو کھانا بچتا ہے اس کو لوگ کوڑے دان میں ڈال دیتے ہیں، خاص کر ہوٹلوں میں اور دعوتوں میں تو بڑی بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ کھانے کو ضائع و برباد کیا جاتا ہے، حالاں کہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ایک ایک دانہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور بہت ہی قیمتی ہے۔

نعمت کی قدر دانی کا عجیب واقعہ

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک واقعہ بیان کرتے تھے۔ ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں جو میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے، راندیر ہی میں ان کا مزار ہے۔ ہمارے مدارس میں سنن ابوداؤد پڑھائی جاتی ہے، عام طور پر اس کی سند میں میاں صاحب آتے ہیں۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: میں ایک مرتبہ ان کے یہاں گیا، کھانے کا وقت ہوا تو انہوں کہا کہ آپ بھی کھانے میں شریک ہو جایئے، ہم کھانے کے لیے بیٹھے، جب ہم کھانے سے فارغ

ہو چکے تو مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ مَیں دسترخوان لپیٹنے لگا تا کہ اندر جو کچھ ہے اس کو باہر پھینک آؤں۔ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کیا کر رہے ہو؟ میں نے کہا: حضرت! دسترخوان صاف کرنے کے لیے لپیٹ رہا ہوں۔ تو میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: دسترخوان صاف کرنا آتا ہے؟ مَیں نے کہا: حضرت! یہ بھی کوئی علم اور فن ہے جو سیکھنے کی ضرورت ہو؟ فرمایا: ہاں! اسے بھی سیکھنے کی ضرورت ہے۔ پھر کہا: لاؤ! مجھے دو۔ انہوں نے میرے پاس سے لے لیا، اس کو پھر سے کھولا، اور ہم لوگ کھاتے وقت ہڈیاں چوس کر اس پر ڈالتے ہیں، اسی طرح کچا گوشت نکال کر ڈال دیتے ہیں، تو میاں صاحبؒ نے اس طرح کا گوشت الگ کیا، ہڈیاں الگ کیں، روٹی کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو الگ کیا، چھوٹے چھوٹے ذرّات کو الگ کیا۔ اس طرح کل چار حصے بنائے، پھر فرمانے لگے: دیکھو! یہ جو کچا گوشت ہے اس کو مَیں فلاں جگہ پر رکھوں گا، وہاں بلی آتی ہے اور اس کو معلوم ہے کہ میری غذا وہاں رکھی ہوئی ہوتی ہے، وہ آکر اس کو کھا لے گی۔ اور یہ جو ہڈیاں ہیں، اس کو فلاں جگہ رکھوں گا، وہاں کتے آتے ہیں اور ان کو معلوم ہے کہ یہاں ہماری غذا رکھی جاتی ہے، وہ آکر کھالیں گے۔ اور روٹی کے یہ بڑے ٹکڑوں کو اوپر کی دیوار پر رکھ دوں گا، کوے اور چیلیں آکر لے لیں گے۔ اور یہ چھوٹے چھوٹے ذرات کو گھر میں جہاں چونٹیوں کے بِل ہیں ان کے پاس رکھ دوں گا تو وہ کھالیں گی؛ اس لیے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا رزق ہے، اس کی نعمت ہے، ہم اس کو نہیں کھاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی دوسری مخلوق کے لیے رزق بنایا ہے، تو ہم اس کو کیوں ضائع کریں!

جنوں کی خوراک کا نظام

اسی لیے آپ کو معلوم ہوگا کہ استنجاء کے آداب جہاں بیان کیے جاتے ہیں

وہاں حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ہڈی سے استنجاء کرنے سے منع کیا۔ کیوں؟ حدیث میں اس کی وجہ بھی بتلائی ہے کہ ذبح کیے ہوئے جانوروں کی ہڈیاں جو ہم کھانے کے بعد چوس کر صاف کر کے ڈال دیتے ہیں وہ جنوں کی خوراک ہے۔ اگر کوئی جن اللہ کا نام لے کر اس کو اُٹھاتا ہے تو اس پر ایسا ہی گوشت چڑھا دیا جاتا ہے جیسے اس پر اصل میں تھا۔ جنوں کی خوراک کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ ایک نظام ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے ہڈیوں سے استنجاء کرنے سے منع فرمایا کہ جو آدمی اس سے استنجاء کرے گا تو گویا کہ اس کو بے کار اور ضائع کر رہا ہے، جو چیز جنوں کی خوراک کے کام آسکتی تھی، اب ان کے کام میں نہیں آئے گی۔ اسی طرح کوئلے سے استنجاء کرنے سے بھی منع کیا ہے، کیوں کہ کوئلہ جنوں کے جانوروں کی خوارک ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے بڑی تاکید فرمائی ہے کہ کوئی نعمت ضائع نہ ہونے پائے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بڑی قدر ہونی چاہیے۔

ایک گھونٹ پانی کی قدر

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا کہ کوئی آدمی پانی پیتا اور بچا ہوا پھینک دیتا تو حضرت بہت سخت ناراض ہوتے کہ بھائی! پانی کیوں پھینک دیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ پانی ہمیں اتنی آسانی سے وافر مقدار میں بغیر زحمت کے مل جاتا ہے اس لیے ہمیں اس کی قدر نہیں ہے۔ میں نے پہلے بتایا تھا کہ چند سال پہلے جب کنڈلا(۱) میں سمندری طوفان آیا تھا تو وہاں رفاہی کام کے لیے ہمارے یہاں سے یوسف علی بھائی گئے تھے، انہوں نے بتلایا کہ جب ہم پہلی مرتبہ وہاں پہنچے تو ہمارے پاس پینے کے پانی کی بوتلیں تھیں

(۱) گجرات کے ساحل سمندر پر ایک جگہ کا نام ہے۔

جسے دیکھ کر بیسیوں آدمی جمع ہو گئے اور کہنے لگے کہ: اس میں سے ایک ایک گھونٹ ہمیں دو۔ جن کو پانی میسر نہیں ہوتا ان سے پوچھو کہ اس ایک گھونٹ کی کتنی قدر ہے!

عبرت انگیز واقعہ

اور اس ایک گھونٹ پر بلکہ ایک قطرہ پر اللہ تعالیٰ کے یہاں کیسا کیسا معاملہ کیا جاتا ہے! ایک عجیب وغریب قصہ یاد آ گیا تو سنا دیتا ہوں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں یہ قصہ لکھا ہوا ہے کہ ایک آدمی کا انتقال ہو گیا، کسی نے اس کو خواب میں دیکھا کہ عذاب میں مبتلا ہے، اس نے پوچھا: تیرے ساتھ یہ معاملہ کیوں؟ اس نے کہا: میرے گناہوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوں۔ اس نے پوچھا: تیرے پیچھے کوئی دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کرنے والا نہیں؟ اس نے کہا: میری ایک لڑکی ہے، تم اس کو جا کر کہو کہ وہ میرے لیے کچھ ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام کرے اور یہاں بھیجے۔ وہ صبح اُٹھا اور معلوم کیا کہ فلاں کا مکان کہاں ہے، وہاں پہنچا تو دیکھا کہ مکان پر تالا پڑا ہوا ہے۔ لوگوں سے پوچھا: اس کی ایک لڑکی تھی وہ کہاں ہے؟ لوگوں نے بتلایا: وہ تو بڑی بد اخلاق نکلی، کوٹھے پر بیٹھ گئی اور بدکاری میں مبتلا ہو گئی، اس وقت کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ پوچھا: مجھے اس سے ایک کام ہے، کہاں ملے گی؟ کسی نے بتلایا کہ: وہ اپنے کسی آشنا اور دوست کے ساتھ دریائے جمنا پر نہانے کے واسطے گئی ہے۔ یہ آدمی وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ پانی سے کھیل رہی ہے۔ اب یہ سوچنے لگا کہ میں اس کو بتلاؤں بھی یا نہیں، لیکن پھر سوچا کہ ایک مرے ہوئے آدمی نے اپنی بیٹی کے نام ایک پیغام دیا ہے؛ تو مَیں پہنچا ہی دوں۔ چناں چہ اس نے وہیں کنارے پر کھڑے اس کو مخاطب کر کے کہا کہ: مَیں نے خواب میں

تیرے باپ کو دیکھا کہ وہ عذاب میں مبتلا ہے اور اس نے میرے ذریعہ تجھ تک یہ پیغام کہلوایا ہے کہ تو اس کے لیے کچھ ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام کر۔ اب وہ تو اپنی مستی میں تھی، اور چلّو میں پانی لے کر اپنے آشنا کے اوپر ڈال رہی تھی، اس میں سے ایک چلّو اس کے اوپر ڈال کر کہنے لگی: لو! یہ میرے ابّا کے ایصالِ ثواب کے لیے ہے۔ یہ بیچارہ تو بہت شرمندہ ہوا اور واپس چلا آیا کہ اب اس کو کیا کہا جائے۔ دوسری رات کو خواب میں دیکھا تو اس کا باپ اچھی حالت میں تھا۔ اس نے کہا: مَیں تو تیرے پیغام کو پہنچانے کے لیے تیری بیٹی کے پاس گیا تھا، لیکن اس کا ایسا ایسا معاملہ ہے اور اس نے تو مجھے اس طرح سے جواب دیا اور میرے ساتھ بھی ایسا سلوک کیا۔ اس پر اس نے کہا: اس کا عمل اس کے ساتھ؛ لیکن وہ چلّو بھر کر اس نے جو پانی تیرے اوپر یہ کہہ کر ڈالا تھا کہ یہ ابّا کے ایصالِ ثواب کے لیے ہے، اس پانی کا ایک قطرہ ایک جانور کے منھ میں گرا جو ندی کے کنارہ پر دو روز سے پیاسا پڑا ہوا تھا، اور اندر جا کر پانی پی سکنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا، اُس ایک قطرے سے اس جانور کی پیاس بجھ گئی، اس کا ثواب مجھے ملا اور اسی پر اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت کر دی۔

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ پانی کا ایک قطرہ کتنا قیمتی ہے کہ ایک آدمی کو عذاب سے بچا سکتا ہے؛ تو پھر ایک گھونٹ کتنا قیمتی ہوگا! لیکن ہم اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو یونہی ضائع کر دیتے ہیں۔ پرانے زمانہ میں ہمارے دیہاتوں میں دیکھا کہ کھانا اگر بچتا تھا تو وہ لوگ اس کو پھینکنے کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ مختلف قسم کے غریب غرباء، بھنگی چمار، مزدور قسم کے لوگ ہر آبادی کے اندر رہتے ہی ہیں؛ ان کو دے دیا جائے۔ آج کل اس کی بالکل پرواہ نہیں کی جاتی، اور بچا ہوا کھانا ایسے ہی پھینک دیتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کا ضرور اہتمام ہو کہ کھانا اللہ تعالیٰ کی قیمتی نعمت ہے جو ضائع نہیں ہونی چاہیے۔

اکابر کی کڑھن

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیماری کے زمانہ میں ایک آدمی دودھ لایا، حضرت نے نوش فرما کر ایک دو گھونٹ بچ گئے تھے اس کو وہیں رکھ دیا اور حضرت کی آنکھ لگ گئی، جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ دودھ وہاں نہیں ہے۔ ایک صاحب کھڑے تھے ان سے پوچھا کہ یہاں دودھ رکھا تھا؛ کہاں گیا؟ انہوں نے کہا: میں نے پھینک دیا۔ اس پر حضرت بہت ناراض ہوئے کہ اللہ کے بندے! وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت تھی، تو نے اس کو پھینک کیوں دیا؟ تو ہی پی جاتا، ورنہ کسی جانور کو پلا دیتا تب بھی کارآمد تو ہوتا۔ ایسے ہی پھینکنا کیا معنیٰ رکھتا ہے!

ہمارے بزرگوں کے یہاں اس بات کا بڑا اہتمام رہتا تھا کہ کوئی چیز بھی ضائع ہونے نہ پائے، اگر ایک ذرّہ بھی ضائع ہو جاتا تو اس پر بہت کڑھتے۔ کبھی کسی پھل کا مزہ تھوڑا سا بدل جاتا ہے، یا ایک طرف سے تھوڑا سا زیادہ پک جانے کی وجہ سے بہت سی طبیعتیں اس کو کھانا پسند نہیں کرتیں، تو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا کہ اگر کوئی پھل اس طرح کا ہو جاتا تھا تو حضرت ایک مخصوص انداز سے فرماتے تھے کہ: کون اس کو وصول کرے گا؟ یہ سن کر جن کی طبیعتیں اس کو پسند نہیں کرتی تھیں وہ بھی مانگ لیا کرتے تھے، اور جب کوئی اس کو کھا لیتا تو حضرت کو اس پر بڑی خوشی ہوتی تھی کہ یہ چیز ضائع ہونے سے بچ گئی۔

اور واقعہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، اس لیے ضائع نہیں ہونی چاہیے، اگر اس کی ناقدری ہو جاتی ہے تو بہت سی مرتبہ آدمی اللہ تعالیٰ کی دوسری بہت ساری نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔

پسند و ناپسند کے معاملہ میں معتدل تعلیم

یہاں حضورِ اکرم ﷺ کا کھانے کے معاملہ کا ایک ادب بتلایا: "مَا عَابَ رسولُ اللهِ ﷺ طَعَامًا قَطُّ"، حضورِ اکرم ﷺ نے کبھی کسی کھانے پر عیب نہیں لگایا"إن اشْتَهَاهُ أَكَلَهُ، وَإِنْ كَرِهَهُ تَرَكَهُ"، اگر طبیعت میں رغبت ہوتی تو آپ تناول فرما لیتے ،اور اگر رغبت نہیں ہوتی تو نہیں کھاتے تھے۔ اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر چیز ہماری طبیعت کو پسند ہی ہو، بعض کھانے ایسے بھی ہوتے تھے جو حضور ﷺ کی طبیعت کو بھی پسند نہیں تھے لیکن حضور ﷺ کبھی اس کی برائی نہیں فرماتے تھے، اس پر عیب نہیں لگاتے تھے۔

طبیعت کا کسی چیز کی طرف میلان اور اس کو پسند کرنا، نہ کرنا؛ ایک غیر اختیاری چیز ہے، یہ طبیعت کا ایک تقاضہ ہوتا ہے، کبھی طبیعت کسی چیز کو پسند کرتی ہے اور کبھی کسی چیز کو ناپسند کرتی ہے۔ تو اگر آپ کی طبیعت کو یہ کھانا ناپسند ہے تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے، اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں کہ ہر چیز کو آپ پسند ہی کیجئے، لیکن یہ ہے کہ اگر آپ کی طبیعت کو پسند نہیں ہے تو آپ اس کی برائی نہ کریں، اس پر عیب نہ لگائیں ، اس کی خوردہ گیری نہ کریں۔ اگر عیب لگائیں گے تو یہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی ناقدری ہوگی، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

سرکہ بہت اچھا سالن ہے

۷۳۷:- وعن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَأَلَ أَهْلَهُ الأُدُمَ ،فقالوا : مَا عِنْدَنَا إِلاَّ خَلٌّ، فَدَعَا بِهِ، فَجَعَلَ يَأْكُلُ، ويقول: نِعْمَ الأُدُمُ الخَلُّ، نِعْمَ الأُدُمُ الخَلُّ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے گھر والوں سے سالن مانگا (کہ روٹی کے ساتھ کھانے کے لیے کوئی سالن ہے؟) گھر والوں نے کہا: ہمارے پاس تو صرف سرکہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: لاؤ۔ پھر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سرکہ میں روٹی ڈوبا ڈوبا کر کھانے لگے اور فرمانے لگے: سرکہ بہت اچھا سالن ہے، سرکہ بہت اچھا سالن ہے۔

سال بھر کا اناج بھر لینا توکل کے خلاف نہیں

افادات:- حالاں کہ حدیثِ پاک میں موجود ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ تمام ازواجِ مطہرات کے لیے سال بھر کا غلہ بھر دیا کرتے تھے۔ اس سے علماء نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جو لوگ سال بھر کا اناج خرید کر رکھ لیتے ہیں؛ یہ توکل اور تقویٰ کے خلاف نہیں ہے، خود نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ازواجِ مطہرات کو سال بھر کا دے دیا کرتے تھے، لیکن ازواج بھی تو آپ ہی کی تھیں جو کثرت سے صدقہ وخیرات کرنے والی تھیں، اس لیے ان کو سال بھر کا جو دیا جاتا تھا وہ اپنی خوشی سے اللہ کے راستہ میں خرچ کر دیتی تھیں۔ اسی لیے حدیثِ پاک میں آتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ تین تین چاند ہم ایسے دیکھتے تھے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، چولہا نہیں جلتا تھا۔ پوچھا گیا: پھر کیا کرتے تھے؟ فرمایا: کھجور کھا کر اس پر پانی پی لیتے تھے؛ یہی ہماری غذا ہوا کرتی تھی۔

کھانے کی اور بنانے والے کی تعریف

خیر! یہ روایت لا کر باب کا جو عنوان قائم کیا تھا اس کے دوسرے جزو "إِسْتِحْبَابُ مَدْحِهٖ" کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھو! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سرکہ کی تعریف فرما رہے ہیں، حالاں کہ ہم لوگ تو سرکہ کو کبھی سالن کے طور پر استعمال بھی نہیں کرتے، کبھی

زبان کے چٹانے کے لیے کھچڑا، حلیم وغیرہ میں ڈال لیتے ہیں، ورنہ اگر سالن کی جگہ پیش کردیا جائے کہ آج تو سالن میں سرکہ ہی ہے، روٹی اور سرکہ کھالو؛ تو کون ہے جو اس پیشکش کو بہ رضا ورغبت قبول کرلے؟ طبیعت پر بڑا گراں گزرے گا کہ اچھا! سالن کی جگہ پر سرکہ کھائیں؟ اس کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے، لیکن نبیٔ کریم ﷺ سرکہ کھا رہے ہیں اور تعریف فرمارہے ہیں کہ: بڑا اچھا سالن ہے، بڑا اچھا سالن ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کھانے کی تعریف کرنی چاہیے، اس لیے کہ یہ بھی نعمت کا شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ ہے، جیسے: کوئی آدمی کوئی چیز لاکر پیش کرے، اور آپ کہیں کہ ماشاء اللہ! بڑی عمدہ چیز ہے، آپ نے تو بڑے موقع سے یہ چیز پیش کی۔ بس! آپ کے ان دو جملوں سے اس کا جی خوش ہوجائے گا، اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کے شکر کا حق ادا ہوجائے گا۔

پھر یہ ہے کہ اگر وہ سالن ہے تو جس نے وہ سالن بنایا ہے اس کی محنت کا بھی تو حق ہے کہ اس کا شکریہ ادا کیا جائے۔ اس نے اس سالن کو بنانے کے واسطے دھواں برداشت کیا، آگ کی گرمی برداشت کی، اپنا وقت لگایا، تکلیف وزحمت اٹھائی، اور آپ اتنے بخیل بن رہے ہیں کہ آپ کی زبان سے اس کی تعریف کے دو بول بھی نہیں نکل رہے ہیں؟ یہ کیسی بات ہوئی! ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کا حق ہے کہ آپ کہیں کہ ماشاء اللہ! بہت اچھا کھانا بنایا ہے۔

حضرت ڈاکٹر عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے خلیفہ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے لکھا ہے کہ حضرت ایک قصہ بیان کیا

کرتے تھے: ایک مرتبہ ایک آدمی نے ان کی دعوت کی، وہ حضرت سے بیعت تھے، اوران کی گھروالی بھی حضرت سے بیعت تھی، حضرت وہاں کھانے کے لئے تشریف لے گئے۔اورحضرت کی عادت تھی کہ کھانے کے بعد گھروالوں کاشکریہ ادا کیا کرتے تھے کہ آپ نے کھانا پکایا، ماشاءاللہ بڑالذیذ اوراچھاوعمدہ پکا تھا۔اللہ والے دوسروں کا جی خوش کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

معترض کا حال مکھی جیسا

اس پر بھی بعض لوگوں کواعتراض ہوتا ہے۔اگرکسی نے ایسا کہہ دیا تو بعض لوگ اس کوغلط جامہ پہناتے ہیں، حالاں کہ وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے یہ دو جملے بولنے میں کیا حکمت ہے، اللہ والے دراصل گھروالوں کی دلجوئی کرنا چاہتے ہیں، اور یہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے۔لیکن جن کا مزاج ہی ٹیڑھا ہواور جس کی طبیعت ہی میں کجی ہو، ان کا حال مکھی جیسا ہوتا ہے: مکھی جب کسی باغ میں جائے گی تو پورے باغ میں پھل اور پھول ہیں، لیکن کسی کونہ میں پاخانہ پڑا ہوگا تو وہ سب چھوڑ کر وہیں جائے گی اور اسی پر بیٹھے گی، پورے باغ میں پھل ہوتے ہیں وہ اس کونظر ہی نہیں آتے، پاخانہ ہی نظر آتا ہے۔تو جن لوگوں کا مزاج تنقیدی اورعیب جوئی والا ہوتا ہے، وہ اسی طرح کی باتیں کیا کرتے ہیں۔

خیر! حضرت ڈاکٹر عارفی رحمۃ اللہ علیہ جب کھانے سے فارغ ہوکر جانے لگے تو چوں کہ گھروالی بھی بیعت تھی اس لئے پردہ کے پیچھے سے اس نے بھی سلام کیا، حضرت نے سلام کا جواب دینے کے بعد شکریہ کے کلمات کہے کہ: آپ نے کھانا ماشاءاللہ بڑا عمدہ پکایا تھا، ہمیں بہت پسند آیا۔ایسا کہنا بھی چاہیے تا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکرادا ہو،

اور ان کا حوصلہ بڑھے، دلجوئی بھی ہو جائے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب کے اس کہنے پر پردے کے پیچھے سے رونے کی اور سسکیوں کی آواز آنے لگی۔ حضرت ڈاکٹر صاحب بھی سہم گئے کہ پتہ نہیں، کیا بات ہوئی! کیا میری طرف سے کوئی ایسی چیز پیش آئی کہ وہ خاتون رونے لگ گئی۔ حضرت نے پوچھا: کیا میری طرف سے کوئی تکلیف پیش آئی: تو میں معافی چاہتا ہوں۔ تو اس خاتون نے رونے کو ضبط کرتے ہوئے کہا: نہیں حضرت! ایسا کچھ بھی نہیں ہے، بلکہ یہ جو آپ کے ساتھ میرے شوہر کھڑے ہیں نا، چالیس سال سے کھانا پکا کر ان کو کھلا رہی ہوں، آج تک ایک دن بھی انہوں نے ایسا کوئی جملہ نہیں کہا ہے کہ تم نے کھانا بہت اچھا پکایا، آج آپ کی دعوت تو ہم نے پہلی مرتبہ کی اور آپ یہ کہہ رہے ہیں؛ اس لئے میرا جی بھر آیا۔

اس کا احسان اور ہمارا بخل!

آپ اور ہم اس مجلس میں جتنے بھی بیٹھے ہوئے وہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیں کہ یہ واقعہ ہے یا نہیں؟ ہم کبھی ایسا کرتے ہیں؟ حالاں کہ وہ بیچاری ہماری جو خدمتیں کرتی ہے، اس کا مسئلہ بھی میں آپ کو بتا دوں (یہاں سے آواز گھروں تک بھی جا رہی ہے، خواتین بھی سن رہی ہیں) مسئلہ کے اعتبار سے بیوی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آپ کے لیے کھانا پکائے، بلکہ وہ آپ سے یہ مطالبہ کر سکتی ہیں کہ ہمیں پکا پکایا کھلاؤ، لیکن جب وہ پکا کر ہمیں دے رہی ہے تو وہ ہم پر بڑا احسان کر رہی ہے۔ جب وہ اتنا بڑا احسان کر رہی ہے تو ہم اتنے کیوں بخیل بن رہے ہیں کہ ہماری زبان سے اس کی تعریف کا ایک جملہ بھی نہیں نکلتا؟ ہم صرف اتنا ہی کہہ دیں کہ آج کھانا بہت اچھا اور عمدہ پکایا ہے۔

بیوی کے مزاج سے واقفیت رکھنا سنت طریقہ ہے

واقعہ یہ ہے کہ جس کے دل پر گزرتی ہے وہی اس چیز کو محسوس کرسکتا ہے۔ایک عورت جو آپ کے ساتھ پوری زندگی گزار رہی ہے؛اس کے مزاج سے واقفیت رکھو۔ ویسے شوہر کے لیے ضروری ہے کہ اپنی بیوی کی دلجوئی کرتا رہے اور اس کے مزاج کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتا رہے۔پہلے بھی ایک حدیث گزری ہے اس کو تازہ کرادیتا ہوں۔نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:اے عائشہ!جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو تو وہ بھی میں جان لیتا ہوں،اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو تو وہ بھی میں جان لیتا ہوں۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول!آپ یہ کیسے جان لیتے ہیں؟آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو اور دورانِ گفتگو کسی بات پر قسم کھانے کی نوبت آتی ہے تو تم یوں کہا کرتی ہو:"لَا!وَرَبِّ مُحَمَّدٍ"، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رب کی قسم۔اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو،اور دورانِ گفتگو کسی بات پر قسم کھانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو تم یوں کہا کرتی ہو:"لَا!وَرَبِّ اِبْرَاهِيْمَ"، اس وقت میرا نام نہیں لیتی۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول!صرف آپ کا نام ہی زبان سے نہیں لیتی،ورنہ میرے دل میں تو آپ کی محبت بھری ہوئی ہے۔

عرض یہ کرنا ہے کہ دیکھیے!نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے مزاج کا کیسا مطالعہ کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مزاج کب کیسا ہوتا ہے؛وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پتہ چلتا تھا۔

ہم اگر واقف نہیں تو بیوی کے مزاج سے!

ہماری تو ساری زندگیاں بیوی کے ساتھ گزر جاتی ہیں لیکن ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ بیوی کا مزاج کیا ہے!کبھی ہم نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا!کبھی اس کا

مطالعہ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی! آپ فیکٹری اور دکان کے ایک ایک نوکر کے مزاج سے واقف ہیں، اپنی آفس کے ہر ہر ملازم کے مزاج سے واقف ہیں کہ کس سے کب کس طرح کام لینا ہے، اگر واقف نہیں تو بیوی ہی کے مزاج سے واقف نہیں۔ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ وہ بیچاری اتنی خدمتیں کرتی ہے کہ آپ کے کپڑے دھوتی ہے، کھانا پکا کر دیتی ہے، بستر تیار کرتی ہے، لہٰذا اگر نیند نہ آئی ہو تب بھی کہہ دو کہ ماشاء اللہ! کیسا عمدہ بستر تیار کیا تھا کہ لیٹتے ہی آنکھ لگ جانے والی تھی، اس سے اس کا جی خوش ہو جائے گا۔ اور ایک مسئلہ آپ کو بتا دیتا ہوں کہ جن مواقع پر شریعت نے توریہ (یعنی خلافِ واقعہ بات) کی اجازت دی ہے، اس میں بیوی کو خوش کرنے والی بات بھی ہے۔

تو کھانے کی تعریف بھی ہونی چاہیے، یہ حرص ولالچ کی علامت نہیں ہے، بلکہ نبیٔ کریم ﷺ کی سنت اور آپ کا طریقہ ہے۔

باب مَا یقوله من حضر الطعام وهو صائم إِذَا لَمْ یفطر

و

باب مَا یقوله من دُعِیَ إِلَی طَعَامٍ فَتَبِعَهُ غیره

کسی کو کھانے کی دعوت دی گئی، اور کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ ہو گیا، تو وہ کیا کہے؟

دعوت میں حاضر ہونے والا اگر روزہ دار رہے تو کیا کہے؟

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دعوت قبول کرنا سنت ہے

۷۳۸:-وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم : إِذَا دُعِيَ أَحَدُكُمْ فَلْيُجِبْ، فَإِنْ كَانَ صَائِماً فَلْيُصَلِّ، وَإِنْ كَانَ مُفْطِراً فَلْيَطْعَمْ.

قَالَ العلماءُ: معنی ((فَلْيُصَلِّ)): فَلْيَدْعُ، ومعنی ((فَلْيَطْعَمْ)): فَلْيَأْكُلْ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کسی کو کھانے کے لیے دعوت دی جائے تو قبول کرنی چاہیے (روزہ ہو تب بھی دعوت قبول کرو اور اس کے مکان پر تشریف بھی لے جاؤ) اگر آپ روزہ دار ہیں تو اس کے گھر جا کر (چاہے کھانا مت کھانا، لیکن) اس کے لیے دعا کر دیجئے۔ اور اگر روزہ نہیں، تو کھانا بھی کھا لیجیے۔

افادات:- اگر میزبان کا کھانے کے لیے اصرار ہو، اور مہمان کے نہ کھانے سے میزبان کی دل شکنی کا اندیشہ ہو، تو میزبان کی دلجوئی کے واسطے اس مہمان کے لیے نفل روزہ توڑنے کی اجازت ہے، پھر بعد میں اس کی قضا کر لے۔ یہ بات صرف نفل روزہ کی ہے، فرض یا قضا روزہ رکھا ہو تو نہیں توڑنا چاہیے۔ ویسے اس کے مکان پر جا کر کہہ دے کہ مَیں روزہ سے ہوں، اور دعا کر دے۔

ایک مؤمن کے دوسرے مؤمن پر جو حقوق ہیں ان میں سے ایک یہ حق بھی ہے کہ اگر کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے تو دعوت قبول کرنی چاہیے۔ دعوت کے قبول کرنے کے لیے کچھ شرائط بھی ہیں (اس موضوع کی تفصیل [جلد:۴/ص:۲۵۷ تا ۲۶۵] پر دیکھئے۔ مرتب)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مہمان اگر دعا دینے پر اکتفاء کرتا ہے تو میزبان کو اس پر بھی راضی ہو جانا چاہیے، بلا وجہ کھانے پر اصرار نہ کرے، خاص کر کھانے کی وجہ

سے مہمان کو تکلیف ہوتی ہو تو پھر کیوں اصرار کیا جائے۔ مقصد تو مہمان کو خوش کرنا اور دعا لینا ہے، اور جب دعا مفت میں مل رہی ہے تو پھر آپ کیوں فیس دینا چاہتے ہیں؟

طفیلی کے احکام

۷۳۹:- عن أبي مسعود البدري رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: دعا رجلٌ النبيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لطعامٍ صنعه له خامسَ خمسةٍ، فتبعهم رجلٌ، فلمّا بلغ الباب، قال النبيّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: إنّ هذا تبعنا، فإن شئتَ أن تأذن له، وإن شئتَ رجع. قال: بل آذنُ له يا رسولَ الله. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پانچ آدمیوں کی دعوت کی (گویا اس نے یوں کہا: اے اللہ کے رسول! آپ کے ساتھ مزید چار آدمیوں کی یعنی کل پانچ کی میں دعوت کرتا ہوں، ان چار کی آپ ہی تعیین فرما لیجئے) جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے جا رہے تھے تو مزید ایک آدمی ساتھ ہو گیا (کل چھ ہو گئے) جب میزبان کے دروازہ پر پہنچے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میزبان سے کہا: یہ ایک زائد آدمی ہمارے ساتھ آ گیا ہے، اب اگر تم اس کو اجازت دو تو آئے گا، ورنہ چلا جائے گا۔ میزبان نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں اس کو اجازت دیتا ہوں (بے تکلفی کی بات تھی تو وہ بھی شریک ہو گیا)

افادات:- ویسے بلا اجازت چپکے سے کسی کی دعوت میں شریک ہو جانا، جیسے: بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ شادیوں کے کھانوں میں چپکے سے پہنچ جاتے ہیں اور دعوت وصول کر کے آ جاتے ہیں؛ یہ جائز نہیں ہے۔ پرانے زمانہ میں مستقل ایک طبقہ تھا جن کو طفیلی کہا جاتا تھا۔ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کا مستقل ایک رسالہ ہے، جس میں انہوں نے طفیلیوں کے اس قسم کے قصہ بیان کئے ہیں کہ وہ مختلف حیلے بہانوں سے

لوگوں کے یہاں دعوتوں میں پہنچ جاتے تھے، ایسوں کے لیے تو حدیث پاک میں وعید آئی ہے، حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسا آدمی جو بغیر دعوت کے کہیں چلا جائے اور کھا کر آجائے وہ چور بن کر گھستا ہے اور غاصب وڈاکو بن کر نکلتا ہے (ابوداودشریف: باب مَاجَاءَ فِي إِجَابَةِ الدَّعْوَةِ) اس لیے ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کیا جائے۔

جہاں وہ برا ہے؛ وہاں یہ بھی برا ہے

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اگر میزبان کی طرف سے اجازت دی جائے تب بھی کھانے سے انکار کیا جائے۔ جہاں وہ برا ہے وہاں یہ بھی برا ہے، جیسے: بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ اتفاق سے ان کو دعوت نہیں دی گئی تھی، اور وہ پہنچ گئے، اب صاحبِ خانہ بڑے شوق اور رغبت سے ان کو دیکھ کر خوش ہو کر کہتا ہے: آیئے، تشریف لایئے، لیکن یہ یوں سوچتا ہے کہ مجھے پہلے سے دعوت کیوں نہیں دی تھی، اس لیے میں نہیں کھاتا۔ اب ساری دنیا سمجھا رہی ہے کہ آجاؤ، بھائی! آجاؤ۔ صاحبِ خانہ بھی اس کا پیر پکڑ رہا ہے، تب بھی یہ جناب کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ بھی بہت برا ہے۔ شریعت اس کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ دعوت کے لیے ایسا کوئی اصول نہیں ہے کہ پہلے سے کہا جائے تو ہی دعوت؛ اور اگر وقت پر کہا جائے تو عداوت۔ ایسا کسی حدیث میں نہیں آیا ہے۔ جو لوگ ایسا مزاج رکھتے ہیں انہوں نے اگر کہیں کسی حدیث میں دیکھا ہو تو ہمیں بھی بتا دیں تا کہ ہم دوسروں کو بتا سکیں۔

گم راہ طفیلی کا قصہ

ایک طفیلی کا قصہ ہے کہ چند شعراء کسی بادشاہ کی خدمت میں جا رہے تھے، ایک طفیلی نے دیکھا تو یوں سمجھا کہ دعوت ہوگی، اس لیے وہ بھی ساتھ ہو گیا، اس کو پتہ نہیں تھا

کہ یہ شاعر لوگ ہیں، اور بادشاہ کی شان میں قصیدہ کہنے کے لیے جارہے ہیں، اب ان کے ساتھ اندر داخل تو ہوگیا، جب وہ سب دربار میں پہنچے تو بادشاہ کی طرف سے اجازت ملی اور تمام شاعروں نے اپنا اپنا قصیدہ پیش کیا اور انعام پایا۔ یہ اخیر میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ میں تو دعوت سمجھ کر آیا تھا، یہاں تو مَیں پھنس گیا؛ اب کیا کروں۔ جب اس کی باری آئی تو پوچھا گیا: آپ کون ہیں؟ اس نے کہا: "وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ وَأَنَامِنَ الْغَاوِيْنَ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ"۔ میں ان گمراہوں میں سے ہوں جو شعراء کی اتباع کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے ہوں۔

دعاء

أَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى بِعَدَدِ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زندگی کے جو آداب تعلیم و تلقین فرمائے ہیں، اے اللہ! ایک ایک ادب کو پورے عظمت واحترام کے ساتھ اختیار کرتے ہوئے اپنی زندگیوں میں اپنانے کی تو ہمیں توفیق وسعادت نصیب فرما۔ اے اللہ! تو ہم سے راضی ہوجا، اپنی مرضیات پر زیادہ سے زیادہ چلا کر نامرضیات سے پوری پوری حفاظت فرما۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں اور طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ نفس وشیطان کی شرارتوں سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ اے اللہ! جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما، جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما۔ جو حاجت مند ہیں ان کی حاجتوں کو پوری فرما۔

اے اللہ! تمام مصائب، آفات و بلاؤں سے تیری پوری مخلوق کی پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! جس آندھی اور طوفان کے خطرے بتائے جاتے ہیں، اس سے تیری مخلوق کی پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ان بلاؤں کو تو محض اپنے فضل سے ہٹالے۔ ہمارے گناہوں کو معاف فرما۔ ہماری جن بداعمالیوں کی وجہ سے یہ بلائیں آسکتی ہیں، محض اپنے فضل سے ان بداعمالیوں کو معاف فرما۔ اپنی شانِ کریمی سے معاف فرما۔ تمام شرکاءِ مجلس کی اور جنہوں نے بھی دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں ان کی بھی جائز مرادوں کو پورا فرما۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جتنی خیر و بھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہمیں اور پوری امت کو عطا فرما، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی، ان سے ہماری اور پوری امت کی حفاظت فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ

باب الأكل مِمَّا يليه
ووعظه وتأديبه من يسيء أكله

اپنے سامنے سے کھانا
اورخلافِ ادب کھانے والے کونصیحت کرنا
اورادب سکھانا

کھانے کے آداب کی نصیحت

۷۴۰:-عن عمر بن أَبی سَلمَة رضی اللہ عنہما قَالَ: کُنتُ غُلاماً فی حِجْرِ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَكَانَتْ يَدِی تَطِيشُ فی الصَّحْفَةِ، فَقَالَ لی رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: يَا غُلامُ، سَمِّ اللہَ تَعَالَی، وَكُلْ بِيَمِينِكَ، وَكُلْ مِمَّا يَلِيكَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں چھوٹا بچہ تھا اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت ونگرانی میں تھا، ایک مرتبہ کھانے کے دوران میرا ہاتھ پیالہ میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فرمایا: اے بچے! اللہ کا نام لے کر کھاؤ، اور دائیں ہاتھ سے کھاؤ، اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔ (یہ روایت پہلے بھی کئی مرتبہ آچکی ہے)۔

۷۴۱:-عن سلمۃ بن الأَکْوَع رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ رَجُلاً أَكَلَ عِنْدَ رَسُولِ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِشِمَالِهِ، فَقَالَ: كُلْ بِيَمِينِكَ. قَالَ: لا أَسْتَطِيعُ. قَالَ: لاَ اسْتَطَعْتَ! مَا مَنَعَهُ إِلاَّ الكِبْرُ! فَمَا رَفَعَهَا إِلَی فِيهِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت سلمہ بن اُکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھ کر بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا: دائیں ہاتھ سے کھاؤ (تو حق بات کو قبول نہ کرتے ہوئے) اس نے جواب میں کہا: میں دائیں ہاتھ سے کھا نہیں سکتا (حالاں کہ ایسی بات نہیں تھی۔ وہ دائیں ہاتھ سے کھا سکتا تھا لیکن اس نے تکبر کی وجہ سے انکار کیا تھا اور بات نہیں مانی) تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے! اب نہیں کھا سکو گے (حضرت سلمہ بن اُکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں) اس کے بعد کبھی وہ اپنا دایاں ہاتھ اٹھا ہی نہیں سکا (ہمیشہ کے لئے اس کا دایاں ہاتھ بیکار ہو گیا۔)

(نوٹ:- یہ روایت پہلے بھی کئی مرتبہ آچکی ہے۔ جلد:۸ / روایت نمبر ۶۱۳ پر بھی گزری ہے۔ مرتب۔)

النّھی عن القِرَانِ بین تمرتین ونحوھما إِذَا أکل جماعة إِلاَّ بإذن رفقته

مجمع کے ساتھ کھاتے وقت کھجور وغیرہ دو، دو نہ لے

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

کھانے کے آداب میں ایک اور ادب بتلا رہے ہیں کہ جب کئی آدمی مل کر کھانا کھا رہے ہوں اور سب کے لیے مشترک طور پر کھانا رکھا گیا ہو، مثلاً: اگر کھائی جانے والی چیز کھجوریں ہیں؛ تو کھانے والے ان کھجوروں کو دو دو دانے نہ اٹھائیں، بلکہ ایک ایک دانہ اُٹھا کر استعمال کریں۔ مطلب یہ ہے کہ کھانے کے دوران کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کرنا چاہیے جس کی وجہ سے ساتھ میں کھانے والوں کی حق تلفی ہوتی ہو۔ یہ ایک بہت اہم تعلیم ہے جو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں دی ہے۔

ساتھ بیٹھ کر کھانے کے اہم آداب

۷۴۲:-عن جَبَلَةَ بن سُحَيم قَالَ: أَصَابَنَا عَامُ سَنَةٍ مَعَ ابن الزُّبَيْرِ، فَرُزِقْنَا تَمْرًا، وَكَانَ عبدُ الله بن عمر رضی اللہ عنہما يَمُرُّ بنا ونحن نأكُلُ، فَيقُولُ: لاَ تُقَارِنُوا، فإنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نَهَى عنِ القِرَانِ، ثُمَّ يَقُولُ: إِلاَّ أَنْ يَسْتَأْذِنَ الرَّجُلُ أَخَاهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت جبلہ بن سُحَیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت میں ایک مرتبہ قحط پڑا (قحط کے زمانہ میں ویسے بھی کھانے پینے کی چیزوں کی قلت ہوا کرتی ہے) تو ہمیں حکومت کی طرف سے کچھ کھجوریں مل گئی اور ہم سب ساتھ بیٹھ کر کھا رہے تھے، جب حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہمارے پاس سے گزرے تو فرمایا: کھانے کے دوران دو دو کھجوریں ایک ساتھ نہ اُٹھاؤ، اس لیے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو کھجوریں ساتھ اُٹھانے سے منع کیا ہے، البتہ اگر آدمی اپنے بھائی سے اجازت سے لے لے (اور وہ بہ رضا و رغبت اجازت دیدے، تو دو دو کھجوریں بھی ایک ساتھ اُٹھا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر انگور

کھا رہے ہیں، تو دو دانہ انگور کے ایک ساتھ نہ اُٹھائے جائیں۔)

افادات:- یہاں ایک خاص تعلیم دی گئی ہے کہ ہر وہ چیز جس میں سب کا حق ہو- جیسے کہ یہاں جو کھانا رکھا گیا تھا اس میں سب برابر کے شریک تھے، اور سب کا برابر کا حق تھا- تو اس چیز میں سے اپنا حق وصول کرتے ہوئے ہر آدمی کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ کسی دوسرے کی حق تلفی نہ ہو، کوئی بھی دوسرے سے زیادہ وصول نہ کرلے، یہ بہت ضروری تعلیم ہے۔ جب سب ساتھ مل کر کھا رہے ہوں تو ایک ساتھ دو کھجوریں اُٹھانے سے نبیٔ کریم ﷺ نے جو منع فرمایا اس کی بنیاد یہی ہے۔

ہاں! اگر آپ اپنی ذاتی کھجوریں خرید کر لائے ہیں، تو پھر وہاں دو کیا، چار بھی ایک ساتھ اُٹھا کر کھا سکتے ہیں۔ لیکن اگر سب نے مل کر خریدی ہیں، یا کسی اور نے سب کے لیے رکھی ہیں، مثلاً: کسی کے یہاں دعوت ہے، اور وہاں سب کے سامنے کھانا رکھا گیا ہے، تو اس صورت میں جتنے بھی کھانے والے ہیں ان تمام کا اس کھانے میں برابر کا حق ہے، گویا سب شریک ہیں اور یہ چیز مشترک ہے، اب آپ کو اس میں سے اپنا حق وصول کرنا ہے، اور اس میں اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ اپنا حق وصول کرتے ہوئے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس کی وجہ سے دوسروں کے حق میں کمی آجائے اور حق تلفی ہوجائے۔ دو کھجوریں ایک ساتھ اُٹھانے سے جو منع فرمایا ہے اس کی وجہ یہی ہے۔

آپ کسی کے یہاں دعوت میں جائیں تو ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ داعی کی جانب سے ہر ایک کے سامنے الگ الگ پلیٹ رکھی گئی ہے، جیسے: آئس کریم ہر ایک کو الگ الگ پلیٹ میں دی گئی ہے، تو اس صورت میں چمچ میں آپ زیادہ لیں، یا کم لیں، اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے، کیوں کہ پلیٹ میں آپ کو جو حصہ دیا گیا ہے وہ آپ پورا کر رہے ہیں، کسی دوسرے کے حصہ میں آپ ہاتھ نہیں مار رہے ہیں۔ لیکن اگر

ایک ہی پلیٹ میں آئس کریم رکھی گئی ہے اور کہا گیا کہ سب اس میں سے کھاؤ، تو اس صورت میں آپ اپنے چمچ میں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ اٹھائیں، جس سے دوسروں کے حق میں کمی آتی ہو؛ اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ آپ اس انداز سے کھائیے کہ دوسرے کے حق کو ضائع کرنے والے نہ بنیں۔

یا جیسے آج کل عام طور پر دعوتوں میں ایک بڑے برتن میں سالن لاکر رکھ دیا جاتا ہے، دوسرے برتن میں چاول رکھ دیے جاتے ہیں، اور ہر ایک کے سامنے خالی پلیٹ ہوتی ہے، تاکہ ہر ایک اپنے طور پر نکال کر کھائے، تو اس میں بھی یہ بات ملحوظ رہے کہ جو چیز آپ نکال رہے ہیں اس میں کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ سالن والا بڑا برتن ہاتھ میں آگیا تو ساری بوٹیاں پہلے ہی اپنی پلیٹ میں نکال لیتے ہیں اور بعد والے صرف شوربے پر قناعت کرتے ہیں؛ ایسا نہ کریں۔ آپ کو دیکھنا ہے کہ برتن میں یہی ایک سالن آیا ہے، اور اس میں اتنی بوٹیاں ہیں کہ اگر سب کو برابر تقسیم کی جائے تو میرے حصہ میں ایک یا دو بوٹیاں ہی آتیں، تو جب آپ پہلے نکال رہے ہیں تو اپنی پلیٹ میں ایک یا دو سے زیادہ بوٹیاں نہ نکالیں، تاکہ ہر ایک کو اس کے حصہ کے بقدر مل جائے۔ بعضوں کی جو عادت ہوتی ہے کہ پہلے برتن ہاتھ میں آجانے کی صورت میں پورا اپنی پلیٹ میں ہی اتار لیتے ہیں، یہ بالکل غلط طریقہ ہے، اس میں دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اس صورت میں تو آپ زیادہ وصول کر کے گویا اپنے بھائی کا حق مار رہے ہیں، یہ گناہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہی نقل فرماتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ جب بھی کسی کے دسترخوان پر جائیں تو یہ چیز ہمیشہ ملحوظ رہنی چاہیے، اپنی پلیٹ میں زیادہ اتار لینا عار کی چیز سمجھی جاتی ہے، اور اس کو بدتہذیبی پر محمول کیا جاتا ہے۔

مہذب گیر تعلیم

ایک مؤمن کو اللہ تعالیٰ اور آپ ﷺ کی طرف سے جو بھی آداب تعلیم دیئے گئے ہیں وہ سب ایسے ہیں کہ جس سے آدمی مہذب اور باادب بنتا ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں یہی تعلیم ہے کہ آپ اپنا حق وصول کرنے میں ایسا کوئی طریقہ اختیار نہ کریں جس سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہو۔

مثلاً: ٹرین میں آپ کو سفر کرنا ہے، آپ نے سورت سے بمبئی کا ٹکٹ لیا، جب اسٹیشن پر پہنچے اور ٹرین میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ دوسرے پیسنجر ابھی آئے نہیں ہیں، اب آپ نے سیٹیں خالی دیکھ کر اپنا بستر بچھالیا اور ایک کے بجائے چار سیٹوں پر قبضہ کر کے لیٹ گئے، حالاں کہ آپ نے جو کرایہ ادا کیا ہے جس کی وجہ سے آپ کا حق تو صرف ایک سیٹ کا بنتا ہے، لیکن آپ دوسری تین سیٹوں پر جو قبضہ کر رہے ہیں، تو اس طرح ظاہر ہے کہ آپ بعد میں آنے والوں کی حق تلفی بھی کر رہے ہیں اور دوسروں کو تکلیف میں بھی ڈال رہے ہیں، پھر ہوتا یہ ہے کہ بعد میں آنے والے تو کھڑے ہیں اور آپ آرام سے لیٹے ہوئے ہیں، یہ بالکل گناہ کا کام ہے، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ایک تو آپ نے اپنے حق سے زیادہ وصول کیا اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کی حق تلفی بھی کی، یعنی دوسرے لوگ اگر موجود نہ ہوتے تب بھی آپ ایک سے زیادہ سیٹ پر بیٹھ کر ایک سیٹ سے زیادہ وصول کرنے والے قرار دیئے جاتے۔

ترقی کا راز

کسی زمانہ میں پڑھا تھا کہ ایک صاحب یورپ کے کسی سفر پر گئے تھے، انہوں نے بتلایا کہ فرانس میں ٹرین میں سفر کر رہا تھا، دیکھا کہ ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے اور اس پر

خوب نیند طاری ہے، باقی سیٹیں خالی تھیں، پورا ڈبہ خالی تھا لیکن وہ بیٹھے بیٹھے اپنی نیند پوری کررہا تھا۔ میں نے اس سے کہا: باقی سیٹیں خالی ہیں، لیٹ جاؤ۔ تو اس نے کہا: میں نے کرایہ ایک ہی سیٹ کا دیا ہے، اس لیے مجھے ایک ہی سیٹ استعمال کرنے کا حق ہے، چاہے باقی سیٹیں خالی ہیں لیکن مجھے اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں۔ یوروپ والوں کی ترقی کا راز یہی ہے، اس لیے کہ دنیا تو دارالاسباب ہے۔

اسی لیے ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ نبئ کریم ﷺ نے زندگی گزارنے کا جو طریقہ ہمیں تعلیم فرمایا ہے اس میں ایسی تعلیمات ہیں جس میں دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی، راحت اور فائدہ موجود ہے۔ معاشرت یعنی زندگی گزارنے اور آپس کے تعلقات کو نبھانے کا جو طریقہ بتلایا ہے اس میں اگر ہم شریعت کے احکام کا لحاظ کریں گے تو ہماری دنیوی زندگی بھی راحت و آرام، سکھ، چین و اطمینان والی بن جائے گی۔ اور اگر ہم شریعت کا لحاظ صرف عبادات، نماز، روزہ وغیرہ میں کریں، اور معاشرت، اخلاق و معاملات میں نہ کریں؛ تو دنیوی اعتبار سے پریشانیوں کا شکار ہوں گے۔ یوروپ والے اگرچہ ایمان نہیں رکھتے جس کی وجہ سے آخرت کی نجات یعنی جہنم سے بچاؤ تو نصیب نہیں ہوگا، لیکن معاشرت کے اندر ان چیزوں کو وہ اپنائے ہوئے ہیں جن کی نبئ کریم ﷺ نے ہمیں تعلیم دی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیوی اعتبار سے وہ راحت، چین اور اطمینان سے ہیں۔

اسی طرح وہ لوگ معاملات کے اندر دیانت و امانت کا پورا پورا لحاظ کرتے ہیں کسی چیز میں کوئی عیب ہے، اور دیکھنے میں چاہے وہ چیز معمولی ہو لیکن وہ فوراً بتادیتے ہیں کہ اس میں یہ نقص ہے۔ استعمال شدہ چیز کے بارے میں بتادیتے ہیں کہ یہ چیز استعمال شدہ ہے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ خریدنے والا چاہے کتنا ہی ماہر ہو لیکن اس کو

پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ چیز استعمال شدہ ہے مگر وہ بتادیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تجارت بھی برابر ترقی کررہی ہے، کاروبار میں اضافہ ہورہا ہے۔ ہمارے یہاں یہ ہے کہ ہم اپنے کاروبار میں غبن اور دھوکہ بازی سے کام لیتے ہیں، تو اچھا خاصہ کاروبار چل رہا ہوتا ہے، لیکن تھوڑی سی دھوکے بازی کے نتیجہ میں سارا اعتماد ختم ہوجاتا ہے اور ہمیشہ کے لیے آدمی نقصان اُٹھاتا ہے۔

شرعی قانون پر عمل کا ایک کافر کو فائدہ

کسی رسالہ میں پڑھا تھا کہ جنوب کے کسی علاقہ میں ایک صاحب تھے، وہاں بارش نہیں ہوئی پھر بھی ان کی کھیتی باڑی کو نقصان نہیں ہوا، دوسروں کی کھیتیوں کو روگ لگتے، لیکن اس کی کھیتی کو کبھی کوئی روگ بھی نہیں لگتا تھا، بارش کی کمی کی وجہ سے دوسروں کی پیداوار میں کمی آتی تھی لیکن اس کو کبھی کمی نہیں ہوتی تھی۔ کسی نے پوچھا: بھائی! کیا بات ہے؟ اس نے کہا: میں نے پڑھا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں یہ حکم ہے کہ اگر بارش کے پانی سے کھیتی ہو تو دسواں حصہ، اور اگر خود پانی پلایا ہو تو بیسواں حصہ نکال کر اس کا صدقہ کیا جائے؛ مَیں جب سے اس پر عمل کرتا ہوں تو آج تک کبھی میری کھیتی کو نقصان نہیں ہوا۔ تو شریعت کا قانون بہت قیمتی ہے، وہ بھلے ہی کافر تھا لیکن اس نے دنیا میں اس حکم پر عمل کیا تو دنیوی طور پر اس کا جو فائدہ ہے وہ اس کو حاصل ہوا، اگرچہ ایمان نہ ہونے کی وجہ سے آخرت کا فائدہ نہیں ملے گا۔

معاملہ کتنا سنگین ہے

خیر! مَیں یہ بتلا رہا تھا کہ مشترک چیزوں کے استعمال کے لیے شریعت نے ہمیں باقاعدہ یہ طریقہ بتایا ہے کہ ایسا کوئی طرز اختیار نہ کیا جائے جس میں کسی کا حق مارا

جائے، یا کسی کو تکلیف ہو۔ مثلاً: ہم ٹرین میں سفر کر رہے ہیں، اور دوسروں کی سیٹوں پر قبضہ کر کے سو گئے اور دوسرے لوگ کھڑے رہے تو قرآنِ پاک میں آیا ہے: ﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ﴾ جو ساتھی تھوڑی دیر کے لیے ساتھ ہو گیا اس کا بھی حق ہے، لیکن اس طرح ہم نے اس کی حق تلفی کی۔ دو چار گھنٹے کے بعد وہ اور ہم جدا ہو گئے، پھر چند سالوں کے بعد کسی کے بتانے سے ہمیں احساس ہوا کہ ہم نے یہ جو کیا تھا وہ غلط تھا اور گناہ کا کام تھا، اب توبہ کی توفیق ہوئی تو جو لوگ موجود ہیں اور جن کو جانتے بھی ہیں ان سے تو معافی مانگ لیں گے، لیکن وہ ساتھی جو سفر میں ہنگامی طور پر ساتھ ہو گیا تھا جس کو تو ہم جانتے بھی نہیں ہیں، اور نہ اس کا کوئی ایڈریس ہے، ہم نے اس کی جو حق تلفی کی ہے اس کی تلافی کا کیا راستہ ہوگا! اب چاہے راتوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے ہم کتنا ہی روئیں، لیکن جب تک وہ معاف نہ کرے وہاں تک معاف ہونے والا نہیں ہے، اس لیے سوچو کہ معاملہ کتنا سنگین ہے!۔

معمولی سی غفلت سے حرام کا ارتکاب

اسی لیے جو چیزیں مشترک ہوا کرتی ہیں اس میں سے اپنے حق کی وصول یابی کے لیے شریعت نے ہمیں باقاعدہ یہ طریقہ بتلایا ہے کہ ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ جس سے کسی کو تکلیف بھی نہ ہو، اور کسی کا حق بھی مارا نہ جائے۔ مثلاً: گھر میں یا دارالاقامہ (Boarding) میں چند لوگ ساتھ میں رہتے ہیں، تو سب کے غسل کے واسطے ایک ہی بالٹی ہوتی ہے، یا بیت الخلاء میں لوٹا ہوتا ہے، تو اس کو مشترک سمجھ کر استعمال کیا جائے، اور پھر استعمال کر کے اسی جگہ رکھا جائے جہاں اس کی جگہ متعین ہوتی ہے۔

آج کل ایک مزاج ایسا بن گیا ہے کہ ایسی چیزوں کو استعمال کے بعد جہاں جی

چاہا ڈال دیتے ہیں، جب دوسرے آدمی کو ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس کی مقررہ جگہ پر تلاش کرتا ہے، اور جب اس کو وہ نہیں ملتی تو تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حرام ہے۔ ایک معمولی سی غفلت کی بنا پر ہم حرام کام کا ارتکاب کر لیتے ہیں، اور دوسروں کو تکلیف میں ڈال دیتے ہیں۔

اسی طرح بیت الخلاء مشترک استعمال کی چیز ہے، تو آپ اس کو استعمال کر کے اس کی صفائی کا جو طریقہ ہے وہ اپنایئے، اس میں پانی ڈالنے اور فلش کرنے کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ فراغت کے بعد نجاست کو ویسا ہی چھوڑ کر نکل آتے ہیں، اگر ہم کبھی جاتے ہیں اور ایسی صورت پیش آتی ہے تو ہماری طبیعت اس کا بڑا برا اثر لیتی ہے اور اس سے ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے، ہم سوچتے ہیں کہ کیسے نامعقول آدمی نے اس کو استعمال کیا ہے؟ پھر اگر ہم بھی ایسی ہی شکل اختیار کریں تو اس کا نتیجہ بھی تو یہی نکلے گا؛ حالاں کہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ تو جب آپ بیت الخلاء کو استعمال کر رہے ہیں تو فراغت کے بعد اس کی صفائی کا جو طریقہ ہے اس کو عمل میں لاتے ہوئے اس کو صاف کر کے نکلیے، ایسا نہیں کہ ویسا ہی چھوڑ کر نکل آئے۔ اسی طرح چھوڑ دینے کی شکل میں دوسروں کو جو تکلیف ہوگی اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

اہلِ یورپ کے یہاں اصول کی پابندی

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں انگلینڈ میں ٹرین کے اندر سفر کر رہا تھا، مجھے استنجاء کا تقاضہ ہوا تو میں بیت الخلاء کے پاس گیا، وہاں دیکھا کہ ایک خاتون کھڑی ہوئی تھی تو میں یوں سمجھا کہ اندر کوئی ہے، اس کے نکلنے کے انتظار میں یہ کھڑی ہے، میں واپس جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا، تھوڑی

دیر کے بعد پھر دیکھا تو وہ عورت وہیں کھڑی تھی، مَیں بیت الخلاء کے پاس گیا تو دیکھا کہ دروازہ پر لکھا ہوا تھا کہ خالی ہے، تو مَیں نے اس خاتون سے کہا: اگر آپ اندر جانا چاہتی ہیں تو جائیں، ورنہ مَیں جاؤں؟ اس نے کہا: مَیں ایک خاص وجہ سے یہاں کھڑی ہوں، دراصل مَیں اپنی ضرورت کے لیے اندر گئی تھی، فراغت کے بعد فلش کرنا چاہتی تھی کہ ٹرین اسٹیشن پر آ کر کھڑی ہو گئی، اب چوں کہ اندر لکھا ہے کہ جب گاڑی اسٹیشن پر کھڑی ہو تو بیت الخلاء کو استعمال بھی نہ کیا جائے اور فلش بھی نہ کیا جائے، اب مَیں اس انتظار میں ہوں کہ گاڑی چلے تو مَیں فلش کر کے اس کو صاف کروں۔

دیکھئے! یوروپ والے اصول کی پابندی کا کتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ڈابھیل میں

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ جس زمانہ میں ڈابھیل میں قیام تھا، تو جہاں آج بھی اساتذہ کی قیام گاہ ہے، اس کے سامنے اس وقت بیت الخلاء تھے، آج کل تو وہ بند کر دیئے گئے ہیں، انہی بیت الخلاء میں حضرت شاہ صاحب تشریف لے جاتے تھے، پانی باہر سے لے کر جانا پڑتا تھا، اور اس کا قدمچہ جو بنا ہوا تھا وہ فلش کے انداز کا بنا ہوا تھا، اور ایسے انداز کا جو بیت الخلاء بنا ہوا ہوتا ہے اس میں پانی زیادہ ڈالنے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو حضرت شاہ صاحبؒ فراغت کے بعد بار بار باہر سے لوٹے میں پانی بھر کر لے جاتے اور ڈالا کرتے تھے، تاکہ اندر بدبو بھی باقی نہ رہے اور کسی کے استعمال کے نتیجہ میں جو بدبو پیدا ہوتی ہے اس بدبو سے بھی بعد میں جانے والے کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

دیکھو! ہمارے اکابر اس کا بھی کتنا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ تو کسی بھی مشترک

چیز کو اس طرح استعمال کرنا جس سے دوسروں کو تکلیف ہو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

مشترک کاروبار کی بدنظمی

اسی طرح ہمارے یہاں جو کاروبار عام طور پر مشترک ہوتے ہیں، اس کے اندر بھی ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ سب کو برابر کا حق ملے، یعنی سب کے حقوق اور حصے معلوم ہونے چاہئیں۔ آج کل ہمارے سماج میں یہ بھی ایک مصیبت ہے کہ باپ کے ساتھ کاروبار میں جب بیٹے وغیرہ شریک ہوتے ہیں تو ہر ایک کا کتنا حصہ رہے گا وہ متعین نہیں کیا جاتا، کسی بھی تعیین کے بغیر ساتھ میں کام کرتے ہیں۔ اگر شروع میں کہا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ ایک باپ کی اولاد ہے، اس کی کیا ضرورت ہے؟ اور ایسی بھی کیا غیریت دکھلانی؟ لیکن پھر ہوتا یہ ہے کہ جب بڑوں کی شادی ہو جاتی ہے اور ان کی اولاد ہوتی ہے، تو ایک کے یہاں چار اولاد ہوئی اور دوسرے کے یہاں ایک ہی ہے، تیسرے کے یہاں دس ہے، اب چقمق شروع ہوتی ہے کہ دس والا تو بہت کھاتا پیتا ہے، اس کے یہاں زیادہ پیسہ استعمال ہوتا ہے، اور اس کے یہاں زیادہ چیزیں جاتی ہیں۔ اب اگر کسی کے یہاں شادی کی نوبت آئی تو کہا جاتا ہے کہ اس کے یہاں تو زیادہ خرچ کیا گیا، میرے یہاں کے موقع پر کم خرچ کیا گیا۔ ایک زمانہ تک یہ سلسلہ چلتا ہے، لیکن یہی چیزیں دھیرے دھیرے آگے بڑھتی رہتی ہیں، اور دلوں کے اندر میل پیدا ہوتا رہتا ہے، پھر یہی لاوا کسی دن جب باہر آتا ہے، تو ایسا آتا ہے کہ زندگی بھر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ اسی بدنظمی کی وجہ سے ہوتا ہے جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ شریعت تو یہ کہتی ہے کہ پہلے ہی سے سب کے حصے متعین کر دئے جائیں۔ والد کو بھی چاہیے کہ سب کے حصے ان کی حیثیت

کے مطابق طے کر دے کہ منافع (Profit) میں سے ہر ایک کو اتنا اتنا حصہ دیا جائے گا؛ تاکہ بعد میں پریشانی کی نوبت ہی نہ آئے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل

گھر کی چیزیں بھی متعین کر دی جانی چاہئیں، ایک ہی گھر میں سب ساتھ رہتے ہیں تو کون کس چیز کا مالک ہے، اس کا بھی خصوصی اہتمام ہونا چاہیے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: آج اگر میرا انتقال ہو جائے تو میری چیزوں کے معاملہ میں کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی، اس لیے کہ حضرت کی دو اہلیہ تھیں، اور حضرت فرماتے تھے کہ: مَیں نے لکھ دیا ہے کہ بڑی اہلیہ کے گھر میں جو بھی ہے وہ ان کا ہے، اور چھوٹی اہلیہ کے گھر میں جو بھی ہے وہ ان کا ہے، اور میری چیزیں خانقاہ کے میرے کمرے میں رکھی ہوئی ہیں۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصیت نامہ

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولانا محمد تقی صاحب فرماتے ہیں کہ: آخری زمانہ میں جب صاحبِ فراش تھے تو ان کا یہ حال تھا کہ اگر پانی منگاتے اور ہم گلاس میں پانی لاتے تو پانی پی لینے کے بعد تقاضہ فرماتے کہ یہ گلاس لے جاؤ، اگر کبھی وہیں رکھ کر ہم کسی دوسرے کام میں مشغول ہو جاتے تو بہت ناراض ہوتے۔ ایک مرتبہ ہم نے پوچھا کہ: ابّا جان! اگر کسی کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے گلاس یا برتن لے جانے میں ذرا دیر ہو جاتی ہے؛ تو آپ اتنا زیادہ ناراض کیوں ہوتے ہیں؟ تب فرمایا: بات دراصل یہ ہے کہ مَیں نے اپنے وصیت نامہ میں یہ لکھا ہے کہ میرے اس کمرے میں جتنی چیزیں ہیں اس کا مالک میں ہوں، اور گھر میں دوسری جگہوں میں جو

چیزیں ہیں اس کی مالک تمہاری والدہ ہیں، اب اگر تم وہاں سے میرے لیے کوئی چیز برتن وغیرہ لائے اور فراغت کے بعد میں فوراً بھیجنا چاہتا ہوں لیکن تم لے جانے میں دیر کرتے ہو تو مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ خدانہ کرے اس دوران اگر میری موت آ گئی اور یہ برتن میرے کمرے میں رہا تو میرے وصیت نامہ میں لکھے ہوئی تحریر کے مطابق لوگ یوں سمجھیں گے کہ یہ میرے کمرے میں ہے، اس لیے اس کا مالک میں ہوں، اور اس کو بھی میراث میں شمار کرلیں گے۔

خلاصۂ روایت

بہر حال! یہ ساری چیزیں ہیں جس کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ مشترک چیزوں میں دوسروں کی حق تلفی نہ ہو، یہ بھی بہت ضروری ہے، اور اپنا حق بھی اپنی حد کی مقدار میں ہی وصول کرنا چاہیے، اس کا بھی ہمیں پورا خیال رکھنا چاہیے۔

اسی کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو کھجوریں ساتھ لینے سے منع فرمایا۔ ہاں! ساتھی اگر اجازت دیں تو اس صورت میں کوئی بات نہیں۔ یا دوسری شکل یہ ہے کہ میزبان نے کھانے کا اتنی وافر مقدار میں انتظام کیا ہے کہ اگر آپ دو دو چار چار کھجوریں ایک ساتھ اُٹھائیں گے تب بھی کسی دوسرے کا حق ضائع ہونے والا نہیں ہے، جس کو جتنا چاہیے اتنا ملے گا، تو اس صورت میں بھی گنجائش ہے۔

باب مَا یقوله ویفعله من یأکل وَلاَ یشبع

کھانے سے سیری نہیں ہوتی، کیا کرے؟

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نیا باب قائم کیا ہے کہ جو آدمی کھانا کھائے پھر بھی اس کا پیٹ نہ بھرتا ہو؛ تو وہ کیا طریقہ اختیار کرے؟ اور اس بے برکتی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کیا کہے؟

الگ الگ کھانے کی نحوست

۷۴۳:- عن وَحْشِيِّ بن حرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ أنَّ أصحابَ رسولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم قالوا: یَارسولَ اللهِ، إنَّا نَأکُلُ وَلاَ نَشْبَعُ؟ قَالَ: فَلَعَلَّکُمْ تَفْتَرِقُونَ. قالوا: نَعَمْ. قَالَ: فَاجْتَمِعُوا عَلَی طَعَامِکُمْ، وَاذْکُرُوا اسْمَ اللهِ، یُبَارَكْ لَکُمْ فِیهِ. (رواہ أبو داود)

ترجمہ:- حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کچھ لوگوں نے آ کر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم کھاتے ہیں اور پیٹ نہیں بھرتا (کھاتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بھوکے ہی ہیں) حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ایسا معلوم ہوتا ہے تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو؟ (ساتھ میں مل بیٹھ کر نہیں کھاتے) انہوں نے کہا: جی ہاں! ایسا ہی ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ساتھ مل کر کھایا کرو (الگ الگ مت کھاؤ) اور کھاتے وقت اللہ کا نام لیا کرو، اس میں تمہیں برکت دی جائے گی۔

افادات:- پہلے بھی آچکا ہے کہ اگر آدمی شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھتا، اللہ کا نام نہیں لیتا تو شیطان کھانے میں شریک ہوجاتا ہے اس کی وجہ سے برکت ختم ہوجاتی ہے۔تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ دو کام کرنے ہیں، ایک تو شروع میں بسم اللہ پڑھو، اور دوسرا یہ کہ ساتھ میں مل کر کھاؤ، الگ الگ مت کھایا کرو، گویا بے برکتی سے بچنے کا یہ ایک طریقہ بتلایا۔

الأمر بالأكل من جانب القصعة والنهي عن الأكل من وسطها

برتن کے ایک طرف سے کھانے کا حکم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کھانے کا ایک اور ادب

یہ بھی آداب میں سے ہے کہ برتن کے بیچ میں سے نہ کھائے، یا چاروں طرف ہاتھ نہ مارے؛ اس لیے کہ اگر سب طرف سے کھائے گا اور کھانا بچے گا تو وہ اس قابل نہیں رہے گا کہ دوسرا آدمی اس کو استعمال کرے۔ اور بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ ایسے کھانے کو استعمال کرنے سے کراہیت اور ناگواری محسوس کرتے ہیں اگر ایک طرف سے کھایا ہوگا تو جو کھانا بچا ہوا ہوگا وہ ایسا محسوس ہوگا کہ کسی نے اس کو کھایا نہیں ہے، اور دوسرے لوگ اس کو استعمال کرنا چاہیں گے تو کریں گے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ درمیان میں برکت نازل ہوتی ہے اب اگر برکت اترنے کی جگہ ہی آپ نے اُڑا دی؛ تو پھر برکت کہاں آئے گی؟ جیسے: ہیلی کوپٹر کا جو ہیلی پیڈ ہوتا ہے، وہی اگر آپ نے نکال دیا تو اب ہیلی کوپٹر کہاں اُترے گا؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ: برکت بیچ میں اترتی ہے، اس لیے اس جگہ کو باقی رکھو، ورنہ برکت نہیں اترے گی۔ اور یہ حضورِ اکرم ﷺ کی بتلائی ہوئی بات ہے، اس لیے اس بحث میں پڑنے

کی ضرورت نہیں ہے کہ بیچ میں ہی کیوں اترتی ہے، دوسری طرف کیوں نہیں اترتی؟

برکت برتن کے بیچ میں اترتی ہے

۷۴۴:-وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: البَرَكَةُ تَنْزِلُ وَسَطَ الطعَامِ ؛ فَكُلُوا مِنْ حَافَتَيْهِ، وَلاَ تَأكُلُوا مِنْ وَسَطِهِ. (رواه أبو داود والترمذي)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: برکت؛ کھانے کے بیچ میں اترتی ہے، اس لیے اس کے کناروں سے کھاؤ، بیچ میں سے مت کھاؤ۔

۷۴۵:-وعن عبد الله بن بُسْرٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: كَانَ لِلنَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَصْعَةٌ يُقَالُ لَهَا: الغَرَّاءُ، يَحْمِلُهَا أَرْبَعَةُ رجالٍ؛ فَلَمَّا أَضْحَوْا وَسَجَدُوا الضُّحىٰ أُتِيَ بِتِلْكَ الْقَصْعَةِ؛ يعني وَقَدْ ثُرِدَ فِيهَا، فَالتَفُّوا عَلَيْهَا، فَلَمَّا كَثُرُوا جَثَا رسولُ الله صلی اللہ علیہ وسلم. فَقَالَ أعرابيٌّ: مَا هٰذِهِ الجِلْسَةُ؟ فَقَالَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وسلم: إنَّ اللهَ جَعَلَنِي عَبْداً كَرِيماً، وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّاراً عَنِيداً، ثُمَّ قَالَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وسلم: كُلُوا مِنْ حَوَالَيْهَا، وَدَعُوا ذِرْوَتَها؛ يُبَارَكْ فِيهَا. (رواه أبو داود بإسنادٍ جيدٍ)

((ذِرْوَتها)): أعْلاَهَا بكسر الذال وضمها.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بڑا پیالہ تھا جس کا نام "غَرّآء" تھا، وہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں کھانا رکھنے کے بعد اس کو چار آدمی چار طرف سے اُٹھاتے تھے، اور کئی آدمی ایک ساتھ بیٹھ کر اس میں کھالیا کرتے تھے۔ ایک روز صبح لوگوں نے چاشت کی نماز ادا کرلی تو وہ پیالہ لایا گیا اور اس میں ثرید تیار کیا گیا تھا (''ثرید'' یعنی گوشت کے شوربہ میں روٹیاں توڑ کر ڈال دی جائیں اور وہ نرم ہوجائیں؛ یہ ثرید کہلاتا ہے، جس کو ہم ''ملیدہ'' کہتے ہیں) اور لوگ اس کے اِرد گرد بیٹھ گئے۔ جب زیادہ آدمی ہوگئے تو

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوزانو سرسری نشست سے بیٹھ گئے (جب لوگ زیادہ ہوجاتے ہیں تو جگہ بھی تنگ پڑتی ہے اور لوگوں کو کھل کر جم کر بیٹھنے کی نوبت نہیں آتی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی سرسری نشست سے بیٹھ گئے) ایک دیہاتی نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرح بیٹھا ہوا دیکھا تو کہنے لگا: یہ بیٹھنا کیسا ہے؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے شریف غلام بنایا ہے، متکبر و سرکش نہیں بنایا ہے (یعنی جم کر بیٹھنے والی اور زیادہ جگہ روکنے والی نشست اور بیٹھک سرکش اور متکبر لوگوں کی ہے) پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کے کناروں پر سے کھاؤ، اور بیچ کا حصہ چھوڑ دو؛ وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت نازل ہوتی رہتی ہے۔

كراهية الأكل متكئاً

ٹیک لگا کر کھانے کا ناپسندیدہ ہونا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کھانے کے آداب کا بیان چل رہا تھا، ایک اور عنوان قائم کیا ہے کہ ٹیک لگا کر کھانے کا ناپسندیدہ اور مکروہ ہونا۔ چناں چہ روایت لائے ہے۔

کھانے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پسندیدہ بیٹھک

۷۴۶:- عن أَبي جُحَيْفَةَ وَهْبِ بن عبد الله رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لَا آكُلُ مُتَّكِئاً. (رواه البخاري)

قَالَ الخَطَّابِيُّ: المُتَّكِئُ هاهُنَا: هُوَ الجالِسُ مُعْتَمِداً عَلَى وِطَاءٍ تحته، قَالَ: وأرادَ أنَّهُ لا يَقْعُدُ عَلَى الوِطَاءِ وَالوَسَائِدِ كَفِعْلِ مَنْ يُرِيدُ الإِكْثَارَ مِنَ الطَّعَامِ، بل يَقْعُدُ مُسْتَوفِزاً لَا مُسْتَوطِئاً، وَيَأْكُلُ بُلْغَةً. هَذَا كلامُ الخَطَّابِيِّ. وأشارَ غَيْرُهُ إِلَى أَنَّ الْمُتَّكِئَ هُوَ المائِلُ عَلَى جَنْبِه. والله أعلم.

ترجمہ:- حضرت ابو جُحَیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔

افادات:- ٹیک لگانے سے کیا مراد ہے؟ بعض حضرات نے ٹیک لگانے کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ کوئی آدمی کھانے کے لیے دائیں طرف یا بائیں طرف جھک کر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تو اس کو ''ٹیک لگانا'' کہیں گے، جس کو عربی میں ''إِتِّكَاء''

کہتے ہیں۔لیکن علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ایک مطلب ذکر کیا ہے کہ آدمی نیچے کوئی چیز بچھا کر جم کر بیٹھ کر کھائے۔جس آدمی کا ارادہ پہلے ہی سے زیادہ کھانے کا ہوتا ہے، وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ ذرا اچھی طرح جم کر بیٹھے تاکہ برابر کھا سکے۔

دیکھو! پہلے سے زیادہ کھانے کی جو نیت ہوتی ہے اس کو اسلام پسند نہیں کرتا، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم بھی یہ نہیں ہے، بلکہ ہمیں تو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کھانا تو زندگی باقی رکھنے کے لیے بقدرِ ضرورت ہوتا ہے، اس لیے آدمی کھانے کو اپنی زندگی کا مقصود نہ بنائے۔جو لوگ کھانے کو زندگی کا مقصود بنائے ہوئے ہوتے ہیں ان کا مزاج اور سوچ ہی یہ ہوا کرتی ہے کہ اس طرح کھانے کے لیے بیٹھو کہ خوب اطمینان سے برابر جم کر کھانا وصول کر سکیں۔یہاں علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنے نیچے کوئی اچھا بچھونا بچھا کر اور نرم چیز رکھ کر جم کر بیٹھنے سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا اور اس کو پسند نہیں کیا۔بلکہ کھانے کے لیے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشست اور بیٹھک سرسری ہوا کرتی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جم کر نہیں بیٹھتے تھے، بلکہ ایک آدمی کوئی کام عجلت اور جلدی میں انجام دینا چاہتا ہو تو وہ جس طرح بیٹھتا ہے، اسی طرح بیٹھتے تھے۔جیسے: آپ کسی کے ساتھ عجلت میں بات کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو اکڑو بیٹھ جاتے ہیں، یا ایسی بیٹھک ہوتی ہے کہ بس جلدی سے فارغ ہو کر اُٹھ جاؤں گا۔معلوم ہوا کہ کھانے کے لیے بھی اسی انداز کی بیٹھک ہونی چاہیے کہ جس میں آدمی جم کر نہ بیٹھے، بلکہ سرسری نشست ہو۔سرسری بیٹھک کو عربی میں "إِسْتِیْفَازْ" کہتے ہیں کہ اگر اُٹھنے کے لیے کہا جائے تو دیر نہ لگے۔جب آدمی جم کر بیٹھتا ہے تو اُٹھنے میں ذرا تکلّف ہوتا ہے اور دیر لگتی ہے، اور جو سرسری نشست ہوتی ہے اس میں اُٹھنے میں دیر نہیں لگتی، بلکہ آدمی فوراً کھڑا ہو جاتا ہے۔تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھانے کے لیے اسی طرح کی ہیئت، اور بیٹھک و نشست کو پسند فرماتے تھے کہ جس میں جم کر نہ

بیٹھا جائے، اور زیادہ کھانے کا ارادہ بھی نہ ہو۔ اور آپ ﷺ بقدرِ ضرورت یعنی اتنا تھوڑا سا کھانا کھاتے تھے کہ جس سے آدمی کی جان بچ جائے اور ضرورت پوری ہوجائے، جس کو بقدرِ سدِّ رَمَق کہا جاتا ہے۔ ہمیں بھی یہی تعلیم دی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کھانے کے لیے اس نوع کی بیٹھک اختیار کرنا جس میں پہلے ہی سے زیادہ کھانے کا ارادہ ہو اس کو نبیٔ کریم ﷺ نے پسند نہیں فرمایا، اور اس سے آپ ﷺ نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''لَا آکُلُ مُتَّکِئاً'' میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا، یعنی جم کر بیٹھ کر نہیں کھاتا، بلکہ میرا کھانا سرسری نشست کے ساتھ بڑی عجلت میں ہوا کرتا ہے۔

ویسے بھی کھانا ایک طبعی ضرورت ہے جس کو آدمی پورا کرتا ہے، اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اس میں اپنا زیادہ وقت صرف نہ کرے، بلکہ کم سے کم وقت میں اپنی اس ضرورت کو پوری کرلے۔

بیٹھک کا اصولی طریقہ

۷۴۷:- وعن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: رَأَيْتُ رسولَ الله ﷺ جَالِساً مُقْعِياً يَأْكُلُ تَمْراً. (رواہ مسلم)

((الْمُقْعِي)): هُوَ الَّذِي يُلْصِقُ أَلْيَتَيْهِ بالأرض، وَيَنْصِبُ سَاقَيْهِ.

ترجمہ:- حضرت اَنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ آپ اُکڑو بیٹھے ہوئے کھجور تناول فرمارہے تھے۔

افادات:- ''مُقْعِياً'' کا مطلب یہ ہے جیسا کہ خود علامہ نووی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تشریح فرمائی ہے کہ: آدمی اپنی سرین زمین کے ساتھ ملا کر پاؤں کی پنڈلیاں

کھڑی کر کے بیٹھے، اس کو عربی میں ''إِقْعَاء'' کہتے ہیں، اسی کو ہم ''اُکڑو بیٹھنا'' کہتے ہیں۔

اب کھانے کے لیے بیٹھک کون سی ہونی چاہیے؟ تو اصولی طور پر علماء نے لکھا ہے کہ: آدمی کھانے کے لیے ایسی نشست اختیار کرے جس میں کھانے کا اکرام ظاہر ہوتا ہو۔ اگر ایک آدمی کرسی پر ٹیک لگا کر پیچھے ہو کر اس طرح بیٹھتا ہے کہ گویا کھانے کی طرف سے استغناء اور بے فکری معلوم ہوتی ہے کہ وہ محتاج نہیں ہے بلکہ کھانا اس کی طرف آرہا ہے؛ اس کو پسند نہیں کیا گیا، بلکہ آدمی اس انداز سے بیٹھے جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت یعنی کھانے کا محتاج ہے، اور جس ہیئت میں زیادہ سے زیادہ تواضع وانکساری معلوم ہوتی ہو، ایسی ہی بیٹھک پسندیدہ ہے۔

اب بیٹھنے والوں اور جو کھانا رکھا جاتا ہے دونوں کی سطح اگر یکساں ہو تو زیادہ پسندیدہ ہے۔ چناں چہ زمین پر کوئی دسترخوان - چاہے وہ چمڑے، پلاسٹک، یا کپڑے کا ہو - بچھا کر اس پر کھانا رکھا جائے اور آدمی بھی زمین پر ہی بیٹھے، یعنی کوئی نرم بچھونا نہ بچھائے؛ یہ زیادہ پسندیدہ ہے۔ ہاں! کوئی باریک بچھونا بچھایا جائے جس سے آرام مقصود نہ ہو، بلکہ زمین کی گرد سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایسی بیٹھک جس میں آدمی کی تواضع وانکساری کا پتہ چلتا ہو اور کھانے کی تعظیم واحترام معلوم ہوتی ہو، اس کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے زمین پر بیٹھ کر کھانے، اور کھانے اور کھانے والے کی سطح دونوں کے یکساں ہونے کو زیادہ پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق

اب کھانے والے کی تواضع والی بیٹھک اور ہیئت کیا ہو؟ تو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ

نے شامی میں تین طرح کی بیٹھکیں ذکر کی ہیں:-

۱ :- ’’اُکڑُو‘‘ یعنی آدمی سرین پر بیٹھے اور گھٹنوں کو کھڑا رکھے؛ اسی کو انہوں نے پہلا درجہ دیا ہے۔

۲ :- ’’دوزانو‘‘ یعنی جیسے ہم نماز میں قعدہ کے اندر بیٹھتے ہیں، لیکن اس میں یہ ہے کہ نماز میں بیٹھنے کے دوران تو بائیں پاؤں کو بچھا کر دائیں پاؤں کو کھڑا رکھتے ہیں، اور کھانے کے لیے بیٹھنے میں دونوں پاؤں کو بچھایا جائے گا، اور ایک کی پشت دوسرے پر رکھ کر اور آگے کی طرف جھک کر بیٹھیں گے۔

۳ :- اور تیسری ہیئت یہ ہے کہ بایاں پاؤں نیچے موڑ کر، اور دایاں پاؤں کھڑا رکھ کر بیٹھے۔

یہ تین ہیئتیں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ترتیب سے ذکر کی ہیں کہ یہ تینوں ہیئتیں گویا عاجزی و انکساری والی ہیں، ان میں سے کوئی بھی اختیار کرے۔

ٹیبل کرسی پر کھانا کیسا ہے؟

اب یہ بات آتی ہے کہ ٹیبل کرسی پر کھانا کیسا ہے؟ تو پہلے زمانہ کے اندر وہ متکبرین کا شعار سمجھا جاتا تھا، لیکن اب وہ بات باقی نہیں رہی، اس لیے نفس جائز ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہے۔ اسی لیے علماء فرماتے ہیں کہ کرسی ٹیبل پر کوئی آدمی کھائے گا تو وہ جائز ہے، البتہ اگر زمین پر بیٹھ کر کھائے گا تو یہ نشست سنت سے زیادہ قریب ہے، اور اس میں انکساری پائی جاتی ہے اور ثواب کا حق دار زیادہ ہوگا، اس لیے کبھی اگر ٹیبل کرسی پر بیٹھ کر کھانے کی نوبت آجائے تو اس کو منع نہیں کریں گے، بلکہ اس کی گنجائش ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طرز

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ ٹیبل کرسی پر بیٹھ کر کھایا، اور چوں کہ اُس زمانہ میں ٹیبل کرسی کا اتنا زیادہ چلن نہیں تھا جتنا آج کل ہے، اور اُس وقت یہ متکبرین کا شعار سمجھا جاتا تھا، اس لیے حضرت نے ان کے تشبہ سے بچنے کے لیے ٹانگیں اوپر لے لیں، یعنی کرسی کے اوپر دونوں ٹانگیں لے لیں اور کھانا کھایا۔ لیکن اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جواز کی حیثیت سے اس کی بھی پوری گنجائش ہے۔ باقی یہ ہے کہ سنت سے زیادہ قریب یہی ہے کہ آدمی زمین پر بیٹھ کر کھائے۔

باب استحباب الأكل بثلاث أصابع واستحباب لعق الأصابع، وكراهة مسحها قبل لعقها واستحباب لعق القصعة وأخذ اللقمة الّتي تسقط منه وأكلها وجواز المسح بعد اللعق بالساعد والقدم وغيرها

کھانے کا ایک ادب: تین انگلیوں سے کھانا

اس باب میں کھانے کے چند اور آداب بتا رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آدمی کھانا تین انگلیوں سے کھائے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر تین انگلیوں سے ہی کھانا کھاتے تھے ویسے چار سے بھی آپ کا کھانا ثابت ہے، اور ایک موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ انگلیاں بھی استعمال فرمائی ہیں، لیکن عام طور پر آپ تین انگلیوں سے ہی کھاتے تھے، بیچ کی انگلی، شہادت کی انگلی اور انگوٹھا۔ اور طبی اعتبار سے بھی اس کو اس لیے پسند قرار دیا گیا ہے کہ اس میں لقمہ اتنا ہی بنتا ہے جو منہ میں جا کر اچھی طرح چبے گا اور ہاضمہ میں بھی سہولت رہے گی، جب کہ پانچ انگلیوں میں لقمہ بڑا ہوگا اور چبانے میں دیر لگے گی اور ہضم میں

بھی پریشانی ہوگی، لیکن اس کے باوجود کسی آدمی کو پانچ انگلیوں کے بغیر چلتا ہی نہیں تو جائز ہے، لیکن اولیٰ یہ ہے کہ آدمی تین انگلیوں سے کھانے کی کوشش کرے۔

آج کل ہمارے زمانہ کے کھانے ایسے ہوتے ہیں جو اس زمانہ کے کھانے جیسے نہیں رہے، ہمارے زمانہ کے کھانے ذرا نرم قسم کے بنتے ہیں کہ اس کا لقمہ بنانے کے لیے پانچ انگلیاں استعمال میں لانی پڑتی ہیں۔ ویسے روٹی کا لقمہ اگر آپ تین انگلیوں سے لیں گے تو آسانی سے لقمہ بن جائے گا، اور کھچڑی تین انگلی سے لینے میں ذرا دشواری ہوجاتی ہے، اس لیے اگر کوئی آدمی پانچ انگلیاں استعمال کرتا ہے تو جواز میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

چھوٹے چھوٹے لقمے لینا

دوسرا یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے لقمہ اگر لیں گے تو سیری جلدی ہوجائے گی یعنی آپ کی بھوک کا تقاضہ جلدی ختم ہوجائے گا، اسی طرح پانی پینے میں بھی اگر آپ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیں گے تو سیری جلدی ہوجائے گی۔ گویا کم کھانے سے ضرورت پوری ہوجائے گی، اس لیے بھی یہ طریقہ پسندیدہ ہے۔

انگلیاں چاٹ لینا

ایک اور ادب یہ بتلایا ہے: انگلیاں چاٹنا۔ اس لیے کہ جب آدمی کھانے سے فارغ ہوتا ہے تو انگلیوں پر بھی کچھ کھانا لگا ہوا رہ جاتا ہے، اگر ہاتھ دھونا ہے تو دھونے سے پہلے، یا اگر کسی وجہ سے ہاتھ دھوتے نہیں ہیں، بلکہ ٹیشو پیپر یا کسی اور چیز سے پونچھ رہے ہیں، تو اس صورت میں بھی پہلے انگلیوں کو چاٹ لینا مستحب اور پسندیدہ ہے۔ دھونے یا پونچھنے سے پہلے انگلیاں نہ چاٹنے کی صورت میں کھانے کے وہ اجزاء جو

انگلیوں پر رہ گئے ہیں، ان کو دھونے میں نکال دینا، یا پونچھنے میں ضائع کر دینا ناپسندیدہ ہے، کھانے کے ادب کے خلاف ہے۔ تو انگلیوں کا چاٹنا بھی آداب میں سے ہے۔

پرانا عیب؛ آج کا فیشن/لطیفہ

جو لوگ جدید فیشن کے حامی ہوتے ہیں اور جنہوں نے اپنی زندگی کو فیشن ہی کے تابع بنا رکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ انگلیاں چاٹنا بظاہر کچھ ناشائستگی سی معلوم ہوتی ہے۔ تو پہلی بات تو یہ ہے کہ فیشن کیا چیز ہے؟ تو ذہن میں بٹھا لیجیے کہ فیشن کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ فیشن کا حال تو یہ ہے کہ وہ بدلتا رہتا ہے، پہلے زمانہ میں جس کو عیب سمجھا جاتا تھا؛ آج وہی فیشن سمجھا جاتا ہے۔

حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب ’مذہب اور سائنس‘ نامی ہے، اس میں انہوں نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ انسان کا مزاج تغیر پسند ہے، پھر لکھا ہے کہ ایک آدمی نے کپڑا خریدا اور دوڑتا ہوا گھر جا رہا تھا۔ کسی نے پوچھا: اتنی تیزی سے کیوں دوڑ رہے ہو؟ تو کہنے لگا: اس لیے دوڑ کر جا رہا ہوں کہ جلدی سے اس کو پہن لوں تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس کو پہننے سے پہلے ہی فیشن بدل جائے۔

تو فیشن کا حال یہ ہے کہ بدلتا رہتا ہے۔ اس لیے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو طریقہ بتلایا ہے اسی پر ہمیں فخر کرنا چاہیے۔ جو لوگ فیشن کو اور جدید طور وطریق کو پسند کرتے ہیں اس میں انہوں نے اپنے آپ کو ختم کر دیا ہے، اپنا لباس بھی بدل دیا، اپنے آداب واطوار بدل دیئے، اپنا چہرہ مہرہ اور شکل وصورت تک بدل دی، اس کے باوجود یہ لوگ تو راضی ہونے والے ہیں ہی نہیں: ﴿وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرۃ:۱۲۰)﴾ باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں فرما دیا ہے کہ یہود ونصاریٰ

کبھی آپ سے خوش ہونے والے نہیں ہیں، یہاں تک کہ آپ اپنا مذہب چھوڑ کر ان کا مذہب اختیار نہ کرلیں، آپ اپنے مذہب پر باقی رہتے ہوئے کبھی ان کو خوش نہیں کر پائیں گے اس لیے ہمارے لیے تو نبیٔ کریم ﷺ کا طریقہ ہی فخر کی چیز ہے۔ جیسے وہ لوگ فیشن پر فخر کرتے ہیں، ہمیں سنتوں پر فخر کرنا چاہیے۔

فیشن کا حال!

اور فیشن کا حال تو یہ ہے کہ پہلے جس چیز کو برا سمجھا جاتا تھا وہی چیز آج کل فیشن سمجھی جاتی ہے، جیسے: پہلے زمانہ میں کھڑے کھڑے کھانے کو عیب سمجھا جاتا تھا، لیکن آج کل بوفے سسٹم ایسا نکلا ہے کہ ہاتھ میں پلیٹ لے کر کھڑے رہو۔ اور جب کھانا کھولا جاتا ہے تو سب ٹوٹ پڑتے ہیں اور چھینا جھپٹی ہوتی ہے، اور ایک ہی پلیٹ میں ساری چیزیں ایک ساتھ لے کر کھڑے کھڑے جانوروں کی طرح کھاتے ہیں، اور اسی کو فیشن سمجھا جا رہا ہے۔ یہ کون سا طریقہ ہے! پہلے اسی کو برا سمجھا جاتا تھا، لیکن آج یہی چیز اچھی سمجھی جا رہی ہے۔

لباس کے معاملہ میں بھی دیکھ لیجیے کہ مرد جتنا زنانہ بنتا جائے گا، وہ اچھا سمجھا جاتا ہے اور عورت جتنی مردانی بنتی جائے اسی کو پسندیدہ سمجھتے ہیں۔ یہ فیشن کا حال ہو گیا ہے۔ امریکہ جانا ہوا تھا تو وہاں دیکھا کہ لوگ بھوؤں میں سوراخ کرواتے ہیں، اور بالی جیسا لٹکاتے ہیں، زبان کے اندر سوراخ کروا کر اس کے اندر کڑا ڈالتے ہیں۔ رخسار کے اوپر سوراخ کر کے بالی ڈالتے ہیں، اور یہ سب مرد کرتے ہیں۔ مَیں نے پوچھا: یہ کیا مصیبت ہے؟ تو بتلایا کہ: آج کل یہی فیشن ہے۔

آنکھوں دیکھا واقعہ

اور یہ فیشن اپنانے والے کیسے مست ہوتے ہیں! مجھے خوب یاد ہے، بہت سال پہلے کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ میں دہلی گیا تھا، وہاں فتح پوری مسجد کے پاس چاندنی چوک ہے، مَیں وہاں گیا تو مَیں نے دو چار یوروپین کو دیکھا جنہوں نے بالکل عورتوں جیسا لباس پہنا ہوا تھا، کان میں بالیاں ڈالی ہوئی تھیں، گلے کے اندر کچھ دانے والی تسبیح وغیرہ لٹکائی ہوئی تھیں، وہ بازار میں سے گزر رہے تھے اور تمام دوکان والے ان کو دیکھ کر ہنس رہے تھے، لیکن ان کے اوپر ذرّہ برابر بھی کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ سب لوگ ان کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں لیکن ان کو کوئی پرواہ نہیں ہے، بلکہ اپنے لباس پر اور اس ہیئت پر ان کو اتنا اطمینان اور شرح صدر ہے کہ ساری دنیا ہنس رہی ہے پھر بھی وہ اپنے حال میں مست ہیں۔ اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہم نبیٔ کریم ﷺ کا طریقہ اپنا رہے ہیں اور کسی ایک نے کوئی بات کہہ دی تو اس کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، حالاں کہ سنتوں کو اپنانے کے معاملہ میں ہمارا مزاج یہ ہونا چاہیے کہ کوئی کچھ بھی کہے ہمیں اس کی بالکل پرواہ ہی نہ ہو۔

یہ دل و دماغ میں نوٹ کرلو

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ معروف ہے کہ وہ کسریٰ کے دربار میں تشریف لے گئے تھے، وہاں کھانا کھا رہے تھے، کھانے کے دوران لقمہ نیچے گر گیا، تو جیسا کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: لقمہ اگر گر جائے تو اس کو شیطان کے لیے نہ چھوڑو، بلکہ اس کو اُٹھا کر صاف کر کے کھالو۔ چناں چہ جب انہوں نے اٹھا کر صاف کر کے کھانا چاہا تو آپ کے ساتھ آپ کا جو ایرانی خادم و غلام تھا، اس نے کہا کہ آقا! یہ

چیزیں یہاں معیوب سمجھی جاتی ہیں، لوگ آپ کو ایسا کرتے ہوئے جب دیکھیں گے تو سوچیں گے کہ انہوں نے کبھی کھانا دیکھا بھی ہے یا نہیں؟ آپ کو نادیدہ کہیں گے۔ تو حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو جواب دیا تھا وہ ہمیں اپنے دل و دماغ میں نوٹ کر لینا چاہیے، فرمایا: "أَأَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيبِي لِهٰؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ؟" ان بے وقوفوں کے لیے میں اپنے حبیب کی سنت کو چھوڑ دوں گا؟ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر ہر سنت کو ہمیں اس تصور کے ساتھ اپنانا ہے کہ جس وقت ہم وہ سنت ادا کر رہے ہوں تو یہ سوچیں کہ ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگاہوں میں محبوب ہیں ﴿قُلْ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، میرے طریقوں پر چلو، میری سنتیں اپناؤ؛ تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ جس وقت ہم نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر عمل کر رہے ہوں تو یہی تصور اپنے دل و دماغ میں تازہ رکھنا چاہیے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے کو اپنا رہے ہیں، تو اس وقت ہم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ تو جب اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں محبوب ہیں تو اب ساری دنیا ہمیں کچھ بھی سمجھتی ہو اور کچھ بھی کہتی ہو، ہمارا مذاق اُڑاتی ہو؛ اس سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے! ؎

لوگ سمجھیں مجھے محروم وقار و تمکیں ❁ پر وہ نہ سمجھیں کہ مری بزم کے قابل نہ رہا

ہمیں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں عزت چاہیے، ان دنیاداروں کی عزت کا کیا ہے، آج اگر کسی نے واہ واہ کر بھی دی، تو اس سے ہماری کون سی دنیا بن جانے والی ہے، اور کون سی دولت گھر میں آ جانے والی ہے! اس لیے اس کا خاص اہتمام ہونا چاہیے۔

ایک بزرگ کا عمل

انگلیوں کو چاٹنے سے پہلے دھو لینا، یا پونچھ لینا ناپسندیدہ ہے، اس لیے کہ اس

میں غذا ضائع ہوتی ہے۔ ہمارے اکابر میں سے حضرت قاری فتح محمد صاحب پانی پتیؒ تھے ان کے متعلق لکھا ہے کہ کھانے کے بعد کلی کے لیے پانی منہ میں لے کر اس کو بھی نگل لیتے تھے، تاکہ غذا کے جو اجزاء منہ کے اندر ہیں وہ بھی ضائع نہ ہوں۔ ہم لوگ تو پہلی کلی کا پانی منہ سے باہر نکال دیتے ہیں، اور وہ پہلی کلی کا پانی باہر نہیں نکالتے تھے بلکہ پی جاتے تھے؛ تاکہ غذا کے وہ اجزاء بھی بے کار نہ جائیں۔

پلیٹ صاف کرنے والے ادب کی تفصیل

اسی طرح کھانے کے برتن کو بھی صاف کر لینا اور چاٹ لینا پسندیدہ ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ آپ نے غذا پوری کر لی ہو۔ پہلے تو یہ ہے کہ آدمی شروع ہی سے اپنی پلیٹ کے اندر اندازہ لگا کر کھانے کی اتنی ہی مقدار نکالے جس کے متعلق اس کا خیال یہ ہو کہ میں اس کو آسانی سے پورا کر لوں گا۔ پھر جب کھانا پورا ہو جائے تو اب پلیٹ کے اندر کھانے کے جو اجزاء چپکے ہوئے ہیں، ان کے متعلق شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ان کو ضائع ہو جانے دے، بلکہ ان کو بھی صاف کر لو۔ اس کی وجہ آگے حدیث کے اندر آ رہی ہے، لیکن اگر پلیٹ میں پہلے ہی سے کھانا زیادہ ہے اور اسی میں سے کھانے کے لیے کہا گیا ہے تو اس صورت میں پہلا طریقہ جو بتلا چکا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے سے کھانا چاہیے، تو اب اپنے سامنے کی جگہ کو اچھی طرح صاف کر لیا جائے اور باقی کھانا اس انداز سے چھوڑا جائے کہ دوسرا آدمی اگر اس کو کھانا چاہے تو اس کی طبیعت کو ناگواری محسوس نہ ہو۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ پلیٹ میں جتنا کھانا ہو وہ سب پورا ہی کیا جائے۔ حالاں کہ ایسا ضروری نہیں ہے، بلکہ اصل سنت یہ ہے کہ اگر آپ پلیٹ کا کھانا پورا

کر چکے ہیں، تو اب کھانے کے جو اجزاء پلیٹ کے اندر چپکے رہتے ہیں اس کو صاف کر لیجیے۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر پلیٹ میں ایک کلو ہے تو ایک کلو کھانا ہی پڑے گا، چاہے آپ کی طاقت ہو یا نہ ہو۔

ایک قصہ

کئی سال پہلے کا قصہ ہے، ایک مرتبہ گنگوہ جانا ہوا، ہم لوگ رات میں دیر میں پہنچے تھے، وہاں معلوم کیا کہ کوئی ہوٹل ہے؟ ایک پرانا ہوٹل ملا، وہاں کھانے کے لیے گئے۔ ہم سب بھوکے تھے، کھانے کے لیے بیٹھے۔ جب کھانا آیا تو اس کو پورا نہیں کر سکے، پلیٹ میں کھانا بچ گیا۔ وہاں کے دیہاتی لوگ بیٹھے ہوئے تھے، وہ یوپی کی دیہاتی انداز میں کہنے لگے: اجی مولوی جی! تم نے پلیٹ کو صاف نہیں کیا؟ میں نے کہا: یہ کھانا ہی ہم سے پورا نہیں ہوا؛ تو صاف کرنے کا کیا مطلب! اس لیے کہ پلیٹ صاف کرنے کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ پلیٹ کا کھانا اگر ہم پورا کر لیتے اور چند دانے بچ جاتے تو ان کو صاف کرنا مستحب ہے، باقی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پلیٹ کے اندر جتنا کھانا آیا ہے وہ سب پورا ہی کیا جائے۔ اس پر ایک دیہاتی کہنے لگا: اجی یہ مولوی تو باتیں بناوے ہے۔ خیر! تو اصل مسئلہ اپنی جگہ پر یہی ہے کہ جب پلیٹ کا بڑا حصہ کھا چکے ہیں تو اب اس کے اندر جو اجزاء رہ گئے ہیں ان کو صاف کر لیا جائے، اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ اسی میں برکت ہو۔

"وأخذ اللقمة الّتي تسقط منه وأكلها" اسی طریقہ سے وہ لقمہ جو کھانے کے درمیان ہاتھ سے گر جائے، تو اس کو اُٹھا لینا اور صاف کر کے کھا لینا بھی مستحب ہے۔

"وجواز مسحها بعد اللعق بالساعد والقدم" اور آدمی کھانے سے

فارغ ہوکر اپنی انگلیاں چاٹ چکا ہے، اور دھونے کے لیے پانی موجود نہیں ہے، یا ہاتھ بہت زیادہ ملوث نہیں ہوئے ہیں، جیسے: کبھی ہم کسی ہوٹل میں ناشتہ کرتے ہیں، چائے بسکٹ وغیرہ کھالیے؛ تو ہاتھ دھونے کی ضرورت نہیں ہوتی، تو ایک ہاتھ کو دوسرے میں مل کر صاف کر لیتے ہیں، یا پیر سے صاف کرلیں؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے

انگلیاں چاٹنا اور چٹوانا

۷۴۸:-عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ طَعَاماً، فَلاَ يَمْسَحْ أَصَابِعَهُ حَتَّى يَلْعَقَهَا أَوْ يُلْعِقَهَا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی کھانا کھا چکے، تو اپنی انگلیوں کو نہ پونچھے جب تک اس کو خود چاٹ نہ لے، یا کسی کو چٹوا نہ لے۔

افادات:- بچے؛ بڑوں کی انگلیاں چاٹنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں، جیسے: چھوٹے بچوں کو ماں اپنی انگلیاں چاٹنے کے لیے دیتی ہے، تو وہ بڑی خوشی سے چاٹتے ہیں، تو آپ خود اپنی انگلیاں چاٹ لیجئے، یا پھر کوئی ایسا ہو جو آپ کی انگلیاں چاٹنا اپنی سعادت سمجھتا ہو؛ اس سے چٹوا لیجئے۔ یا کوئی پالتو جانور بلی وغیرہ ہے، اور وہ آپ کے ساتھ رلی ملی ہوئی ہے، اگر اس کو دیں گے تو وہ صاف کرلے گی، تو اس سے صاف کروا لیجئے مطلب یہ ہے کہ انگلی کے اوپر کھانے کے جو اجزاء لگے ہوئے ہیں، ان کو آپ بے کار نہ جانے دیں، بلکہ ان کو خود کام میں لے لیں، یا کسی اور کے کام میں آجائیں۔

۷۴۹:-وعن کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: رأيتُ رسولَ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَأْكُلُ بثَلاَثِ أصابعَ، فإذا فَرَغَ لَعِقَهَا. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ تین انگلیوں سے کھا رہے تھے، اور جب آپ کھانے سے فارغ ہوئے تو آپ نے تین انگلیوں کو چاٹ لیا۔

افادات:- چاٹنے میں ترتیب یہ ہے کہ پہلے درمیان کی انگلی کو، پھر شہادت کی انگلی کو، اور پھر انگوٹھے کو چاٹیں گے۔

حصولِ مقاصد کا نام برکت ہے

۷۵۰:- وعن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم أمر بلعق الأصابع والصحفة، وقال: إِنَّكُمْ لَا تَدْرُونَ فِي أَيِّ طَعَامِكُمُ الْبَرَكَةُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انگلیوں کو بھی چاٹنے کا حکم دیا اور پلیٹ کو صاف کرنے کا بھی حکم دیا (یہ دونوں ادب پہلے بتا چکا ہوں۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی) اس لیے کہ تمہیں معلوم نہیں کہ برکت کھانے کے کون سے حصے میں ہے۔

افادات:- ہوسکتا ہے کہ کھانے کا وہ حصہ جو تمہاری انگلیوں کے اوپر لگا ہوا ہے اسی میں برکت ہو۔

برکت کیا چیز ہے؟ اور برکت کا مطلب کیا ہے؟ برکت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس مقصد کے لیے کھانا کھا رہا ہے وہ مقصد اس کو حاصل ہو۔ ہر چیز میں یہی قاعدہ ہے۔ جیسے: ایک آدمی کماتا ہے، محنت مزدوری کرتا ہے، اور پیسے اس لیے لاتا ہے تاکہ محنت مزدوری سے حاصل کی ہوئی کمائی سے اس کی ضرورتیں پوری ہوں۔ اگر اس کی ضرورتیں پوری نہیں ہو رہی ہیں تو وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ میری کمائی میں برکت نہیں ہے۔ بھائی! کیسے معلوم ہوا کہ برکت نہیں ہے؟ تو کہتا ہے کہ: میری ضرورتیں پوری

نہیں ہوتیں۔ تو جو کام جس مقصد کے لیے کیا جاتا ہے، اگر وہ مقصد اس سے پورا حاصل ہو جائے؛ اسی کا نام برکت ہے۔

جیسے: آپ ملازمت کرتے ہیں اور آپ کو تنخواہ پانچ ہزار روپے ملتی ہے، لیکن ان سے آپ کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، یہ پانچ تو ختم ہو جاتے ہیں اور آپ لوگوں سے مانگتے پھرتے ہیں، اور آپ کی ضرورتیں باقی رہتی ہیں، تو یوں سمجھا جائے گا کہ آپ کی کمائی میں برکت نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ پانچ سو تنخواہ لاتے ہیں لیکن اس سے آپ کی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں، تو اس صورت میں یوں کہا جائے گا کہ آپ کی کمائی میں برکت ہے۔ اس فرق کو اچھی طرح سمجھنا اور دل نشین کرنا چاہیے۔

تو کھانے کی برکت کا مطلب یہ ہے کہ کھانا جن مقاصد کے لیے کھایا جاتا ہے اس میں نمبر اول پر یہ ہے کہ آدمی اپنی بھوک مٹائے، اس کے بعد دوسرا مقصد یہ ہے کہ کھا کر لذت حاصل کرے اور راحت پائے، پھر یہ کھانا پیٹ میں جائے اور اس سے خون بنے، اور اس کو طاقت حاصل ہو، اور پیٹ میں جا کر وہ ہضم ہو۔ تو یہ ساری چیزیں کھانے کے مقاصد میں سے ہیں، لہٰذا اگر یہ ساری چیزیں حاصل ہوں تو کہا جائے گا کہ کھانے میں برکت ہے۔

لیکن کوئی آدمی کھا رہا ہے اور اس سے اس کو شکم سیری ہو ہی نہیں رہی ہے، پیٹ بھر ہی نہیں رہا ہے، تو یوں کہیں گے کہ اس کے کھانے میں برکت نہیں ہے۔ یا پیٹ تو بھر گیا لیکن بدہضمی ہو گئی، اس کھانے سے خون بننا چاہیے تھا لیکن نہیں بنا، تب بھی کہا جائے گا کہ برکت نہیں ہوئی۔ اس سے جو راحت پہنچنی چاہیے تھی وہ نہیں پہنچی، بلکہ کھانے کے بعد پیٹ میں درد ہو گیا، کوئی بیماری ہو گئی، تو یہ بے برکتی ہی ہے۔ یا اس سے جو طاقت حاصل ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی، ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تمہارے پیٹ میں

جو کھانا جاتا ہے وہ ویسے ہی نکل جاتا ہے، اس سے بدن کو جو فائدہ ملنا چاہیے وہ نہیں ملتا، تو یہ بے برکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ کھانا جن مقاصد کے لیے کھایا جاتا ہے، وہ مقاصد پورے طور پر حاصل ہوں؛ اسی کا نام برکت ہے۔

حصولِ اسباب اصل نہیں

آج کل ہم مادیت اور اسباب کے ایسے غلام بن گئے ہیں کہ ہماری نگاہوں میں مادّہ ہی مادّہ اور اسباب ہی سب کچھ ہیں، اسی کے اِردگرد ہماری سوچ گھومتی رہتی ہے، چیزوں کے جو حقائق ہیں اس کی طرف سے ہم غفلت برتتے ہیں، حالاں کہ اسباب مقصود نہیں ہیں، بلکہ اسباب جس چیز کے لیے مہیا کیے جاتے ہیں، وہ اصل مقصود ہے۔ اگر آپ نے اسباب مہیا کیے لیکن اصل مقصود حاصل نہیں ہوا، تو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جیسے: آپ نے مکان بنوالیا، اور اس میں کمرہ بھی بہترین اور شاندار بن گیا، اور اس کے اندر شاندار مسہری بھی آپ نے بچھوادی، اس کے اوپر اچھا سا گدّا لگوادیا، بہترین چادر اور تکیے بھی لگوادیئے، کمرے کا پورا فرنیچر بھی ایسا شاندار ہے جس کو دیکھ کر کمرہ میں جی لگتا ہے، A.C بھی لگالیا، یہ سب انتظامات کیے؛ لیکن رات کو سوتے ہیں تو نیند ہی نہیں آتی، اب نیند کا کیا کریں گے؟ حالاں کہ یہ سب اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ ہمیں راحت ملے اور نیند پوری حاصل کر کے ہم اپنے جسم میں نشاط کی کیفیت پاویں، اپنی اس ضرورت کو پورا کریں، اب یہ سارے اسباب تو مہیا کر لیے، لیکن نیند ہمارے اختیار میں نہیں ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اپنی یہ نعمت عطا فرمائے گا، ورنہ سارے اسباب کے ہوتے ہوئے بھی وہ چیز آپ کو حاصل نہیں ہوگی۔

آپ نے مال خوب کمالیا اور شاندار سے شاندار چیزیں خریدیں، اچھا باورچی

لائے، اچھا سے اچھا کھانا پکوایا، دسترخوان پر انواع واقسام کے کھانے لگوادیئے، یہ سب کر کے جب کھانے کے لیے بیٹھے تو بھوک ہی نہیں لگتی؛ اب بھوک کہاں سے لاؤ گے؟ بھوک تو اللہ تعالیٰ ہی ڈالتا ہے۔ یا بھوک تو لگی اور کھانا بھی کھایا، لیکن ہضم نہیں ہوتا اور اس سے خون نہیں بنتا۔

تو معلوم ہوا کہ ان چیزوں کے جو مقاصد ہیں وہ حاصل ہوں؛ اسی کا نام برکت ہے۔ اگر آدمی ملازمت یا تجارت وکاروبار کر کے خوب مال ودولت اور پیسے کمائے، تو یہ سب اسباب ہوئے، ان سب کے بعد جو اصل چیز ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے، ان سب کے بعد بھی اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو وہ چیز حاصل ہوگی؛ ورنہ نہیں ہوگی۔

یہ بے برکتی نہیں تو اور کیا ہے؟

تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ تمہیں معلوم نہیں کہ برکت کس میں ہے؟ تم چاہتے ہو کہ اس کھانے کے ذریعہ سے تمہارا مقصد حاصل ہو؟ اس کھانے سے تمہیں قوت ملے؟ خون بنے؟ اور اس سے تمہاری صحت مضبوط ہو؟ یہ سب چاہتے ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس ہدایت پر عمل کرو کہ اگر تمہاری انگلیوں پر کھانے کے ذرّات لگے ہوئے ہیں تو ان کو چاٹ لو، ضائع نہ جانے دو۔ پلیٹ کے اندر کھانے کے ذرّات بچے ہوئے ہیں، اس کو صاف کرلو؛ ہوسکتا ہے کہ برکت اسی میں ہو۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطائے برکت کا جو فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اس کھانے پر اس کے اثرات اور مقاصد کا مرتب ہونا؛ وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدردانی پر ہوتا ہے، جو آدمی ان ذرّات کو ضائع کرتا ہے، گویا وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری کرتا ہے،

اور جو ناقدری کرے گا تو قاعدہ ہے ﴿وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ. (إبراهيم:7)﴾ اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔ تو اس سے بڑا سخت عذاب اور کیا ہوگا کہ آدمی کھانا کھائے اور اس سے جو مقصد ہے وہ حاصل نہ ہو۔ یہ بے برکتی نہیں تو اور کیا ہے؟

اگر برکت حاصل کرنا چاہتے ہوتو......

اس لیے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ تمہیں معلوم نہیں کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے۔ اور یہ برکت حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ کو اپنانے ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگر فیشن کے پیچھے پڑا رہے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سب کچھ ہوگا لیکن برکت نہیں ہوگی۔ پھر وہ ڈاکٹروں کے چکروں میں پڑا رہتا ہے، اور کہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب! کھانا ہضم نہیں ہوتا، خون نہیں بنتا، جسم میں قوت وطاقت نہیں آتی۔ ارے بھائی! پہلے یہ سب کرلو، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو ہدایتیں دی ہیں، کھانے کی برکت جس چیز سے حاصل ہوتی ہے؛ وہ کرلو، تو پھر ان شاء اللہ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔

لقمہ گر جائے تو اُٹھالو

۷۵۱:-وعنه أنَّ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: إِذَا وَقَعَتْ لُقْمَةُ أَحَدِكُمْ، فَلْيَأْخُذْهَا فَلْيُمِطْ مَا كَانَ بِهَا مِنْ أَذىً، وَلْيَأْكُلْهَا، وَلَا يَدَعْهَا لِلشَّيْطَانِ، وَلَا يَمْسَحْ يَدَهُ بِالْمِنْدِيلِ حَتَّى يَلْعَقَ أَصَابِعَهُ، فَإِنَّهُ لَا يَدْرِي فِي أَيِّ طَعَامِهِ الْبَرَكَةُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لقمہ اگر گر جائے تو اس کو اُٹھالو، اور جو کچھ گرد وغبار لگا ہو اس کو صاف کرلو اور کھالو، شیطان کے لیے نہ

چھوڑ دو، اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد رومال سے ہاتھ نہ پونچھو یہاں تک کہ انگلیوں کو چاٹ لو، اس لیے کہ معلوم نہیں کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے۔

۷۵۲:-وعنه أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: إنَّ الشَّيْطَانَ يَحْضُرُ أَحَدَكُمْ عِنْدَ كُلِّ شَيْءٍ مِنْ شَأْنِهِ، حَتَّى يَحْضُرَهُ عِنْدَ طَعَامِهِ، فإِذَا سَقَطَتْ لُقْمَةُ أَحَدِكُمْ فَلْيَأْخُذْهَا فليُمِطْ مَا كَانَ بِهَا مِنْ أذىً، ثُمَّ لِيَأْكُلْهَا وَلاَ يَدَعْهَا للشَّيْطَانِ، فإذا فَرَغَ فَلْيَلْعَقْ أصابِعَهُ، فإِنَّهُ لا يَدْرِي فِي أيِّ طعامِهِ البَرَكَةُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: شیطان تمہاری ہر ہر چیز میں حصہ لگانے کے لیے تمہارے پاس آجاتا ہے، یہاں تک کہ کھاتے وقت بھی تمہارے پاس آتا ہے، لہٰذا جب کوئی لقمہ گر جائے تو اس پر سے مٹی وغیرہ کو صاف کر کے پھر اس کو کھالیا کرو، اس لقمہ کو شیطان کے لیے مت چھوڑو، اور جب کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو اپنی انگلیوں کو چاٹ لو، اس لیے کہ معلوم نہیں کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے۔

افادات:- جو لقمہ گرا ہے وہ اگر اتنا زیادہ خراب اور گرد وغبار میں ملوث ہو گیا ہو کہ صاف کر کے بھی کھانا ممکن نہیں ہے، تو اس کو چھوڑ دینے کی اجازت ہے، لیکن پھر بھی کوشش یہ ہو کہ وہ کسی جانور چیونٹی وغیرہ کو کھلا دیا جائے، اس کو ویسے ہی چھوڑ دینا کہ اس سے کسی کو بھی فائدہ نہ پہونچے، یہ گویا شیطان کے لیے چھوڑنا ہوا؛ اس لیے حضورِ اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

یا کوئی ایسی چیز گری ہے جس کو اُٹھا کر کھانا ممکن ہی نہیں، جیسے: شوربہ گر گیا تو اس کو کیسے اُٹھایا جا سکتا ہے، لہٰذا وہاں تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر صاف کر کے فائدہ اُٹھانا ممکن ہے، جیسے: روٹی کا ٹکڑا ہے کہ اس کو آسانی سے اُٹھا کر صاف کر سکتے ہیں؛ تو صاف کر کے کھالینا چاہیے۔ اگر اُٹھا کر نہیں کھائے گا تو یہ تکبر کی علامت اور اللہ تعالیٰ کی

نعمت کی ناقدری ہے، گویا اسے شیطان کے لیے چھوڑنا ہے؛ تو پھر برکت نہیں رہے گی۔

حصولِ برکت کے لیے ان چیزوں کا اہتمام کرو

۷۵۳:-عن أنسٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: کَانَ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم إِذَا أَكَلَ طَعَاماً، لَعِقَ أَصَابِعَهُ الثَّلاَثَ، وقال: إِذَا سقَطَتْ لُقْمَةُ أَحَدِكُمْ فَلْيَأْخُذْهَا، ولْيُمِطْ عنها الأذى، وَلْيَأْكُلْهَا، وَلاَ يَدَعْهَا لِلشَّيْطَان. وأَمَرَنا أن نَسْلُتَ القَصْعَةَ، وقال: إِنَّكُمْ لاتَدْرُونَ فی أَيِّ طَعَامِكُمُ البَرَكَةُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کھانا تناول فرمالیتے تھے تو (کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ دھونے سے پہلے یارومال وغیرہ سے پونچھنے سے پہلے) اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیا کرتے تھے (تاکہ کھانے کے بچے ہوئے اجزاء ہاتھ پر لگے نہ رہ جائیں، اور دھونے کی وجہ سے ضائع نہ چلے جائیں، اس کی وجہ وہی ہے کہ کھانے کے کون سے حصہ میں برکت ہے یہ ہمیں معلوم نہیں، لہٰذا آدمی کو اس بات کا حریص ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے دانہ دانہ پر جو برکتیں رکھی ہیں ان کو حاصل کرے) اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: کھانے کے دوران اگر لقمہ گر جائے، تو اس کو اُٹھالو، اور اس پر جو بھی گرد وغیرہ لگی ہے اس کو دور کرلو، اور اس کو کھالو، اس کو شیطان کے لیے نہ چھوڑدو (اگر اس کو ویسے ہی چھوڑدیں گے تو وہ ضائع ہوجائے گا، گویا شیطان اس سے فائدہ اُٹھالے گا) اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں یہ بھی حکم دیا کہ پیالے کو صاف کرلو (پھر آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی وجہ بھی بتلائی کہ اوپر جتنے بھی احکام وآداب بتائے گئے وہ اس لیے ہیں کہ) کھانے کے کون سے حصے میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے یہ ہمیں معلوم نہیں ہے (تو اس برکت کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں ان

چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے)۔

”وُضوءِ مِمَّا مَسَّتِ النَّار“ کا مسئلہ

۷۵۴:- وعن سعید بنِ الحارث: أنّہ سأل جابراً رضی اللہ تعالیٰ عنہ عنِ الوُضُوءِ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ، فَقَالَ: لا. قَدْ کُنَّا زَمَنَ النبیّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لانَجِدُ مِثْلَ ذٰلِکَ الطَّعامِ إلاَّ قلیلاً، فإذا نَحْنُ وجَدْنَاہُ لَمْ یَکُنْ لنا مَنَادِیلُ إلاَّ أکُفَّنا، وسَواعِدَنَا، وأقْدامَنَا، ثُمَّ نُصَلِّی وَلاَ نَتَوَضَّأُ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت سعید بن حارث نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو چیز آگ پر پکائی گئی ہواس کو کھانے کے بعد وضو کرنے کے متعلق پوچھا۔ تو انہوں نے کہا: اب ایسا نہیں ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ایسا کھانا ہمیں بہت کم میسر ہوتا تھا (مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں عام طور پر کھجوروں پر گزارہ ہوتا تھا، یا دودھ پی لیا اور کھجور استعمال کرلی۔ پکا ہوا کھانا، گوشت یا روٹی وغیرہ چیزیں بہت کم میسر ہوتی تھی) اور جب کبھی ہمیں یہ ملتا تھا تو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ پر اس کھانے کا جو اثر لگا ہوتا تھا اس کو صاف کرنے کے لیے بھی ہمارے پاس رومال نہیں ہوتے تھے، بس یہی ہماری ہتھیلیاں اور بازو اور پیر ہوتے تھے، اسی پر ہم اپنے ہاتھ کی چکنائی کو صاف کرلیتے تھے (پہلے بتا چکا ہوں کہ کوئی ایسی چیز کھائی ہے کہ جس کی وجہ سے ہاتھ زیادہ ملوث نہیں ہوئے ہیں تو اس صورت میں کوئی آدمی ہاتھ نہ دھوئے، اور رومال سے، یا ہتھیلی پر، یا بازوؤں پر، یا پاؤں کے تلوؤں پر مَل لے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے) اور اسی حالت میں ہم نماز پڑھ لیتے تھے، نیا وضو نہیں کرتے تھے۔

افادات:- شروع اسلام میں یہ حکم تھا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کو اگر آدمی کھائے تو اس کے بعد اس کو وضو کرنا پڑتا تھا، گویا اس سے اس کا وضو ٹوٹ جایا کرتا تھا،

اس لیے شریعت کا یہ حکم تھا کہ آدمی دوبارہ وضو کرے، پھر نماز پڑھے، لیکن بعد میں یہ حکم باقی نہیں رہا۔ اب اگر آگ پر پکی ہوئی چیز کوئی آدمی استعمال کرتا ہے تو اس کے بعد پانی وغیرہ سے اپنا منھ صاف کرلے، تاکہ کھانا کھانے کی وجہ سے منھ میں کھانے کی چکنائی اور جو اثرات ہیں وہ دور ہو جائیں، اور نماز کے دوران اس کھانے کا مزہ اور اثر باقی نہ رہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

تكثير الأيدى عَلَى الطعام

کھانے میں جتنے کھانے والے زیادہ ہوں گے اتنی ہی اس کھانے مسیں برکت زیادہ ڈالی جائے گی۔

دو کا کھانا تین کو، تین کا چار، چار کا آٹھ کو کافی ہو جائے گا

۷۵۵:-عن أَبي هــريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَــالَ قَــالَ رسـولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: طَعَـامُ الاثنينِ كافِي الثلاثةِ، وطَعَامُ الثَّلاَثَةِ كافى الأربعة. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دو آدمیوں کا کھانا تین کو کافی ہوجاتا ہے، اور تین کا چار کو کافی ہوجاتا ہے۔

۷۵۶:-وعن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يقول: طَعَامُ الوَاحِدِ يَكْفِي الاثْنَيْنِ، وَطَعَامُ الاثْنَيْنِ يَكْفِي الأَرْبَعَةَ، وَطَعَامُ الأَرْبَعَةِ يَكْفِي الثَّمَانِيَةَ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ایک کا کھانا دو کے لیے کافی ہے، اور دو کا چار کے لیے کافی ہے اور چار کا آٹھ کے لیے کافی ہے۔

افادات:- ایک خاص مقصد کو اس طرح تعبیر کیا گیا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ مثلاً: ہم نے اپنے حساب سے کھانا تیار کیا، کھانے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں کہ دو چار مہمان آ گئے، تو ایسے موقع پر صاحبِ خانہ اور مالکِ مکان یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ مہمان آ گئے،

اب کیا ہوگا؟ اس کی وجہ سے اس کی طبیعت کے اندر آنے والوں کی طرف سے جھجک سی پیدا ہوتی ہے، اور وہ یوں سوچنے لگتا ہے کہ ان کو کھانے میں شریک کیا جائے یا نہیں۔

اب یہ جو سوچ آرہی ہے کہ کھانا تو کم لوگوں کے حساب کا بنایا ہے، یہ آدمی بڑھ گئے، تو اب کیا ہوگا؟ تو نبیٔ کریم ﷺ ہمیں بتلاتے ہیں کہ بھائی! آپ کیوں فکر کرتے ہو، تین کا کھانا چار کے لیے کافی ہو جائے گا، یعنی جتنا کھانا دو آدمی کے لیے پکایا تھا اور دونوں آدمی پیٹ بھر کر ڈکار لے کر کھا سکتے تھے، اسی کھانے میں تین آدمی اپنی ضرورت پوری کرلیں گے، بھلے ہی وہ دو آدمی ڈکاریں نہیں لے سکیں گے، لیکن تینوں کی بھوک تو اس سے مٹ جائے گی، اور کھانے کا تقاضہ باقی نہیں رہے گا، اور اصل تو یہی ہے۔

دوسری روایت میں اور زیادہ وسعت کردی گئی۔ کافی ہونے کا مطلب وہی ہے کہ جس کھانے کو ایک آدمی پیٹ بھر کر اور شکم سیر ہو کر کھاتا ہے، اگر دو آدمی کھائیں گے تو دونوں کی ضرورت اس سے پوری ہو جائے گی۔ اسی طرح دو کا چار کے لیے اور چار کا آٹھ کے لیے کافی ہے۔

ہم کسے مہمان سمجھتے ہیں؟

مہمان کے لیے بھی ہم نے اپنے ذہنوں میں ایک معیار بنایا ہے کہ کوئی رشتہ دار ہو، یا کوئی ملنے والا ہو، کوئی دوست ہو، یا ہماری سطح کا ہو، ہمارے اسٹیٹس کا آدمی ہو؛ تو اس کو تو ہم مہمان سمجھتے ہیں۔ اور اگر کوئی اجنبی ہے جس کے ساتھ کوئی جان پہچان نہیں ہے، رشتہ داری اور دوستی نہیں ہے، یا وہ ہماری سطح کا نہیں ہے، ذرا غریب آدمی ہے؛ تو اس کو ہم مہمان نہیں سمجھتے۔ حالاں کہ شریعت کی نگاہوں میں مہمان عام ہے، جو آدمی بھی آپ کے گھر آیا ہو، چاہے وہ غریب ہو، وہ آپ کا مہمان ہے اور

قابلِ اکرام ہے، اس کی عزت کرنا ضروری ہے۔ اب آنے والے کے کپڑے پھٹے پرانے ہیں تو کیا ہوا، وہ بھیک مانگنے تو نہیں آیا ہے۔ ہمارا مزاج ایسا بن چکا ہے کہ اگر ایسی ہیئت کا کوئی آدمی آ گیا تو اس کو بھکاری ہی سمجھتے ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ وہ مہمان ہے، اس کی عزت کرو، کھانے کا وقت ہے تو اس کو بھی کھانے میں شریک کرلو۔ خیر! اچانک آنے والے کی وجہ سے آدمی کے دل میں کوئی کدورت اور ناراضگی نہیں ہونی چاہیے، اور کسی کو جھڑکنا تو بالکل ہی نہیں چاہیے۔

نہایت عبرت آموز واقعہ

کتابوں میں ایک قصہ لکھا ہے جو کسی زمانہ میں پیش آیا تھا ''المستطرف فی کل فن مستظرف'' میں موجود ہے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ میں بھی ہے کہ ایک آدمی ایک مرتبہ اپنی بیوی کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا، مرغی پکی ہوئی تھی، کوئی اجنبی آ گیا اور اس نے کہا: مَیں بھوکا ہوں، مجھے کچھ کھانا کھلاؤ۔ تو بجائے اس کے کہ اس کا اکرام کیا جاتا، اس کو کھانے میں بھی شریک کرلیا جاتا؛ وہ آدمی غصہ ہو گیا اور اس کو جھڑک کر وہاں سے بھگا دیا۔ اب جس نے یہ کیا تھا وہ صاحبِ حیثیت اور مالدار آدمی تھا، اتفاق کی بات کہ اس کے برے دن آئے، مال بھی ہاتھ سے نکل گیا، اور اتنی بھی حیثیت نہیں رہی کہ بیوی کا نفقہ ادا کر سکے اور اس کی ضرورتیں پوری کر سکے، مجبور ہو کر کہ بیوی کو طلاق دینی پڑی۔ اس کے بعد اس عورت نے ایک اور آدمی سے نکاح کرلیا جو مالدار اور صاحبِ حیثیت تھا، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ عورت اپنے اس دوسرے شوہر کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہی تھی، مرغی پکائی گئی تھی، باہر کوئی مانگنے والا آیا تو اس نے بیوی سے یوں کہا: یہ پورا تھال اُٹھا کر اس مانگنے والے کو دے دو۔ یہ عورت مانگنے والے کو دینے کے

لیے باہر گئی اور دے کر جب واپس آئی تو رو رہی تھی، شوہر نے پوچھا: کیوں رو رہی ہو؟ اس نے بتلایا کہ یہ مانگنے والا میرا سابق شوہر تھا اور جس زمانہ میں مَیں اس کے نکاح میں تھی تو ایک مرتبہ ایسا قصہ پیش آیا تھا کہ ہم دونوں میاں بیوی کھانا کھا رہے تھے، اسی دوران ایک آدمی آیا، اس نے اپنی ضرورت ظاہر کی کہ مَیں بھوکا ہوں، لیکن اس نے اس سائل کو دھکا کر اور جھڑک کر وہاں سے نکال دیا تھا، پھر اس کے حالات برے ہو گئے، تو وہ مجھے طلاق دینے پر مجبور ہو گیا، پھر میرا تمہارے ساتھ نکاح ہو گیا، اور آج وہ اس حالت میں آیا، اس کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ تو اس شوہر نے کہا: وہ آدمی جس کو جھڑک دیا تھا؛ میں ہی تھا۔

یہ بات تو دل میں بٹھا ہی لو

بہر حال! میں پہلے بھی بار بار یہ عرض کر چکا ہوں کہ جس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر نہیں ہے، اس لئے کوئی آدمی یہ نہ سوچے کہ میرے پاس علم ہے، دولت ہے، صلاح وتقویٰ، نیکی اور دینداری ہے، جس کو جو بھی نعمت اللہ تعالیٰ نے دی ہے، وہ سب محض اس کا فضل ہے، ہماری کسی صلاحیت اور قابلیت کو اس میں بالکل دخل نہیں ہے۔ یہ چیز ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے۔ یہ بات تو دل میں بٹھا ہی لو کہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ میری صلاحیت اور قابلیت کی بنیاد پر نہیں ہے، سب کچھ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، وہ جب چاہے لے لے، اس سے کوئی بعید نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر یہی ہے کہ ہمیں جو تعلیمات دی گئی ہیں ان کا اہتمام کیا جائے۔

حدیث میں آتا ہے: ”لَا تُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ لِأَخِيكَ فَيُعَافِيَهُ اللهُ وَيَبْتَلِيَكَ“ (المعجم الکبیر للطبرانی:۱۷۵۹۳) اپنی کسی بھائی کی کسی بھی مصیبت کے اوپر خوشی کا اظہار مت کرو، کہیں

ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو تو اس مصیبت سے نجات دیدے اور تم کو اس میں مبتلا کر دے۔

خلاصۂ کلام

تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ تعلیم ہے کہ دو کا کھانا تین کے لیے کافی ہو جائے گا، یا تین کا کھانا چار کے لیے کافی ہو جائے گا؛ وہ دراصل ایسے مواقع کے لیے ہی ہے۔ ایسے مواقع پر عام طور پر لوگ اگر نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس تعلیم کو مدنظر رکھیں تو کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی، دل بڑا کرتے ہوئے کہے: بھائی سب آجاؤ، اللہ تعالیٰ اس کھانے میں برکت دیدیں گے۔ آدمی دل میں جھجھک محسوس نہ کرے کہ کیا ہوگا۔ اگر کھانا ختم ہو جائے تو کہہ دو کہ بھائی! جو کھانا تھا وہ پیش کر دیا گیا، اب کھانا ختم ہو گیا ہے۔ اس میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

باب أدب الشرب

پینے کے آداب

واستحباب التنفس ثلاثاً خارج الإناء وكراهة التَّنَفُّس فی الإناء واستحباب إدارة الإناء عَلَى الأيمن فالأيمن بعد المبتدء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پینے کے آداب

اس عنوان میں کئی چیزیں بتاتے ہیں:-

ایک تو یہ ہے کہ پینے کی کوئی بھی چیز ہو، پانی، دودھ یا اور کوئی مشروب ہو؛ اس کو ایک سانس میں نہ پیے، بلکہ تین سانس سے پیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب سانس لینے کا وقت آئے تو برتن کے اندر سانس نہ لے، بلکہ برتن سے منھ ہٹا کر سانس لے۔ برتن کے اندر سانس لینا مکروہ ہے۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ پینے کی چیز پی کر بچا ہوا کسی دوسرے کو دینا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ دائیں طرف سے ابتداء کی جائے۔

۷۵۷:-عن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم كَانَ يَتَنَفَّسُ فی الشَّرابِ ثَلاثاً. (متفق عَلَيْهِ) يعنی: يتنفس خارجَ الإناءِ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پینے کے دوران (برتن کو منھ سے ہٹا کر) تین مرتبہ سانس لیتے تھے۔

۷۵۸:-وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لاَتَشْرَبُوا وَاحِداً كَشُرْبِ البَعِيرِ، وَلَكِنِ اشْرَبُوا مَثْنَى وَثُلاَثَ، وَسَمُّوا إِذَا أَنْتُمْ شَرِبْتُمْ، وَاحْمَدُوا إِذَا أَنْتُمْ رَفَعْتُمْ. (رواہ الترمذی)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک سانس میں اونٹ کی طرح نہ پیو (اونٹ کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ پانی پینے کے لیے منھ ڈالتا ہے تو پورا پینے کے بعد ہی منھ اونچا کرتا ہے) بلکہ پینے کے دوران دو

یا تین مرتبہ سانس لو۔اور جب پینا شروع کروتو بسم اللہ پڑھو،اور جب پانی پی چکو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو،حمد بیان کرو (الحمدللہ کہو)

افادات:- اگر پی جانے والی چیز کی مقدار قلیل ہے، مثلاً ایک ہی گھونٹ ہے، تو اس صورت میں ایک سانس میں پینے میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، لیکن پھر بھی کوئی آدمی سنت پر عمل کی حرص میں اس کو بھی تقسیم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس جذبہ پر اس کو ثواب عطا فرمائیں گے۔اور نبیٔ کریم ﷺ نے ایک سانس میں پینے کی جو ممانعت فرمائی ہے وہ حرمت کے لیے نہیں ہے، بلکہ آداب کے قبیل سے ہے، اگر کوئی آدمی ایک ہی مرتبہ میں پی لیتا ہے، تو فقہاء نے لکھا ہے کہ وہ بھی جائز ہے لیکن خلافِ اولیٰ ہے، اور پینے کے دوران برتن کو منھ سے ہٹا کر دو یا تین سانس لینا مستحب اور آداب میں سے ہے

نہیٔ ارشاد اور نہیٔ تحریم

دیکھو! نبیٔ کریم ﷺ کی شانیں مختلف ہیں، کبھی تو آپ ﷺ اپنے رسول ہونے کی حیثیت سے کسی چیز سے منع فرماتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب اس چیز کا کرنا حرام اور ممنوع ہے، اگر کوئی آدمی اس کو کرے گا تو گنہگار ہوگا۔اور نبیٔ کریم ﷺ کی ایک حیثیت شفیق باپ اور مہربان مربی کی ہے، اس لیے کبھی آپ ﷺ کسی چیز سے اسی حیثیت سے منع فرماتے ہیں اور اس ممانعت کا تعلق حلت وحرمت سے نہیں ہوتا؛ اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں نہیٔ ارشاد کہتے ہیں، کتابوں میں یہ جملہ آتا ہے کہ آپ ﷺ کی اس ممانعت کا تعلق از قبیلِ نہیٔ ارشاد ہے، یعنی نبیٔ کریم ﷺ نے اپنی امت کو اچھے آداب سکھانے کی غرض سے کسی کام کو کرنے سے منع فرمایا۔تو ایک سانس میں پینے سے جو ممانعت فرمائی ہے وہ بھی از قبیلِ نہیٔ تحریم نہیں، بلکہ از قبیلِ نہیٔ ارشاد ہے، یعنی ایک

فائدہ کی چیز ہے جس کی نبیٔ کریم ﷺ اپنی امت کو تاکید فرمارہے ہیں، جیسے ایک شفیق باپ اور مہربان مربی اپنے ماتحتوں کی تربیت کرتے ہوئے ایسی چیزوں کی بھی تلقین کرتا ہے جوان کے لیے مفید اور کارآمد ہوتی ہیں، یعنی وہ کام کوئی واجب اور ضروری نہیں ہوتے، پھر بھی وہ کہتا ہے کہ ایسا کرو اور ایسا مت کرو۔ تو یہ ''ایسا مت کرو'' جو کہا گیا وہ اس لیے نہیں کہ وہ کام حرام اور گناہ ہے، بلکہ اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ اچھا نہیں ہے، نامناسب ہے، خلافِ اولیٰ ہے، بہتر نہیں ہے۔ اسی لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ ایک سانس میں پینا جائز تو ہے، لیکن بہتر نہیں ہے۔

میٹھے پانی کا عجیب وغریب قدرتی نظام

اور پینا شروع کرو تو بسم اللہ پڑھو یعنی اللہ کا نام لو، جس طرح کھانا شروع کرو تب بھی اللہ کا نام لینے کا حکم فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرتے وقت جو اللہ کا نام لینے کا کہا گیا ہے وہ دراصل اس بات کو یاد دلایا جارہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت ہے، لہٰذا جس ذات نے یہ نعمت ہمیں دی ہے اس کا نام لو اور اس کی قدر کرتے ہوئے اس کو استعمال کرو۔

اور ہمیں سوچنا چاہیے کہ یہ پانی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے! اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لیے پانی کا ذخیرہ سمندروں کے اندر رکھا ہے، لیکن وہ پانی تو کڑوا اور کھارا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے نمکیات رکھے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ میٹھا ہوتا تو وہ خراب ہوجاتا اور بگڑ جاتا، اس لیے کہ اس میں جانور مرتے رہتے ہیں اور میٹھے پانی میں جانور مریں تو وہ پانی بہت جلدی سڑ جاتا اور اس میں بدبو پیدا ہوجاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسے نمکیات رکھے کہ ساری دنیا کی گندگیاں وہاں جاتی ہیں اور مختلف قسم کے

جانور اس میں مرجاتے ہیں، اس کے باوجود وہ پانی انہیں نمکیات کی وجہ سے خراب نہیں ہوتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں فرمایا کہ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سمندروں سے پانی لے آؤ، اس لیے کہ سمندر کا پانی تو کڑوا ہے، اس سے براہِ راست اس کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی۔ تو پانی کا ذخیرہ تو سمندر میں کیا، پھر اللہ کی مخلوق جہاں جہاں بسی ہے وہاں اس کے پہنچانے کا یہ انتظام کیا کہ سمندر کے اندر مانسون کے ذریعہ بادل تیار ہوتے ہیں، بادل سمندر کے اندر ہی سے اُٹھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ایسا قدرتی نظام بنادیا اور ایسی مشین بنادی ہے کہ مانسون کے ذریعہ بادل میں جب پانی بھرتا ہے تو ساری نمکیات سمندر ہی میں رہ جاتے ہیں اور خالص میٹھا پانی اس میں جمع ہوتا ہے، اور پھر وہ بادل اللہ تعالیٰ دنیا کی مختلف جگہوں پر - جہاں اللہ کی مخلوق بسی ہوئی ہے - پہونچاتے ہیں اور وہ وہاں پانی برساتے ہیں، اب بارش کا تو مخصوص زمانہ اور موسم ہوتا ہے، اگر یہ حکم ہوتا کہ سال بھر کی اپنی ضرورت کا پانی اسی موسم میں بھرلو، تو اتنی بڑی ٹنکی کہاں سے لاتے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے بھی نظام بنایا کہ پہاڑوں پر جہاں بارش برستی ہے وہاں اس پانی کو برف کی شکل میں جمادیا، گویا وہ فریج میں محفوظ ہے، جب گرمیوں کا زمانہ آتا ہے تو وہ پگھلتا ہے اور ندیوں، دریاؤں کے ذریعہ بستیوں میں پہنچتا ہے۔ اور دوسری شکل یہ بھی بنائی کہ بارش کا برسا ہوا پانی زمین کے اندر جذب کرادیا، زمین کے اندر پانی کے ذخیرے موجود ہیں، گویا زمین کے اندر نالیاں سی بنادیں اور ٹیوب لگادیئے ہیں، جب ہم زمین کو کھودیں گے تو اندر سے ہمیں پانی ملے گا۔ اس لیے آدمی سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو میٹھا پانی پہنچانے کے لیے کیسا عجیب و غریب نظام بنایا ہے؟ اس لیے کہا گیا کہ سوچو کہ یہ نعمت کس کی دی ہوئی ہے، پھر اسی کا نام لے کر اس کو استعمال کرو، اور اس کا شکر ادا کرو۔

شکر گزار بندہ کی دعائیں

جب پانی پی کر فارغ ہو تو الحمد للہ کہو۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَرْوَانَا" تمام تعریف اس ذات کے لیے ہے جس نے ہمیں سیراب کیا۔ حضرت نوح علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے متعلق قرآنِ پاک میں ہے: "إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا" وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے تھے۔ ان کے متعلق لکھا ہے کہ جب بھی وہ کوئی نعمت استعمال کرتے تھے تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے۔ جیسے: کھانا کھاتے تو کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَطْعَمَنِیْ، وَلَوْ شَاءَ أَجَاعَنِیْ" اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھے کھلایا، اگر وہ چاہتا تو بھوکا رکھتا۔ جب پانی پیتے تو کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ سَقَانِیْ، وَلَوْ شَاءَ أَظْمَأَنِیْ" اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے پانی پلایا، اگر وہ چاہتا تو پیاسا رکھتا۔ جب لباس پہنتے تو کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ كَسَانِیْ، وَلَوْ شَاءَ أَعْرَانِیْ" اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے لباس پہنایا، اگر وہ چاہتا تو بغیر لباس کے ننگا رکھتا۔ جوتا پہنتے تو کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ حَذَّانِیْ، وَلَوْ شَاءَ أَحْفَانِیْ" اللہ کا شکر ہے کہ جس نے مجھے جوتا پہنایا، اگر وہ چاہتا تو ننگے پیر رکھتا۔ اور قضائے حاجت کے بعد کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَخْرَجَ عَنِّیْ أَذَاهُ، وَلَوْ شَاءَ حَبَسَهُ" اللہ کا شکر ہے جس نے تکلیف دہ چیز کو مجھ سے نکال دیا، اگر وہ چاہتا تو اس کو اندر ہی روک دیتا (جامع البیان فی تفسیر القرآن للطبری: سورۂ بنی اسرائیل) تو واقعہ یہ ہے کہ آدمی سوچے کہ اس میں میری کون سی محنت اور صلاحیت کو دخل ہے، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے یہ سب نعمتیں دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی نعمت کو آدمی جب استعمال کرے تو اس موقع پر جو جو دعائیں بتلائی گئی ہیں ان کا اہتمام کرے، اور وہ دعائیں اسی لیے بتلائی ہیں کہ شروع میں اللہ کا نام لیا جائے گا تو اس نعمت کے دینے والے کی طرف دھیان جائے گا، پھر استعمال کرنے

کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرے تا کہ اس نعمت کا حق ادا ہو، اس کی ناقدری نہ ہو۔

برتن میں سانس نہ لے

۷۵۹:-وعن أبي قتادة رضی اللہ تعالیٰ عنہ: أَنَّ النبيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نَهَى أَنْ يُتَنَفَّسَ في الإناءِ. (متفق عَلَيْهِ)

يعني: يتنفس في نفس الإناءِ.

ترجمہ:- حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برتن کے اندر سانس لینے سے منع فرمایا۔

افادات:- بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ پانی پینے کے دوران گلاس منھ سے ہٹاتے ہی نہیں، اسی میں سانس لیتے ہیں؛ حالاں کہ اس سے منع کیا گیا ہے۔ برتن سے منھ ہٹا کر سانس لینا چاہیے، اس لیے کہ پانی بہت نازک اور صاف شفاف چیز ہے، آدمی جب اندر سانس لے گا تو سانس کے اثرات اندر آجائیں گے۔ بیڑی سیگریٹ پینے والا اگر اندر ہی سانس لے گا تو اس کی بدبو کا اثر اندر آجائے گا، پھر اس بچے ہوئے پانی کو اگر کوئی دوسرا استعمال کرنا چاہے گا تو فوراً اس کی طبیعت گھن کرے گی، اس لیے اندر سانس لینے سے منع کیا گیا ہے کہ پانی کے اندر سانس لے کر اس کو آلودہ مت کیجیے، برتن کو منھ سے ہٹا کر سانس لیجیے۔

اَلْأَيْمَنَ فَالْأَيْمَنَ

۷۶۰:-وعن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ رسولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم أُتِيَ بِلَبَنٍ قَدْ شِيبَ بماءٍ، وَعَنْ يَمِينِهِ أَعْرَابِيٌّ، وَعَنْ يَسَارِهِ أَبُو بَكْرٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فَشَرِبَ، ثُمَّ أَعْطَى الأعرابِيَّ، وقال: ((الأَيْمَنَ فالأَيْمَنَ)) (متفق عَلَيْهِ) قَوْله: ((شِيب)) أي: خُلِطَ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس دودھ لایا گیا جس میں پانی کی ملاوٹ تھی، آپ کے دائیں طرف ایک دیہاتی بیٹھا ہوا تھا اور بائیں طرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دودھ پی کر فارغ ہوئے تو آپ نے بچا ہوا اس دیہاتی کو عطا فرمایا اور ارشاد فرمایا: "اَلْأَیْمَنَ فَالْأَیْمَنَ"

۷۶۱:- وعن سهلِ بن سعدٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ رسولَ اللّٰه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم أُتِيَ بِشَرَابٍ، فَشَرِبَ مِنْهُ وَعَنْ يَمِينِهِ غُلَامٌ، وَعَنْ يَسَارِهِ أَشْيَاخٌ، فَقَالَ لِلْغُلَامِ: أَتَأْذَنُ لِي أَنْ أُعْطِيَ هٰؤُلَاءِ؟ فَقَالَ الْغُلَامُ: لَا وَاللّٰهِ، لَا أُوثِرُ بِنَصِيبِي مِنْكَ أَحَداً. فَتَلَّهُ رسولُ اللّٰه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فِي يَدِهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

قَوْله: ((تَلَّهُ)) أيْ وَضَعَهُ. وهذا الغلامُ هُوَ ابْنُ عباس رضی اللہ عنہما.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پینے کی کوئی چیز لائی گئی، جب آپ پی چکے تو آپ کی دائیں طرف ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا اور بائیں طرف بڑی عمر کے بزرگ لوگ تھے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بچہ سے کہا: کیا تم اس بات کی اجازت دیتے ہو کہ میں اپنا بچا ہوا ان بڑے لوگوں کو دوں؟ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ آپ کا بچا ہوا ہے جس میں میرا حصہ ہے، اور میں وہ کسی دوسرے کو دینا نہیں چاہتا، چناں چہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ہاتھ میں زور سے تھما دیا۔

افادات:- عرب میں یہ رواج تھا کہ جب دودھ دوہتے تھے تو اس میں تھوڑا سا پانی میں بھی ملا دیتے تھے، اس کی وجہ سے دودھ میں ٹھنڈک بھی آجاتی تھی اور پینے کے لیے مرغوب بھی ہوجاتا تھا۔ لیکن یہ بات بھی یاد رہے کہ پینے کے لیے تو دودھ پانی کی ملاوٹ کی اجازت ہے، بیچنے کے لیے پانی کی ملاوٹ کی اجازت نہیں ہے، اگر اس میں پانی ملایا گیا ہے تو گاہک سے کہہ دیا جائے کہ اندر پانی ملایا گیا ہے۔

اس باب میں ایک ادب یہ بھی بتلایا ہے کہ کسی نے کوئی چیز پی، اور وہی برتن کسی دوسرے کو پینے کے لیے دینا چاہتا ہے تو دائیں طرف والے کو دے۔ اس روایت میں دیکھو کہ دائیں طرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیٹھے ہوئے تھے جن کا مقام و مرتبہ حضرات انبیاء کے بعد انسانوں میں سب سے افضل ہیں، اس کے باوجود چوں کہ وہ بائیں طرف تھے، اور آداب میں سے یہ ہے کہ جو دائیں طرف ہو اس کو دیا جائے، تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ادب کی رعایت فرمائی۔

دوسری روایت میں جو آیا تو وہ بچے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تھے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر دس سال تھی، تو ظاہر ہے اس وقت چھوٹے لڑکے تھے۔ چوں کہ ''الایمن فالایمن'' والا اصول بتلایا گیا ہے۔ حالاں کہ پینے کی جو چیز لائی گئی تھی اس کے مالک خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے، آپ اپنی مرضی سے جس کو چاہتے دے سکتے تھے، لیکن اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ دینے کی شروعات داہنی طرف سے کرو، اس لیے خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس کا اہتمام فرمایا کہ بائیں طرف بڑے لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور دائیں طرف ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا، اور اصول کا تقاضہ یہ ہے کہ اس لڑکے ہی کو دیا جائے، ادھر بڑے لوگ تھے جس کی وجہ سے خیال یہ ہوا کہ ان کا اکرام کیا جائے۔ جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے اجازت مانگی تو ان کو چاہیے تھا کہ اجازت دیدیتے، لیکن چوں کہ وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچے ہوئے کے حریص تھے تو انہوں نے سوچا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی مرضی و اختیار سے دینا چاہتے تو دے سکتے تھے، لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اجازت ہی مانگ رہے ہیں تو میں ہی فائدہ کیوں نہ اُٹھاؤں؛ اس لیے انہوں نے کہا: میں تو اپنا حصہ کسی کو نہیں دوں گا۔

ایک مسئلہ

اور یہ ادب اس وقت ہے جبکہ وہ چیز ہمیں پینے کے لیے مالک بنا کر دی گئی ہو، لیکن اگر پینے کی جو چیز ہمیں دی وہ کسی اور کی ہے، تو پھر اس صورت میں پی کر بچا ہوا اسی کو دے دیا جائے جو لایا ہے، پھر وہ جس کو چاہے دے، اگر چہ اس کو چاہیے کہ دائیں طرف والے کو دے، لیکن ہم تو پی کر اسی کو دیں۔

ان دونوں روایتوں میں یہی ادب سکھایا گیا ہے کہ کسی نے کوئی چیز پی، اور بچا ہوا آگے دینا چاہتا ہے؛ تو اس کا دَور داہنی طرف سے چلانا چاہیے۔

كراهة الشرب من فم القربة ونحوها وبيان أنه كراهة تنزيه لا تحريم

مشکیزہ اور بڑے برتن سے منھ لگا کر پینے کی ممانعت اور اس کی وجہ

مشکیزہ یا اس جیسی کوئی بڑی چیز، یا کوئی بڑا برتن جس میں پانی رکھا ہوا ہو، جیسے: آج کل پلاسٹک کے گوٹ، یا کیربے ہوتے ہیں، تو اس سے براہِ راست منھ لگا کر پینا کیسا ہے؟ باب کا عنوان لا کر بتلانا چاہتے ہیں کہ ایسے بڑے برتن سے منھ لگا کر پینا منع ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو پسند نہیں کیا ہے۔ ورنہ جو چھوٹے برتن ہوتے ہیں، جیسے: گلاس، پیالہ وغیرہ؛ وہ تو پینے کے واسطے ہی ہوتے ہیں، اس کی ممانعت نہیں ہے۔ اور یہ ممانعت بھی آداب کے قبیل سے ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بڑے برتن میں جو پانی ہے اس میں کوئی مضر چیز ہے، جیسے پانی خراب ہو گیا ہے، یا اندر کوئی سپولیا ہے، یا کوئی چھوٹا سا جانور گھس گیا ہے، اب اگر آپ منھ لگا کر پئیں گے تو ہو سکتا ہے کہ وہ پیٹ کے اندر آجائے اور نقصان ہو جائے جیسا کہ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے مشکیزہ سے براہِ راست پیا، تو اندر ایک چھوٹا سا سپولیا تھا وہ ان کے پیٹ میں چلا گیا۔ تو اگر اس برتن میں سے کسی چھوٹے برتن گلاس وغیرہ میں نکالیں گے تو ہمیں نظر آجائے گا کہ اندر کیا ہے، اس لیے یہ ادب بتلایا ہے۔ اور یہ ممانعت بھی از قبیلِ تحریم نہیں، بلکہ اس طرح پینا خلافِ اولیٰ ہے۔

۷۶۲:- عن أَبي سعيدٍ الخُدْريِّ رضی اللہ تعالی عنہ قَالَ: نَهَى رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن

اخْتِنَاثِ الأَسْقِيَةِ. يعني: أن تُكْسَرَ أفواهُها، وَيُشْرَبَ مِنْهَا. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ مشکیزہ کا منہ توڑ کر اس سے پیا جائے، یا اس کو موڑ کر پیا جائے۔

۷۶۳:- وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ **قَالَ: نَهَى رسول الله** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **أن يُشْرَبَ مِنْ فِيِّ السِّقَاءِ أَوِ القِرْبَةِ.** (متفق عَلَيْه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑے برتن یا مشکیزہ سے منہ لگا کر پینے سے منع فرمایا۔

افادات:- دو شکلیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ چمڑے کا بڑا مشکیزہ ہوتا ہے اس میں پانی زیادہ ہوتا ہے، تو اس سے براہِ راست پینے میں آگے کا جو منہ ہوتا ہے، اس کو موڑ دیتے ہیں، اس لیے کہ اس کے منہ پر ہاتھ لگنے کی وجہ سے میل کچیل لگا ہوا ہوتا ہے، جب آدمی اسی سے منہ لگا کر پینا چاہتا ہے تو اس کی طبیعت چاہتی ہے کہ صاف جگہ سے پیوں، اس لیے بعض لوگ ایسا کرتے تھے کہ اس مشکیزہ کے سرے کو اس طرح موڑتے ہیں کہ اندر کا حصہ باہر آجاتا ہے، اور چوں کہ اندر کا حصہ بالکل صاف شفاف ہوتا ہے تو اس کو منہ لگا کر پیتے ہیں۔ اب اگر سب ہی اس طرح اس کا منہ موڑ کر پئیں گے تو چند مرتبہ کے بعد مشکیزہ کا منہ کٹ جائے گا اور پھر وہ مشکیزہ استعمال کے قابل نہیں رہے گا، اس لیے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشکیزہ کے منہ کو اس طرح موڑ کر پینے سے منع فرمایا

اس سے ایک اصول معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کو استعمال کرنے کے لیے ایسا طریقہ اپنانا، جس کے نتیجہ میں آئندہ چل کر وہ چیز بے کار ہو جائے؛ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

اس میں دوسرا نقصان یہ بھی ہے کہ بڑا برتن ہونے کی وجہ سے اس میں پانی

زیادہ ہوتا ہے، تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پانی زیادہ مقدار میں حلق کے اندر چلا جاتا ہے، اور یہ چیز آدمی کے لیے مضر ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشکیزہ سے منھ لگا کر پیا

۷۶۴:- وعن أم ثابتٍ كَبْشَةَ بنتِ ثابتٍ أُختِ حَسّانَ بن ثابتٍ رضی اللہ عنہما قالت: دخل عَلَيَّ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَشَرِبَ مِنْ فِيِّ قِرْبَةٍ مُعَلَّقَةٍ قَائِماً، فَقُمْتُ إِلَى فِيهَا فَقَطَعْتُهُ. (رواه الترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

وإنّما قَطَعَتْهَا: لِتَحْفَظَ مَوْضِعَ فَمِ رسولِ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَتَتَبَرَّكَ بِهِ، وتَصُونَهُ عَنِ الابْتِذَال. وهذا الحديث محمولٌ عَلَى بيان الجواز، والحديثان السابقان لبيان الأفضل والأكمل. والله أعلم.

ترجمہ:- حضرت اُم ثابت کبشہ بنت ثابت رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے یہاں تشریف لائے، ایک مشکیزہ لٹکا ہوا تھا اس کو منھ لگا کر کھڑے کھڑے پانی پیا (وہ فرماتی ہیں کہ جس جگہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منھ لگا کر پانی پیا تھا) اس جگہ کو میں نے کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا۔

افادات:- اس حصہ کو برکت کے واسطے کاٹ ڈالا کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منھ جہاں لگا ہے وہ چیز اپنے پاس برکت کے لیے رہے گی۔ **اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نیک بندوں کی استعمال کی ہوئی چیز کو آدمی برکت کے واسطے اپنے پاس رکھنا چاہے؛ تو اس کی اجازت ہے۔**

برکت کے معاملہ میں بھی لوگوں میں افراط وتفریط ہے، بعض لوگ برکت کے معاملہ میں اتنے آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ اسی کو کافی سمجھتے ہیں، دوسرے کسی عمل کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے؛ یہ صحیح نہیں ہے۔ اور بعض لوگ اس کو بالکل بدعت سمجھتے

ہیں؛ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

روایتوں میں تطبیق

اب دیکھئے! اوپر تو ممانعت آئی تھی اور یہاں آپ ﷺ نے خود اس طرح پیا؟ تو پہلے بتلا چکا ہوں کہ وہ ممانعت حرمت کے لیے نہیں ہے کہ اس طرح پینا حرام ہے، بلکہ اس طرح پینے کے مقابلہ میں کسی برتن میں نکال کر پینے میں فائدہ زیادہ ہے۔ اسی لیے ایک موقع پر خود نبیٔ کریم ﷺ نے منھ لگا کر پی کر بتادیا کہ اگرچہ اچھا نہیں ہے، لیکن جائز ہے۔

باب کراهة النفخ فی الشرب

پینے کی چیز میں پھونک نہ مارے

پینے کے آداب میں ایک ادب یہ بھی ہے کہ جو چیز پی جارہی ہے تو پینے کے دوران اس میں پھونک نہ مارے۔ ایک تو ہے اندر سانس لینا اور ایک ہے پھونک مارنا، تو پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے۔

۷۶۵:- عن أَبي سعيد الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نَهَى عَنِ النَّفْخ فی الشَّرَاب، فَقَالَ رَجُلٌ: القَذَاةُ أَراها فی الإِناءِ؟ فَقَالَ: أهرقها. قَالَ: إِنِّي لا أَرْوَى مِنْ نَفَسٍ وَاحِدٍ؟ قَالَ: فَأَبِنِ القَدَحَ إِذاً عَنْ فِيكَ.

(رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا۔ اس پر ایک آدمی نے سوال کیا: اگر اس میں کوئی تنکا نظر آجائے؛ تو کیا کیا جائے؟ اس کو کیسے نکالے؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اتنا پانی بہادو (کہ اس کے ساتھ وہ چیز گر جائے، پھونک مارے بغیر بھی یہ مقصد حاصل ہو جائے گا) پھر اس آدمی نے کہا: مَیں ایک سانس میں شکم سیر ہوکر پانی نہیں پی سکتا؟ (یعنی تھوڑا سا پانی میرے لیے کافی نہیں ہوتا، مجھے زیادہ پانی پینا پڑتا ہے اور جب زیادہ پانی پیوں گا تو پینے میں دیر لگے گی اور اس دوران سانس لینے کی ضرورت پیش آئے گی، اور برتن میں پھونک مارنے سے اور ہوا چھوڑنے سے منع کیا گیا ہے؛ تو اب کیا کروں؟) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس برتن میں پی رہے ہو (گلاس، برتن یا پیالی وغیرہ) اس کو منہ سے الگ کر دو (پھر سانس لے لو، گویا

اس گلاس یا پیالہ کو منہ سے لگا ہوا رکھنے کی حالت میں سانس نہ لو، تاکہ سانس کا اثر اندر جانے نہ پائے)۔

افادات:- کبھی تو وہ چیز گرم ہوتی ہے اس کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بعض لوگ اس میں پھونک مارتے ہیں۔اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تنکا وغیرہ کوئی چیز اس میں گری ہوئی ہوتی ہے، اس کو دور کرنے کے لیے پھونک ماری جاتی ہے؛ تو چاہے پینے کی چیز پانی ہو، چائے ہو، یا اور کوئی چیز ہو؛ اس میں پھونک مارنے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ پہلے بھی بتایا گیا تھا کہ یہ کراہت تنزیہی ہے، یعنی ادب کے خلاف ہے۔ ایسا نہیں کہ کوئی ایسا کام کرے گا تو اس نے حرام کام کرلیا اور گناہ کا ارتکاب ہو گیا۔ بلکہ کسی چیز کو پینے کا جو پسندیدہ انداز ہے اور ہمیں پینے کی جو تہذیب بتائی گئی ہے اس کے خلاف سمجھا جائے گا۔

۷۶۶:- وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما **أَنَّ النبیَّ** ﷺ **نهى أن يُتَنَفَّسَ فى الإناءِ أَوْ يُنْفَخَ فِيهِ.** (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس برتن میں پانی یا کوئی اور چیز پی جارہی ہے اس میں سانس لینے اور پھونک مارنے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔

افادات:- ویسے بھی پانی بڑی نازک چیز ہے، آدمی کے سانس لینے اور پھونک مارنے کی وجہ سے آدمی کے منھ کا اثر پانی میں آجاتا ہے۔ اگر بدبو ہے تو بدبو کا اثر آجاتا ہے، خاص کر کے اگر آدمی بیڑی سگریٹ پینے والا ہو تو اس کے اثرات پانی میں آجائیں گے، اور اگر پانی بچ گیا تو دوسروں کے پینے کے قابل نہیں رہے گا، آدمی کی طبیعت اس سے کراہت اور گھن کرے گی۔

باب بیان جواز الشرب قائماً وبیان أنَّ الأکمل والأفضل الشرب قاعداً

کھڑے ہوکر پینے کی تفصیل

ایک اور ادب بتلا رہے ہیں کہ پانی یا جو بھی پینے کی چیز ہو وہ اگرچہ کھڑے ہوکر پینا جائز تو ہے، لیکن اچھا اور بہتر یہ ہے کہ بیٹھ کر پیئے، اس سلسلہ میں ایک روایت حضرت کبشہ بنت ثابت رضی اللہ عنہا کی پچھلے باب میں گزر چکی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے مکان پر تشریف لے گئے اور جو مشکیزہ لٹک رہا تھا اس کا منہ کھول کر آپ نے کھڑے کھڑے اس مشکیزہ سے منہ لگا کر پانی نوش فرمایا، اس سے کھڑے کھڑے پانی پینے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ایک اور روایت لا رہے ہیں۔

۷۶۷:- وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ: سَقَیْتُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مِنْ زَمْزَمَ، فَشَرِبَ وَھُوَ قَائِمٌ. (متفق عَلَیْہِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زمزم پلایا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہوکر نوش فرمایا۔

۷۶۸:- وعن النَّزَّالِ بن سَبْرَةَ رضی اللہ تعالی عنہ قَالَ: أَتَی عَلِیٌّ بَابَ الرَّحْبَةِ، فَشَرِبَ قائماً، وقال: إِنِّی رَأَیْتُ رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فَعَلَ کما رَأَیْتُمُونی فَعَلْتُ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت نزّال بن سبرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوفہ کے چوک کے پاس تشریف لائے اور وہاں کھڑے ہوکر پانی پیا۔ اور فرمایا: میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا جیسا کہ تم لوگوں نے مجھے کرتے ہوئے دیکھا۔

افادات:- اس باب میں کھڑے ہوکر پینے کے سلسلہ میں دونوں قسم کی روایتیں لا رہے ہیں۔ بعض روایتیں وہ ہیں جن میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہوکر پینے سے منع فرمایا، جیسے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت پیش کریں گے: "أَنَّهُ نَهٰى أَنْ يَّشْرَبَ الرَّجُلُ قَائِمًا" آدمی کھڑے ہوکر پیے اس سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا۔ بلکہ مسلم کی ایک روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے پیش کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لَا يَشْرَبَنَّ أَحَدٌ مِنْكُمْ قَائِمًا، فَمَنْ نَسِيَ فَلْيَسْتَقِيْء" کوئی آدمی کھڑے ہوکر ہرگز نہ پیے، اگر بھول سے کھڑے ہوکر پی لیا ہو تو قے کردے۔ بہر حال! ان روایتوں سے کھڑے ہوکر پانی پینے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے۔

اور کچھ روایتیں وہ پیش کریں گے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی کھڑے ہوکر نوش فرمایا، جس سے کھڑے ہوکر پینے کی اجازت معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہی روایت اور حضرت علی والی روایت پیش کی ہے۔ تو اب دونوں طرح کی روایتوں کے پیشِ نظر اہلِ علم نے ان میں جوڑ پیدا کرنے کے لیے مختلف باتیں کہی ہیں۔

بعض حضرات کھڑے ہوکر پینے والی روایت -جس سے اجازت معلوم ہوتی ہے- اسی کو ترجیح دیتے ہیں کہ وہ زیادہ قوی ہیں اور عمل اسی پر ہے۔ اور ممانعت والی روایتوں کو اس درجہ کی قوی نہیں مانتے۔

بعضوں نے یہ کہا: پہلے کھڑے ہوکر پینے کی اجازت تھی، پھر ممانعت ہوگئی،

یعنی وہ حضرات ممانعت والی روایتوں کو ناسخ مانتے ہیں۔

بعضوں نے کہا: پہلے ممانعت تھی، پھر اجازت والا حکم آ گیا۔

چکی کا پاٹ

لیکن محققین اس طرف گئے ہیں کہ کھڑے ہو کر پینے کی جو روایتیں ہیں وہ بیانِ جواز کے لیے ہیں کہ آپ ﷺ اس کا جائز ہونا بتا رہے ہیں۔ اور ممانعت والی روایت سے اس کا ناپسندیدہ ہونا معلوم ہوتا ہے، یعنی ادب کے خلاف ہے کہ آدمی کھڑے ہو کر پیئے۔

دورِ حاضر کے ہمارے بعض اکابر فرماتے ہیں: اگر بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ موجود ہے تو پھر کھڑے ہو کر پینا مکروہ ہے۔ اور اگر بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ نہیں ہے، جیسے: اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ہیں، یا کوئی ایسی جگہ پر ہیں کہ بیٹھنا چاہیں تب بھی نہیں بیٹھ سکتے؛ تو پھر وہاں کھڑے ہو کر پانی پینے میں کوئی کراہت بھی نہیں، ایسی جگہوں پر کھڑے ہو کر پینا بلا کراہت درست ہے۔

اور بعضوں نے کہا ہے کہ کھڑے ہو کر پینا مضر ہے، اس وجہ سے شفقتاً منع فرمایا ہے، اس لیے کہ جب آدمی کھڑے ہو کر پیتا ہے تو سانس کی رگیں پوری طرح کھلی ہوئی ہوتی ہیں، اور پانی سیدھا معدہ میں پہنچتا ہے جس کی وجہ نقصان ہوسکتا ہے، بیٹھ کر پینے میں اس نقصان سے حفاظت ہو جاتی ہے۔

البتہ دو پانی ایسے ہیں جن کو کھڑے ہو کر پینے کی اجازت ہے۔ ایک تو زمزم، اور دوسرا وضو کا بچا ہوا پانی۔ نبیٔ کریم ﷺ نے زمزم کھڑے ہو کر پیا، جیسا کہ ابن عباسؓ کی روایت پیش فرمائی کہ میں نے آپ ﷺ کو زمزم پلایا تو آپ نے کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔

زمزم کو کھڑے ہو کر پینے کی تفصیل

اب زمزم جو کھڑے ہو کر پیا جاتا ہے؛ تو واقعۃً زمزم کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے؟ اس کے آداب میں سے ہے؟ یا صرف جائز ہے؟ تو بعض حضرات علماء اس طرف گئے ہیں کہ زمزم کو کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے، چناں چہ احناف میں سے صاحبِ دُرِّ مختار علامہ علاء الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ مستحب ہے۔ لیکن اس کی شرح جو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے، انہوں نے اسی موقع پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا صرف جائز ہے، مستحب نہیں۔ اور لکھا ہے کہ کم سے کم کراہت ہی ختم ہو جائے، وہی بڑی بات ہے، چہ جائیکہ علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ استحباب کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمزم جو کھڑے ہو کر نوش فرمایا اس کی وجہ بتلائی ہے کہ حج کے موقع پر جب آپ طواف سے فارغ ہوئے اور زمزم پینے کے لیے تشریف لے گئے تو چوں کہ پانی پلانے کی ذمہ داری حضرت عباس رضی اللہ عنہما — جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا تھے، ان — کی اور ان کے خاندان کی تھی، وہی یہ خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس موقع پر جب میں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زمزم پلایا، تو آپ نے کھڑے ہو کر پیا۔ اس کی وجہ بھی لکھی جاتی ہے کہ وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں تھی، کنویں سے پانی نکالا جاتا تھا اور پوری جگہ پانی سے تر رہتی تھی، لوگوں کا مجمع بھی زیادہ تھا، اس وجہ سے بیٹھنے کا موقع نہیں تھا، تو نبئ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہو کر زمزم نوش فرمایا۔

بہرحال! علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ جن کی اسی کتاب سے عام طور پر ہمارے مفتیانِ کرام فتویٰ دیا کرتے ہیں، اور ہم بھی اسی کتاب کا حوالہ بار بار دیتے ہیں، انہوں نے تو

یہی لکھا ہے کہ زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا صرف جائز ہے، وہ مستحب کے قائل نہیں۔
اور مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے اکابر میں ہیں، دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی بھی رہے ہیں، بعد میں پاکستان میں بھی مفتیٔ اعظم رہے، ان کا بھی رجحان یہی تھا کہ زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا صرف جائز ہے، مستحب نہیں۔ اس لیے جو لوگ زمزم کو کھڑے ہو کر پینے کا اہتمام کرتے ہیں کہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور جب زمزم آتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کھڑے ہیں اور مل گیا تو کھڑے کھڑے پی لیجئے، لیکن بیٹھے ہیں تو خاص کھڑے ہونے کا اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہاں! جو لوگ اس کو مستحب کہتے ہیں ان کے اعتبار سے کوئی آدمی کھڑے ہو کر پیئے؛ تو گنجائش ہے۔ لیکن اگر کوئی آدمی کھڑے ہو کر نہیں پیتا، تو ہمارے یہاں اس کا اتنا زیادہ رواج ہو گیا ہے کہ سارے لوگ اُسے گھورتے ہیں، جیسے اس نے کوئی بڑا جرم کر دیا ہو؛ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ مَیں نے یہ پوری وضاحت اس لیے کر دی تاکہ مسئلہ کی نوعیت معلوم ہو جائے، اور مسئلہ صاف ہو کر سامنے آجائے۔

اور زمزم کو کھڑے ہو کر پینے کی دوسری وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ زمزم جتنا زیادہ پیا جائے گا؛ اتنا ہی پسندیدہ ہے، اور اس کی ترغیب بھی دی گئی ہے، اور کم پینا منافق کی علامت بتلایا گیا ہے، اس لیے کھڑے ہو کر پئیں گے تو زیادہ پیا جائے گا۔ بہر حال! زمزم کو کھڑے ہو کر پینے کی اجازت کے اندر کوئی کلام نہیں۔

وضو کا بقیہ بھی کھڑے ہو کر پی سکتے ہیں

اور دوسرا وضو کا بچا ہوا پانی ہے۔ جیسا کہ روایت پیش کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ کوفہ کے چوک میں وضو کیا۔ پھر فرمایا: مَیں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی طرح

کرتے ہوئے دیکھا جیسا کہ تم نے مجھے کرتے ہوئے دیکھا۔

تو علماء لکھتے ہیں کہ وضو کے بچے ہوئے پانی میں اللہ تعالیٰ نے شفاء رکھی ہے۔ شیخ عبدالغنی نابلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَیں جب کبھی بیمار ہوا اور مَیں نے اس کا اہتمام کیا کہ وضو کے بچے ہوئے پانی کو کھڑے ہو کر اس نیت سے پیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے شفاء دے؛ تو مجھے شفاء ہوگئی۔

تو یہ دو پانی ہیں: زمزم اور وضو کا بچا ہوا؛ جن کو کھڑے ہو کر پی سکتے ہیں۔

کھڑے ہو کر کھانا پینا؟

۷۶۹:-وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما **قَالَ: كُنَّا عَلَى عهدِ رسولِ الله** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **نَأْكُلُ وَنَحْنُ نَمْشِي، وَنَشْرَبُ ونَحْنُ قِيَامٌ.** (رواه الترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ہم چلتے ہوئے کھالیا کرتے تھے، اور کھڑے ہوئے پی لیا کرتے تھے۔

افادات:- کھڑے ہو کر پینے کے سلسلہ میں تو پوری وضاحت کے ساتھ بتلادیا کہ یہ جائز ہے، لیکن خلافِ اولیٰ ہے۔ اور اگر بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہیں ہے تو اس صورت میں اس کو خلافِ اولیٰ بھی نہیں کہیں گے۔

اور دوسری بات اس روایت میں بتلائی کہ چلتے ہوئے کھالیا کرتے تھے تو حضرت اَنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت آگے آنے والی ہے کہ ان سے کھڑے ہو کر کھانے کے متعلق پوچھا گیا تھا تو انہوں نے اس کو بُرا عمل بتلایا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ عام طور پر جو کھانا اہتمام کے ساتھ کھایا جاتا ہے کہ اس کے لیے دسترخوان وغیرہ بچھاتے ہیں اور مقررہ اوقات کے کھانے ہوتے ہیں؛ تو وہ تو

کھڑے ہوکر کھانے کی اجازت نہیں ہے۔لیکن کوئی ایسی چیز جس کو کھڑے ہوکر کھانا عیب نہیں سمجھا جاتا، جیسے چاکلیٹ، دانے چنے، پان وغیرہ؛ کہ آدمی چلتے چلتے کھالیا کرتا ہے؛ تو اس کی اجازت ہے۔باقی اپنے مقررہ اوقات کا کھانا، جس کو ہم لنچ اور ڈنر، ''غَدَآء''اور''عَشَآء'' کہتے ہیں تو وہ چلتے چلتے کھانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔

آج کل ایک نیا سسٹم اور طریقہ بوفے والا چلا ہے، شادیوں کے موقع پر ٹیبلوں کے اوپر سب کھانے رکھ دیئے جاتے ہیں، اور لوگ اپنی پلیٹ میں لے کر کھڑے کھڑے اور چلتے پھرتے کھالیتے ہیں؛ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔

۷۷۰:-وعن عمرو بن شعیب، عن أبیه، عن جدّه رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال : رأیتُ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یَشْرَبُ قَائِماً وقَاعِداً. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:-حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا یعنی حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھڑے کھڑے بھی اور بیٹھ کر بھی پیتے ہوئے دیکھا۔

۷۷۱:-وعن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبیّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: أنه نَهى أن یَشْرَبَ الرَّجُلُ قَائِماً قَالَ قتادة: فَقُلْنَا لأَنَسٍ: فالأَكْلُ؟ قَالَ: ذٰلِكَ أَشَرُّ - أَوْ أَخْبَثُ - (رواہ مسلم)

وفی روایة لَهُ:- أَنَّ النبیَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زَجَرَ عَنِ الشُّرْبِ قائِماً.

ترجمہ:-حضرت اُنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے کھڑے پانی پینے سے منع فرمایا۔اس روایت کو حضرت اُنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرنے والے حضرت قتادہؒ جو تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت اُنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ کھڑے کھڑے کھانے کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ تو اور زیادہ برا ہے (یعنی کھڑے ہوکر تو بالکل کھانا نہیں ہونا چاہیے)۔

اور دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہوکر پانی پینے پر تنبیہ فرمائی، اور اس سے منع فرمایا۔

۲۷۷:-وعن أبي هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ **قَالَ قَالَ رسول الله** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **: لَا يَشْرَبَنَّ أَحَدٌ مِنْكُمْ قَائِماً، فَمَنْ نَسِيَ فَلْيَسْتَقِيءْ.** (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی آدمی کھڑے کھڑے پانی نہ پیئے، اور اگر کسی نے بھول سے کھڑے ہوکر پی لیا تو اس کو قے کردے۔

افادات:- مسئلہ کی تفصیلی وضاحت کر چکا ہوں کہ کھڑے کھڑے پینا خلافِ اولیٰ ہے، جس کو مکروہِ تنزیہی کہتے ہیں یعنی ادب کے خلاف ہے۔

استحباب کون ساقی القوم آخرھم شرباً

پلانے والا خود اخیر میں پیئے

ایک اور ادب بتلا رہے ہیں کہ اگر کوئی آدمی پانی یا اور کوئی مشروب دوسروں کو پلا رہا ہو، تو ادب یہ ہے کہ خود اخیر میں پیئے۔ آج کل تو لوگ اپنا پہلے ہی نکال لیتے ہیں حالاں کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے، ادب یہ ہے کہ پہلے سب کو پلا دو، اخیر میں خود پیو۔

۷۷۳:-عن أبي قتادة رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال: ساقي القوم آخِرُهُمْ شُرْباً. (رواه الترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ لوگوں کو پلانے والا اخیر میں ہوتا ہے (یعنی اخیر میں پیا کرتا ہے۔)

ایک واقعہ

افادات:- پہلے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت گزر چکی ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو راستہ میں پڑا ہوا دیکھا، انہوں نے کئی وقت سے کھانا نہیں کھایا تھا جس کی وجہ سے ایک دم نڈھال تھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں سے گزرے تو انہوں نے ان سے کوئی آیت پوچھی۔ مقصد یہ تھا کہ سوال کے نتیجہ میں میرے حال کا ان کو کچھ پتہ چل جائے گا اور جواب دیتے ہوئے اپنے ساتھ لے جائیں گے اور کچھ کھلا بھی دیں گے، لیکن وہ تو جواب دے کر آگے بڑھ گئے۔ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گزرے تو ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ حضرت

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: مجھے دیکھ کر سمجھ گئے اور مسکراتے ہوئے فرمایا: ابوہریرہ! مَیں نے کہا: جی ہاں۔ فرمایا: چلو۔ اپنے ساتھ لے چلے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر کے اندر تشریف لے گئے تو یہ بھی اجازت لے کر داخل ہوئے۔ گھر والوں سے پوچھا: کچھ ہے؟ بتلایا گیا کہ فلاں جگہ سے ہدیہ میں دودھ آیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ کوئی چیز اگر صدقہ کے طور پر آتی تو اس کو اصحابِ صفہ کے پاس بھیج دیا کرتے، اور اگر ہدیہ کے طور پر کچھ آتا تو ان کو بلا لیا کرتے اور خود بھی شریک ہو جاتے۔ جب گھر والوں نے دودھ کا پیالہ دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: اصحابِ صفہ کو بلا لاؤ۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ مَیں اپنے دل میں سوچنے لگا کہ پیالہ میں دودھ ہی کتنا ہے! یہ تو میرے لیے ہی کافی نہیں ہے، اور ان کو بلانے کے لیے بھیج رہے ہیں، پھر جب میں بلا کر لاؤں گا تو مجھے ہی کہیں گے کہ تقسیم کرو، پھر تو میرے حصے میں کیا بچے گا؟ لیکن جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد تھا تو اس پر عمل کیے بغیر چارۂ کار بھی نہیں تھا، اس لیے گئے اور بلا کر لائے۔ جب اصحابِ صفہ آ کر بیٹھے تو جیسا سوچا تھا اسی کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ابوہریرہ! سب کو پلاؤ۔ اب وہ باری باری سب کو دے رہے ہیں اور وہ پی کر واپس کر رہے ہیں۔ جب سب کو پلا چکے تو اخیر میں انہوں نے وہ پیالہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک میں دیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ پیالہ اپنے دستِ مبارک میں رکھ کر فرمایا: ابوہریرہ! اب تو میرے اور تمہارے علاوہ کوئی باقی نہیں رہ گیا؟ حضرت ابوہریرہ نے کہا: جی ہاں! اے اللہ کے رسول۔ تو پھر مجھ سے فرمایا: اچھا لو! اور اب تم پیو۔ مَیں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ پھر فرمایا: اور پیو۔ میں نے پیا۔ پھر فرمایا: اور پیو۔ میں اور پیا۔ فرمایا: اور پیو، یہاں تک کہ مَیں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اب تو اندر جانے کا راستہ نہیں، پھر اخیر میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوش فرمایا۔ تو یہ بھی آداب میں سے ہے۔

باب جواز الشرب من جميع الأوانى الطاهرة غير الذهب والفضة وجواز الكرع-وَهُوَ الشرب بالفم من النهر وغيره بغير إناء ولا يد- وتحريم استعمال إناء الذهب والفضة فى الشرب والأكل والطهارة وسائر وجوه الاستعمال

ترجمۃ الباب

ہر قسم کے پاک برتن میں پینے کا جائز ہونا سوائے سونے اور چاندی کے۔کوئی بھی برتن؛ چاہے لکڑی، مٹی، چینی، تانبے، پیتل یا لوہے کا بنا ہوا ہو؛ اس کا استعمال جائز ہے۔ہاں! سونے اور چاندی کے برتن میں کوئی چیز کھانے یا پینے کی اجازت نہیں ہے، اس کے علاوہ کوئی برتن اگر پاک ہے تو اس کے اندر کھانے اور پینے کی اجازت ہے۔

ایک بات تو یہ ہوئی۔

دوسری بات یہ بتلاتے ہیں کہ کوئی آدمی پانی میں منھ ڈال کر براہِ راست پیئے۔ ایک طریقہ تو ہے کہ پانی کسی برتن میں لے کر پینا۔ دوسرا طریقہ ہے کہ پانی ہاتھ اور چلّو میں لے کر پینا۔ اور تیسری شکل یہ ہے کہ پانی کسی نہر یا تالاب اور حوض میں ہے اور اس میں سیدھا منھ ڈال کر پینا، جیسے: جانور منھ ڈال دیتا ہے، جس کو عربی میں ''کَرْع'' کہتے ہیں؛ یہ بھی جائز ہے، اس طرح بھی پی سکتے ہیں، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح پینا ثابت ہے۔

اور تیسری بات یہ بتلاتے ہیں کہ کھانے پینے اور طہارت حاصل کرنے اور دوسرے تمام استعمالات میں سونے چاندی کے برتنوں کا حرام ہونا۔ یعنی سونے چاندی کے برتن نہ تو کھانے پینے کے لیے، اور نہ کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں، جیسے: استنجاء کا لوٹا بنا کر اس میں پانی بھر کر استعمال کرنا، یا کسی اور کام میں استعمال کرنا، جیسے: سونا چاندی کی سرمہ دانی، قلم وغیرہ؛ تو یہ سب بھی جائز نہیں۔

یہ غلط فہمی نہ رہے

سونے اور چاندی کے زیور کا استعمال عورت کے لیے جائز ہے، مرد کے لیے نہیں۔ چاندی کی انگوٹھی اگر ساڑھے تین ماشہ سے کم کی ہے؛ تو مرد کے لیے اس کے پہننے کی اجازت ہے، لیکن سونے کی بالکل جائز نہیں۔ سونے چاندی کے زیورات کے علاوہ اور کوئی بھی چیز جیسے برتن وغیرہ ہو؛ تو اس کی نہ تو مردوں کے لیے استعمال کی اجازت ہے، نہ عورتوں کے لیے۔ عورتوں کو بھی جو اجازت ملی ہے وہ فقط زیورات کی ملی ہے۔ اس لیے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ عورتوں کو سونے چاندی کے زیورات کی اجازت ہے تو ان کے لیے دوسری چیزیں برتن وغیرہ کی بھی اجازت ہوگی، عورتیں بھی زیورات

کے علاوہ کسی اور استعمال میں نہیں لاسکتیں۔

پتھر کے برتن کا استعمال

۷۷۴:- وعن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: حَضَرَتِ الصَّلاَةُ، فقامَ مَن كَانَ قَرِيبَ الدَّارِ إِلَى أَهْلِهِ، وبَقِيَ قَوْمٌ، فأُتِيَ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِمَخْضَبٍ مِنْ حِجَارَةٍ، فَصَغُرَ المخْضَبُ أَنْ يَبْسُطَ فِيهِ كَفَّهُ، فَتَوَضَّأَ القَوْمُ كُلُّهُمْ. قالوا: كَمْ كُنْتُمْ؟ قَالَ: ثَمَانِينَ وزيادة. متفق عَلَيْهِ، هذه رواية البخاري.

وفي رواية لَهُ ولمسلم:- أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دَعَا بِإِنَاءٍ مِنْ ماءٍ، فَأُتِيَ بِقَدَحٍ رَحْرَاحٍ فِيهِ شَيْءٌ مِنْ ماءٍ، فَوَضَعَ أصابعَهُ فِيهِ. قَالَ أنسٌ: فَجَعلتُ أَنْظُرُ إِلَى الماءِ يَنْبُعُ مِنْ بَيْنِ أَصَابِعِهِ، فَحَزَرْتُ مَنْ توضَّأ مَا بَيْنَ السَّبْعِينَ إِلَى الثَّمَانِينَ.

ترجمہ:- حضرت اَنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نماز کا وقت آیا، جن کے مکانات قریب تھے وہ تو اپنے گھروں پر وضو وغیرہ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے پہنچ گئے، کچھ لوگ رہ گئے جن کے مکانات قریب نہیں تھے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پتھر کا ایک برتن لایا گیا جس میں بہت کم پانی تھا، اور وہ برتن اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ کوئی آدمی اس میں سے چلّو بھر سکے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس میں ہاتھ ڈال دیا اور سب لوگوں نے اس پانی سے وضو کیا۔ پوچھا: کتنے آدمی تھے؟ تو بتلایا: اسّی (۸۰) سے کچھ زیادہ آدمی تھے۔

دوسری روایت مسلم شریف میں ہے جس میں یہ ہے کہ: نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برتن میں پانی منگوایا، تو ایک پیالہ لایا گیا جو زیادہ گہرا نہ تھا (جو برتن گہرا نہ ہو اس کو ''رَحْرَاح'' کہتے ہیں) اس میں تھوڑا سا پانی تھا، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی انگلیاں مبارک اس میں رکھ دیں، تو انگلیوں کے اندر سے پانی پھوٹنے لگا، اور ستر (۷۰) سے اسّی (۸۰) کے درمیان لوگوں نے اس پانی سے وضو کیا۔

افادات:- گویا اس چھوٹے سے برتن میں جو پانی تھا نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ معجزہ ہوا کہ آپ کی برکت سے اس میں اتنی زیادتی ہوگئی کہ سب نے اس سے وضو کرلیا یہاں تو صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ: دیکھو! وہ برتن پتھر کا تھا۔ معلوم ہوا کہ پتھر کے بنے ہوئے برتن کو بھی استعمال کر سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ پاک ہو۔

پیتل کے برتن کا استعمال

۷۷۵:- وعن عبد اللہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: أَتَانَا النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَأَخْرَجْنَا لَهُ مَاءً فِی تَوْرٍ مِنْ صُفْرٍ فَتَوَضَّأَ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے یہاں تشریف لائے، ہم نے پیتل کے ایک پیالہ میں آپ کے لیے پانی نکالا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے وضو فرمایا۔

افادات:- معلوم ہوا کہ پیتل کا برتن بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ البتہ فقہاء فرماتے ہیں کہ پیتل یا تانبے کا برتن ہو، خاص کر تانبے کا ہو؛ تو اس کو قلعی کرالینا زیادہ مناسب ہے، تاکہ غیروں کی مشابہت لازم نہ آئے۔

نہر میں منھ ڈال کر پینا

۷۷۶:- وعن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دَخَلَ عَلَی رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ، وَمَعَهُ صَاحِبٌ لَهُ، فَقَالَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: إِنْ كَانَ عِنْدَكَ مَاءٌ بَاتَ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ فِی شَنَّةٍ وَإِلَّا كَرَعْنَا. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک انصاری صحابی کے یہاں تشریف لے گئے، آپ کے ساتھ آپ کے ایک صحابی بھی تھے۔ آپ نے ان سے پوچھا:

اگر تمہارے پاس رات بھر مشکیزہ میں رکھا ہوا پانی ہو تو لاؤ؛ ورنہ تو ہم تمہاری اس چھوٹی سی بہتی ہوئی نہر میں منھ ڈال کر پی لیتے ہیں۔

افادات:- یہ قصہ بخاری شریف اور شمائل میں کچھ تفصیل کے ساتھ موجود ہے، یہاں انہوں نے مختصر کر دیا ہے۔ ایک مرتبہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوپر بھوک کا تقاضہ تھا، کچھ وقت سے فاقہ تھا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی حال تھا، وہ باہر آئے تاکہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کر کے کچھ تسلی حاصل کریں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی باہر تشریف لائے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: چلو! فلاں صحابی کے پاس جائیں۔ ایک انصاری حضرت ابوالہیثم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کھجوروں کا باغ تھا، وہاں پہنچے، ان کی گھر والی سے پوچھا: وہ کہاں ہیں؟ اس نے بتایا: وہ تو پانی لینے کے لیے گئے ہیں، اتنے میں وہ بھی پہنچ گئے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تشریف لایا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بار بار عرض کرنے لگے: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ تشریف لے آئے۔ آپ کو بٹھایا اور جلدی سے بکری کا دودھ دوہا اور پیش کیا۔ کھانے کے لیے بکری ذبح کرنا چاہتے تھے تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو دودھ دیتی بکری ہو وہ مت کاٹنا۔ اس کے بعد انہوں نے کھجوریں لا کر رکھیں۔ اسی موقع کا یہ قصہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا: اگر تمہارے پاس رات بھر مشکیزہ میں رکھا ہوا پانی ہو تو لاؤ۔ اس لیے کہ رات بھر مشکیزہ میں رہا ہوا پانی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ورنہ تو ہم تمہاری اس چھوٹی سی بہتی ہوئی نہر میں منھ ڈال کر پی لیتے ہیں۔ حالاں کہ اس کی نوبت نہیں آئی، لیکن اس سے یہ معلوم ہوا کہ منھ ڈال کر پینا بھی جائز ہے۔ یہاں آپ نے یہ ''کَرَعْنَا'' جو فرمایا کہ ''منھ ڈال کر پی لیتے ہیں'' اسی مناسبت سے اس روایت کو اس باب میں پیش کیا ہے۔

یہ ان کے لیے دنیا میں؛ تمہارے لیے آخرت میں

۷۷۷:-وعن حذیفة رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: إنَّ النبیَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نَهَانَا عَنِ الحَرِيرِ وَالدِّيبَاجِ، والشُّربِ فی آنِيَةِ الذَّهَبِ والفِضَّةِ، وقال: هیَ لَهُمْ فی الدُّنيَا، وهِيَ لَكُمْ فی الآخِرَةِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ (ایک موقع پر انھوں نے پانی پینے کے لیے منگوایا، تو آپ کا جو خادم اور غلام مجوسی تھا، وہ چاندی کے برتن میں پانی لے کر آیا، تو حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لے کر اس کے اوپر مارا، لوگوں کو تعجب بھی ہوا، تو حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں پہلے بھی اس کو منع کر چکا ہوں اس کے باوجود اس میں لایا، اس لیے میں نے اس کو مارا، پھر فرمایا:) نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو ریشم اور دیباج کے پہننے سے منع فرمایا ہے (دیباج: موٹے قسم کا ریشم ہوتا ہے) اور سونے چاندی کے برتن میں پانی پینے سے بھی منع فرمایا۔ اور فرمایا: یہ ان کے لیے (یعنی غیر مسلموں اور کفار کے لیے) دنیا میں ہے (اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں دنیا میں ان کو دی ہیں، اس لیے وہ استعمال کر لیں) اور تمہارے لیے آخرت میں ہیں۔

جہنم کی آگ اُنڈیل رہا ہے

۷۷۸:-وعن أُمِّ سلمة رضی اللہ عنہا: أَنَّ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: الَّذِي يَشْرَبُ فی آنِيَةِ الفِضَّةِ، إِنَّمَا يُجَرْجِرُ فی بَطْنِهِ نَارَ جَهَنَّمَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وفی روایة لمسلم: إنَّ الَّذِي يَأْكُلُ أَوْ يَشْرَبُ فی آنِيَةِ الفِضَّةِ وَالذَّهَبِ.

وفی روایة لَهُ: مَنْ شَرِبَ فی إناءٍ مِنْ ذَهَبٍ أَوْ فِضَّةٍ، فَإِنَّمَا يُجَرْجِرُ فی بَطْنِهِ نَاراً مِنْ جَهَنَّمَ.

ترجمہ:- حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی چاندی کے برتن میں پانی پیے؛ گویا وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ اُنڈیل رہا ہے۔

دوسری روایت میں ہے: جو آدمی چاندی اور سونے کے برتن میں کھائے یا پیے۔

ایک اور روایت میں ہے: جو آدمی سونے اور چاندی کے برتن میں پیے، گویا وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ اُنڈیل رہا ہے۔

افادات:- نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتنی سخت وعید ارشاد فرمائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتن میں کھانا پینا جائز نہیں ہے، اس کے استعمال سے آدمی اپنے آپ کو بچائے۔